قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

نومبر 2019 قیمت 15₹

ماہنامہ
اُردو دُنیا
نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

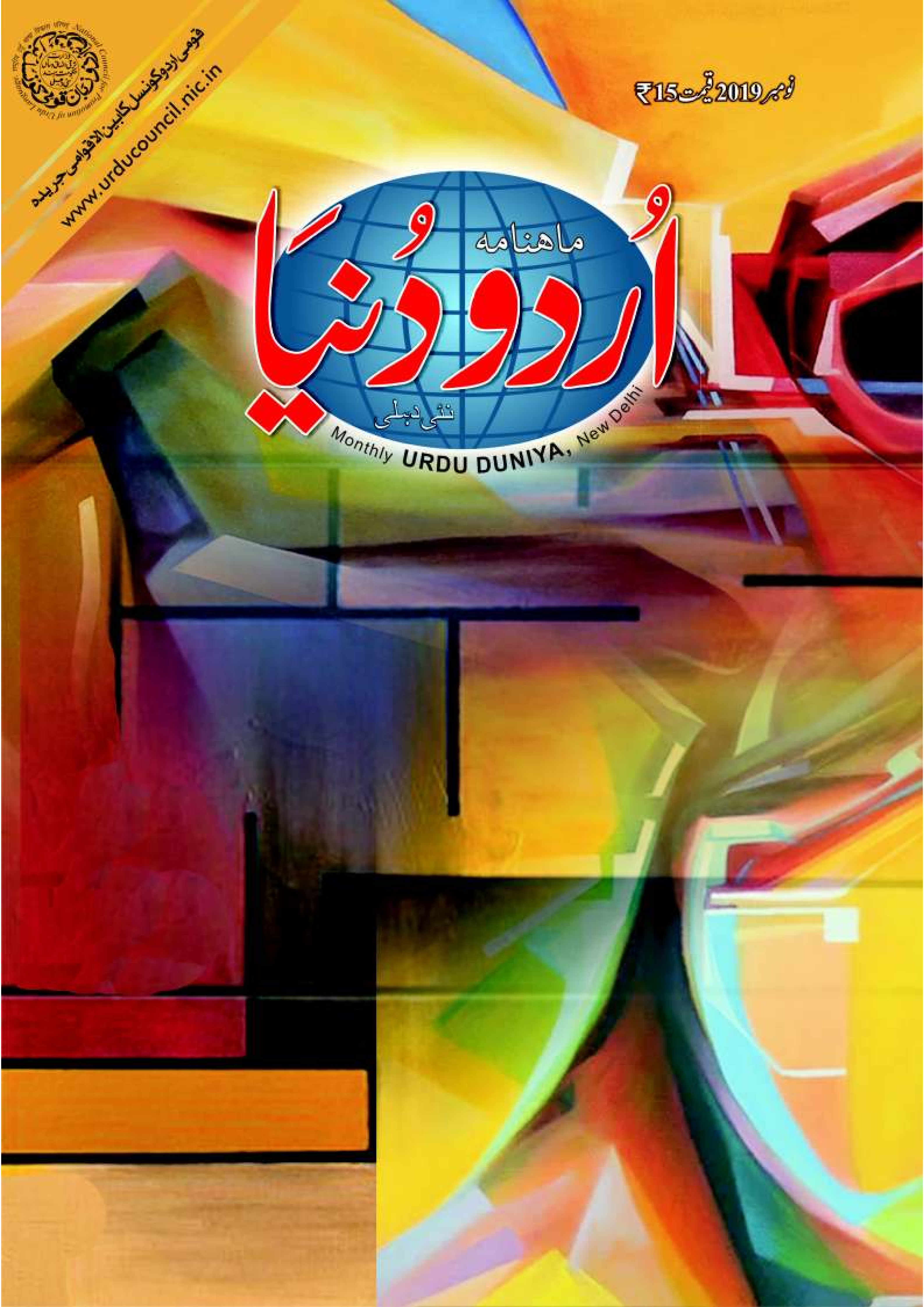

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

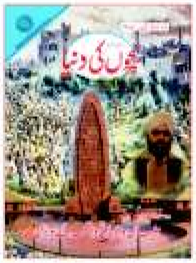

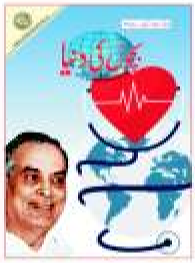

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

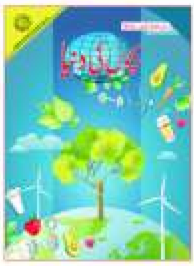

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:21، شمارہ:11، نومبر 2019

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ۔
نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

زبان اور زمینی صورت حال

زبان کو مٹا کر تہذیب کی سلامتی ممکن نہیں — شیخ صابرالدین نورالدین 7

نقد و نگاہ

مرزا مظہر جانِ جاناں — ابن کنول 10

انشائیے کی روایت — بلال احمد ڈار 13
بہار میں جدید اردو مرثیہ — محمد ارمان 17
موجودہ نسل اور اردو تحقیق و تنقید کا معیار — عاقل زیاد 19
مولانا الطاف حسین کی تحریروں میں تانیثیت — تسنیم بانو 21

یاد اسماعیل

مولانا اسماعیل میرٹھی اور بچوں کا نصاب — عبید اقبال عاصم 25

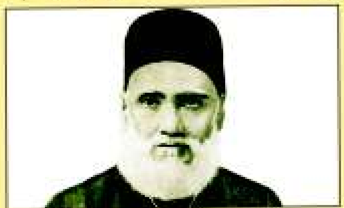

مولوی اسماعیل میرٹھی اور ماحولیاتی شعور — حقانی القاسمی 29

تہذیب و ثقافت

اجنتا کے غار — احمد اقبال 33

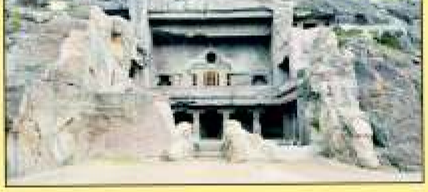

دبستان رام پور اور حیدر آباد — محمد الیاس 38

شخصیات

ڈاکٹر ہیرالال — کمار پانی پتی 41
حسرت جے پوری اور آبشار غزل — شاہد احمد 44
امیر تغزل قمر مراد آبادی — ندیم راعی مراد آبادی 46

اردو اور مدارس

اردو کی تعلیم میں مدارس کا کردار — محمد یٰسین قریشی 48
اردو زبان کے فروغ میں مدارس کی اہمیت — محمد صابر انصاری 50

نیا آسماں نئے ستارے

مالک رام کا اسلامی شعور — نذرانہ شفیع 52
خاکہ کا فن اور اردو خاکہ نگاری — گلشن آرا 56

سائنس

نظام شمسی: ایک اجمالی تعارف — سعد بن ضیا 58
فوارہ آبپاشی سے پانی کی بچت اور بہتر کاشتکاری — محمد اویس 60

کمپیوٹر

دستاویز کا ڈیزائن بنانا 62

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 68

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ 77

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 78

ہماری بات

تہذیبوں کے درمیان تصادم کی ایک وجہ جہاں تفوق اور بالادستی کا جذبہ ہوتا ہے وہیں ناواقفیت اور جہالت بھی تصادم کا ایک سبب ہے۔

زیادہ تر اقوام و ملل میں تصادم اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تہذیب، مذہب اور معاشرت سے ناواقف ہوتے ہیں۔

ہر قوم کا اپنا ثقافتی بیانیہ ہوتا ہے۔ جب ان بیانیوں سے ہمارا رشتہ براہِ راست قائم ہوتا ہے تو بہت سے شکوک و شبہات اور بدگمانیوں کے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے افکار و اقدار سے آگہی اس لیے بھی ضروری ہے کہ دنیا میں بہت سی قدریں مشترک ہیں، خاص طور پر انسانی جذبات اور احساسات میں بڑی یکسانیت ہوتی ہے۔ ساری دنیا کے دکھ درد ایک جیسے ہیں، مسائل بھی ایک جیسے ہیں، منزل بھی ایک ہی ہے بس راستے الگ الگ ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں ذہنی تعصبات کو ہٹا کر ہر قوم کی معاشرت اور تہذیب کو اس کے صحیح سیاق و سباق میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

جن ملکوں کے دانشوروں اور مفکروں نے دوسروں کے افکار و اقدار کو سمجھنے کی کوشش کی ان کے یہاں تعصب سے زیادہ تفہیم کا جذبہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے وسیع النظر اور روشن خیال افراد امتزاجیت کی بات کرتے ہیں اور وہ مختلف تہذیبوں کے درمیان تفاہم کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔

ہمارا ملک ہندوستان کثیر تہذیبی اور لسانی ملک ہے اور اس کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس کے تنوع میں وحدت ہے۔ یہاں گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن، یہاں مختلف طرح کے افکار و تصورات ہیں اور ان میں امتزاجات کی تلاش بھی ماضی میں ہوتی رہی ہے، ایسے دانشور اور صوفیاء کرام یہاں رہے ہیں جنھوں نے مشترکہ علمی اور روحانی وراثت کی جستجو کی اور معاشرے کو یہ بتایا کہ الگ الگ افکار و نظریات کے باوجود مختلف تہذیبوں اور مذاہب کے مابین ایک رشتۂ وحدت ہے۔ متناقض اور متضاد چیزوں میں بھی انھوں نے تطابق کی ایک صورت تلاش کی، خاص طور پر مذہبی بنیاد پر جو تفریق و تقسیم ہے اسے بھی ختم کرنے کی کوشش کی اور یہ واضح کیا کہ تمام ادیان کا احترام ضروری ہے، چونکہ مذاہب میں زیادہ تر وہ باتیں ہیں جو انسانوں کے درمیان اجنبیت اور غیریت نہیں بلکہ اتحاد اور رشتۂ محبت کو مضبوط کرنے والی ہوتی ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی کہا تھا کہ 'مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا' یہ حقیقت سب کو معلوم ہے کہ تمام مذاہب مثبت اور صالح قدروں کی تلقین کرتے ہیں اور کردار سازی ہی ان مذاہب کا منشور ہے۔ ہر مذہب میں ایک روشنی ہے جو انسانوں کی رہنمائی کرتی ہے، خاص طور پر صوفیاء کرام نے مشترکہ تصورات کے حوالے سے بہت مبسوط گفتگو کی ہے اور بین مذاہب مکالمے پر زور دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ مذاہب کے درمیان اصولی نہیں فروعی اختلافات ہیں اور ہم سب ایک مشترکہ روحانی وراثت کے امین ہیں۔ ان صوفیاء کرام کے یہاں انسانیت ہی سب سے بڑا مذہب تھا، جن کا خاص تصور یہ تھا کہ ایک ہی چراغ سے کعبہ و بت خانہ روشن ہیں، ان کے لیے ہر وہ فکر قابلِ قبول تھی جس میں انسانیت کی صلاح اور فلاح ہو اور اسی جذبے کی وجہ سے ان صوفیاء کرام نے اپنے دروازے تمام مذاہب اور طبقات کے لیے کھول رکھے تھے۔ ان صوفیاء کے پیغامات اور تعلیمات کا ہمارے معاشرے پر خاصا اثر ہوا کہ آج بھی ہندوستانی معاشرے میں سماجی ہم آہنگی، اتحاد پسندی اور مذہبی رواداری کا جذبہ موجود ہے، الگ الگ مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی ایک دوسرے کے افکار اور اقدار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان غلط فہمیوں کے ازالے کی بھی جو ناواقفیت اور جہالت کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہیں۔ صوفیاء کرام اور روشن خیال دانشوروں نے مذہبی بنیاد پر ہر تقسیم کو رد کیا اور مشترکہ بنیادوں کی جستجو کی اور یہ بھی بتایا کہ مذاہب کے درمیان صرف الفاظ کا فرق ہے، تمام مذاہب کی ماہیت اور روح ایک ہے۔ اس سلسلے میں داراشکوہ کا کارنامہ قابلِ ذکر ہے کہ انھوں نے 'مجمع البحرین' اور 'سرِ اکبر' کے ذریعے بین مذاہب مکالمے کی راہ ہموار کی اور مذہبی رواداری پر زور دیا۔ ہمیں آج کے عہد میں اسی طرح کے تصورات کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں اربابِ علم و دانش کو آگے آنا ہوگا اور انھیں پورے معاشرے کو یہ بتانا ہوگا کہ تمام افکار و اقدار کا احترام کیا جانا چاہیے، اسی سے انسانیت کا تحفظ ہوسکتا ہے۔ مذہبی شدت پسندی کا خاتمہ اس وقت بہت ضروری ہے کیونکہ یہی معاشرے کے ڈھانچے کو تباہ اور برباد کرتی ہے، ہمیں ایک صالح اور صحت مند مثالی معاشرے کے لیے ایک دوسرے کے خیالات، جذبات اور احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوگی۔ ماضی میں ہمارے بزرگوں نے اس طرح کی کوششیں کی ہیں، ہمیں ان کوششوں کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

آپ کی بات

ماہنامہ 'اردو دنیا' اگست کا شمارہ بہت پہلے مل گیا تھا، لیکن ناسازیِ صحت نے اس کی طرف فوراً مائل ہونے نہیں دیا۔ زیرِ نظر شمارے کے اداریے 'آپ کی بات' میں آپ نے 'یومِ آزادی' کی مبارکباد دیتے ہوئے تعمیر وطن اور جدوجہد آزادی میں اردو کا کردار کے تحت زبان اردو اور ادب کے تعلق سے بہت دلچسپ و مؤثر باتیں کہی ہیں، اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اردو ادب کا سرمایہ قومیت اور وطنیت کے تصور سے مالا مال ہے اور تقریباً ایک تہائی شعرا و ادبا کی دیش بھگتی اور سوراج سے وابستہ زبان ادب کو بڑی زریں نگارشات و تخلیقات سے نوازا ہے۔ آپ نے اس حوالے سے منیر شکوہ آبادی، فضل حق خیرآبادی، حسرت موہانی، ان تینوں کے نام و پیام پر اکتفا کیا ہے جب کہ ان کے علاوہ حب الوطنی کے جذبات سے معمور ایک طویل شعرا کی فہرست تاریخ اردو ادب میں موجود ہے جن میں قابلِ ذکر موہن لال رواں، برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، جوش ملسیانی، پریم دھون، گوپال داس نیرج، کوی پنڈت پردیپ، کرشن بہاری نور، رام پرشاد بسمل، کرشن کمار طور جیسے غیر مسلم شعراء کرام کے علاوہ مسلم شعرا میں نظیر اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، سکندر علی وجد، ساحر لدھیانوی، جان نثار اختر، جگر مرادآبادی، کیفی اعظمی، سردار جعفری جیسے مشہور زمانہ شعرا کرام کے نغمے اور نظمیں آج بھی زبان زد عام ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو ہر شاعر اور ادیب کی شعری اور نثری تخلیقات میں کسی نہ کسی پہلو سے اتحاد و یکجہتی کا پیام نمایاں طور پر ملتا ہے۔ خصوصاً جنگ آزادی میں بقول آپ کے اردو زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے سرفروش شعرا جیسے شہید بھگت سنگھ، محمد علی برادران، اشفاق، رام پرشاد بسمل، فضل حق خیرآبادی (جن کو کالے پانی کی سزا ہوئی)۔

القصہ تختۂ دار پر بھی ان سرفروش قلندروں نے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

جیسے حریتی نغمے گاتے ہوئے خوشی خوشی پھانسی کے پھندے پر جھول گئے۔ آج بھی سیاسی اور قومی جلسے جلوس میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ پھر ایک بار ہمیں اتحاد کے پرچم چلے جمع ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔

علیم صبا نویدی: رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی، تمل ناڈو

ستمبر ماہ کے شمارے میں 'آپ کی بات' کے تحت مدیر صاحب نے ادبِ اطفال کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے 'ادبِ اطفال اکادمی' موسوم ایک نئے ادارے کے قیام کی جو بہترین تجویز پیش کی ہے، وہ ادارہ فقط اردو ہی نہیں بلکہ پنجابی، ہندی وغیرہ ہر ایک زبان میں بھی قیام کا متقاضی ہے۔

درویش صفت سخنور جناب بیکل اتساہی کی تمام شاعری قومی یکجہتی کے جذبے سے لبریز رہی ہے۔ جس مشاعرے میں ان کے نظم سنانے کے فوراً بعد سامعین میں کسی ایک عام آدمی نے بلند آواز میں کہا تھا کہ " یہ تو بڑا اتساہی شاعر ہے۔" یہ سن کر اسٹیج پر براجمان پنڈت نہرو نے اس کی رائے کی تائید کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ " یہ تو واقعی اتساہی شاعر ہیں۔" بس، اس کے بعد بیکل صاحب نے اپنے نام کے ساتھ 'اتساہی' جوڑ لیا جو تاعمر ان کے نام کے ساتھ رہا۔ اس کا ثبوت ان پر شائع مضمون ہے۔ تابش مہدی نے فراق گورکھ پوری کا جو اقتباس دیا ہے، اس کے بموجب اس شاعر میں 'واقعی' علامات سے کہیں زیادہ خیالات کا بہاؤ ملتا ہے۔

محترمہ ملکہ نسیم نے مشہور و معروف شاعر انور جلال پوری کی شاعری کے ساتھ ان کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔

محترمہ شائستہ مہ جبین نے ایک کمیاب موضوع یعنی 'راجستھان میں سیرت نگاری' محنت سے تحریر کیا ہے۔ اردو زبان سے وابستہ سوالات اور ان کے جوابات پر مبنی مضمون میں اس علاقے میں ید طولیٰ رکھنے والے عالم و فاضل جناب رضاء الرحمٰن عاکف نے نہایت علمیت و سنجیدگی

سے جوابات پیش کیے ہیں، جن سے اردو زبان کے طلبہ و اساتذہ بہت استفادہ کر سکتے ہیں۔ اسی شمارے میں شائع اپنے خط میں اس خاکسار نے عربی زبان کے اسم مؤنث لفظ 'وجہ' کے جمع لفظ 'وجوہ' کی بجائے غلط لفظ 'وجوہات' درج کرنے پر انگلی اٹھائی ہے، پتا نہیں کیوں 39 اور 40 دونوں ہی صفحات پر 'وجوہات' اس غلط جمع لفظ کی اشاعت کا اعادہ کر دیا گیا ہے؟ برائے مہربانی اس غلطی کی تصحیح کر دی جائے۔

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک**: کوٹھی نمبر A-201، گورو نانک نگر، پٹیالہ

'اردو دنیا' اگست 2019 آزادی کی مبارکبادیوں کے ساتھ اُس کی رعنائیاں سمیٹے ہوئے نظر نواز ہوا کہ ہمارے ملک اور دنیا بھر میں جہاں جہاں ہندوستانی رہتے بستے ہیں، ایک جشن کا سماں ہے۔ اس شمارہ کے سرورق پر 23 ویں کل ہند اردو کتاب میلہ منعقدہ بمقام کشمیر یونیورسٹی سری نگر کا جاذب نظر افتتاحی منظر پیش ہے۔ اداریہ میں جدوجہد آزادی کے دوران اردو زبان کے ناقابل فراموش کردار اور وطن پرستی سے معمور اثاثہ یکجہتی، ہم آہنگی سے لبریز منظوم و منثور مواد کی کارکردگی اور اہمیت جتائی گئی ہے۔ ص 8 سے میلے کی کہانی شروع ہوتی ہے جس کے راوی ڈاکٹر عبدالحی ہیں۔ انھوں نے کشمیر کی قدیم تاریخ اور عصری ماحول کا ایسا دلفریب نقشہ کھینچا کہ قاری کتاب میلہ کی تفصیلات میں اجنبیت محسوس نہ کرے۔ پھر پہلے دن سے آخری دن یعنی نویں دن کی روداد دن بہ دن قلمبند کی گئی ہے۔ بہت خوب پیش کش ہے۔ ان صفحات کے حاشیہ میں اہم شخصیات کے تاثرات مندرج ہیں۔ پہلی اہم شخصیت کے سوائے تمام نے اپنے تاثرات کا اظہار راست اردو میلہ سے کیا ہے۔ ص 15 پر فروخت کا قومی ریکارڈ دیا گیا ہے جس میں سلسلہ نمبر 17 پر اورنگ آباد (مہاراشٹر) کی فروخت اب تک کے تمام 23 اردو کتاب میلوں میں سب سے زائد ہے۔

اردو تدریس کے تحت غیر ملکی جامعات میں تدریسی صورتحال انتہائی اہم مضمون ہے۔ اس میں دنیا بھر کے دس سے زائد ممالک میں اردو مراکز کے متعلق قابل قدر معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس تسلسل میں ص 28 پر مزید ایک اچھا عنوان رائٹ ٹو ایجوکیشن ہے۔ نقد و نگاہ کے تحت ص 30 پر ظفر عدیم کی منتخب منظومات و امتیازات پر تنقیدی بحث کی گئی ہے جس کے مطالعہ سے ہمیں محسوس ہوا کہ ان کا کلام نہایت ستھرا ہے۔ مقالہ کی ابتدا میں مختصراً حالات زندگی اور بعد میں ان کے کلام پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ فضا ابن فیضی بیسویں صدی کے معروف شاعر گزرے ہیں۔ مضمون میں لگتا ہے کہ نقادوں پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ خود فضا ابن فیضی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں (ص 34)

یہ میرے دور کے ناقد ہیں کیا خبر تھی مجھے
زمانہ ہاتھ میں اندھوں کے آئنہ دے گا

ان کے علاوہ باقی چار مقالہ جات بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ زبان اور زمینی صورتحال کے تحت (ص 49) کہا گیا ہے کہ مدارس سے اردو کا مستقبل روشن ہے۔ یہ دراصل سوالنامہ برائے انٹرویو کا جواب نامہ ہے۔ برہانپور میں اردو زبان کی ارتقائی منزلوں پر مگر مگر اردو میں بحث کی گئی ہے۔ خراج عقیدت کے ذیل میں شفاعت علی صدیقی اور اقبال مجید کو خراج عقیدت پیش کی گئی ہے۔ 'اردو دنیا' کے سابقہ شماروں میں غالباً دونوں ہی ہستیوں پر مضامین آچکے ہیں جن میں انھیں بھرپور عقیدت پیش کی گئی تھی۔ صحافت کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ اکیسویں صدی کی ابتدا تک (ص 59) اُڈیشہ کی قدیم راجدھانی کٹک کو اردو زبان و ادب میں ابتداء ہی سے مرکزیت حاصل رہی ہے۔ مخدوم محی الدین اپنی غزلوں اور نظموں کی بنا پر عالمگیر شہرت رکھتے ہیں۔ اس بیان کو نئے آسمان نئے ستارے کے ذیل میں پیش کیا گیا ہے، مگر یہ عنوان کچھ جچ نہیں رہا ہے کیونکہ اس بارے میں نہ آسمان نیا ہے اور نہ ستارے، مگر کیا غضب کی شاعری ہے۔ ہم نے جنھیں بھلا دیا کے تحت دبستان رام پور کے نرالے میاں شمس کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے تحت عصر حاضر میں انفارمیشن ٹکنالوجی کو اُردو کے باب میں صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

❖ **مصطفی ندیم خاں غوری**: روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' اگست کا شمارہ وقت پر دستیاب ہوا۔ اس کے صوری حسن اور معنوی جمال کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ شمارے کے مضامین بہت معیاری ہیں۔ خاص طور پر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین صاحب کا 'غیر ملکی جامعات میں اردو کی تدریس: صورت حال اور مستقبل کے امکانات' بے حد معیاری مضمون ہے۔ زیادہ تر کیرالہ والوں کو اچھی اردو نہیں آتی ہے۔ آج مدارس اسلامیہ اور این سی پی یو ایل کی کوشش سے یہ زبان تیزی سے پھیل رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کیرالہ کے قدیم علما اردو اور فارسی اچھی طرح جانتے تھے۔

❖ **راشد محمد**: مرکز گارڈن، کیرلہ

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحریریں شائع کی جاتی ہیں مگر ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جو سائنسی ، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں یا روزگار کے حصول میں معاون وسائل کی نشان دہی کرتے ہوں۔ یہ ہر طبقے کا رسالہ ہے اسی لیے اس میں تنوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی خوش بختی ہے کہ اسے ہندوستان بھر کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ ہر موضوع پر ہمیں مضامین ملتے رہتے ہیں۔ لیکن تمام مضامین کی فوری اشاعت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ چند سطروں میں مضمون کے اہم نکات کی نشان دہی فرمادیں تاکہ ترجیحی طور پر مضمون کو شامل اشاعت کیا جاسکے۔ برائے مہربانی اپنے مضامین، خبروں اور خط کے ساتھ **اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ مع پن کوڈ ضرور فراہم کریں۔** معاوضے کے لیے بھیجے گئے فارم میں اپنے قلمی اور بینک اکاؤنٹ میں درج نام کی الگ الگ نشان دہی کریں۔

زبان کو مٹا کر تہذیب کی سلامتی ممکن نہیں

شیخ صابر الدین نور الدین

اردو رسائل میں اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا. زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگھی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے. عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں. جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا.

سوال: زبانوں کی موت کی کیا وجوہات کیا ہیں؟

جواب: زبانوں کی موت کی کئی وجوہات ہیں۔ جیسے آج کل کسی بھی زبان اور خاص طور پر اردو زبان میں گفتگو کرتے ہوئے انگریزی الفاظ کا جملوں میں بڑے پیمانے پر استعمال، اس سے دھیرے دھیرے ہی صحیح ہم اردو زبان کو ختم کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی سماج کا ہر طبقہ اپنے بچوں کو مادری زبان کی بجائے دوسری زبانوں میں اور خصوصی طور پر انگریزی میں پرائمری تعلیم دینا پسند کر رہا ہے جو زبانوں کے خاتمے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی زبانیں معدومیت کے خطرے سے دوچار ہیں، اس لیے کہ ان کے پاس تحریری صورت میں کچھ نہیں ہے۔ بی بی سی کی رپورٹ کے مطابق 537 زبانیں ایسی بھی ہیں جن کے بولنے والے پچاس سے بھی کم رہ گئے ہیں، لیکن زیادہ افسوس ناک حالت ان 46 زبانوں کی ہے جو آئندہ چند برسوں میں ختم ہونے والی ہیں کیونکہ انھیں سمجھنے اور بولنے والا صرف ایک ایک انسان باقی ہے

سوال: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے؟

جواب: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ابتدائی اور ممکن ہو سکے تو ثانوی تعلیم مادری زبان میں دلوائیں تاکہ آنے والی نسلوں میں بھی زبانیں زندہ رہیں۔

اس کے علاوہ جو زبان جس رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اسی رسم الخط میں اسے لکھیں تاکہ وہ اپنی اصل حالت میں زندہ رہے۔ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اس زبان کے اخبار، رسائل اور ادب زیادہ سے زیادہ لکھا جائے۔

سوال: زبانوں کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

جواب: زبانیں ہی ثقافت کو پیش کرتی ہیں، زبانوں کے بولنے والے اپنی خوشی وغم کی کیفیات کا اظہار انھیں زبانوں کے ذریعے کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی خاص ثقافتی رنگ یا خیال کو کسی دوسری زبان میں اسی کیفیت کے ساتھ ترجمہ کرکے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ساتھ ہی زبان اور تہذیب کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ زبان کو مٹا کر تہذیب کی سلامتی ممکن نہیں۔

سوال: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

جواب: ہاں بیشک انسانی وراثت کا تحفظ زبانوں سے جڑا ہوا ہے۔ بہت سارے زبانی اور تہذیبی ماخذ اسی زبان میں موجود ہوتے ہیں اور اس سے منسلک انسان اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہے۔ مگر جب وہ زبان مٹ جاتی ہے تو پھر انسانی وراثت بھی دھیرے دھیرے ختم ہونے لگتی ہے۔

سوال: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: کوئی بھی زبان اس وقت خوب پھلتی پھولتی ہے جب اس زبان میں ہر طرح کا مواد موجود ہوتا ہے۔ اور اس زبان کے خواندہ بھی ہوں۔ تب ہر طرح کا مواد جیسے سائنسی، سماجی مواد اپنی زبان میں ہونے کے بعد کسی دوسری زبان میں اسے پڑھنے اور سمجھنے کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ پر اگر خواندگی کم ہو یا سائنسی اور سماجی مواد کم ہو تب خود بخود دوسری زبانیں ہم پر حاوی ہونے لگتی ہیں اور اس طرح زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔

سوال: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے

خطرات لاحق ہیں؟

جواب: گھر، دفاتر، اسکول، کالج، یونیورسٹیز، اسپتال، عدالتیں غرض ہر جگہ انگریزی نے ایسا سکہ جمایا ہے کہ مقامی زبانیں متروک ہوتی جارہی ہیں۔ خوشحال طبقے اپنے بچوں سے انگریزی میں بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ اور انھیں انگریزی تعلیم دلانا پسند کرتے ہیں۔

سوال: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

جواب: ہم دیکھ رہے ہیں اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے۔ زبان کا بگاڑ زور پکڑ رہا ہے، لوگ خدا جانے کہاں کہاں سے کیسی کیسی ترکیبیں اور محاورے اٹھا کر لا رہے ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے بس اپنی سڑک سے اتر گئی ہے مگر پھر بھی چل رہی ہے۔ زبان اپنے اصل ٹریک، اپنی اصل روش سے اتر کر کچی پکی زمینوں پر دوڑی چلی جارہی ہے۔ اس میں کچھ دخل اوروں کا اور کچھ ہمارا اپنا ہے۔ اخبار ختم ہونے کو ہیں، رسالے بند ہوئے جاتے ہیں، ریڈیو چپ سادھ رہا ہے، اب لے دے کر جو کچھ ہے وہ ٹیلی ویژن ہے۔ صبح بھی، بھری دوپہر میں رات جاری ہے۔

سوال: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: جب ہم زبانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو دراصل زبان کے قول میں کسی قوم، علاقے یا نسل کے عروج و زوال کی داستان پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اردو کو یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ اس زبان کو کسی ایک قوم، علاقے یا نسل نے جنم نہیں دیا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اردو نے مختلف قوموں کے رحم سے اپنی ایک قوم تخلیق کی ہے جو اس کی اداؤں کی گرویدہ اور اس کی نزاکتوں کی دلدادہ ہے۔ تاریخ کے ساتھ حال اس بات کا گواہ ہے کہ اس زبان کے لیے ہندو، مسلم اور عیسائی ہر کسی نے بلا امتیاز مذہب وملت کام کیا ہے۔ یہ ہر اس فرد کی زبان ہے جو اس کے قریب آنا چاہتا ہے۔ جس طرح اس زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت ہے، اسی طرح اس نے ہر محب اردو کو نہ صرف قبول کیا بلکہ عزت بھی بخشی اسی طرح ادبی رسائل کی صورت میں بھی وسیع ذریعہ ابلاغ ہمارے سامنے ہے، جو شاید ادبی تربیت گاہ کا کردار مشاعروں سے کہیں بہتر کرتا ہے۔ ایسے ادبی رسائل کی اشاعت وترویج اور مالی مسائل کے حل کے سلسلے میں ہمیں نہایت سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ ان مسائل کو اپنے مسائل سمجھ کر ہمیں ان کے لیے مددگار ثابت ہونا ہوگا، اردو صحافت کا بھی حال اور مستقبل درخشاں بنانے کے لیے ادبی رسائل کے ساتھ ساتھ اردو اخبارات کو خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالنی ہوگی اور یہ فعل ان رسائل اور اخبارات کی بہتری اور ترقی میں مثبت کردار ادا کریں گے۔ اردو نے اپنے ماضی کے سرمائے کے ساتھ اپنا ادبی سفر شان سے جاری رکھا ہوا ہے، یہ زبان ادبی لحاظ سے دنیا کی کسی بھی دوسری زبان سے کسی صورت پیچھے نہیں۔ ہمیں کسی پر الزام تراشی کے بغیر سنجیدگی کے ساتھ اردو کے مسائل اور مستقبل کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ آج اردو والوں نے جو چھوٹی چھوٹی ادبی گروہ بندی کی ہوئی ہے اس کو مسمار کرنا ہوگا اور دنیا بھر میں اردو کے جو ادارے قائم ہیں ان کے درمیان رابطہ استوار کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔

سوال: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں۔

جواب: زبان میں بگاڑ کو روکنے کے لیے ہمیں چاہیے کہ سب سے پہلے اردو میں گفتگو کے درمیان جو انگریزی کے الفاظ ہم صرف اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ ہماری گفتگو اثردار ہو اور سامنے والے کو ہمارا معیار بلند دکھائی دے ان الفاظ کا استعمال بند کرنا ہوگا۔ دراصل ایسا کر کے ہم زبان میں بگاڑ پیدا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ زبان کے بگاڑ کو روکنے کے لیے ہمیں چاہیے کہ بات نپی تلی اور مناسب الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کریں۔ اس کے لیے زبان پر عبور پیدا کرنا ہوگا۔

سوال: کیا اردو ادارے، تنظیمیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہی ہیں، اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

جواب: نہیں ایسا نہیں ہے۔ میرے حساب سے اردو ادارے، تنظیمیں زبان و ادب دونوں پر برابر کام کر رہی ہیں۔ ایک طرف جہاں زبان کے فروغ کے لیے اردو مدارس میں طلبا کے داخلے، اور آپسی گفتگو میں اردو زبان کو اہمیت برتی جارہی ہے اسی طرح دوسری جانب ادب کے فروغ کے لیے بھی تنظیمیں کوشاں دکھائی دے رہی ہیں۔ اور مشاعروں، اردو زبان کی کتابوں کی طباعت سے اردو ادب کو فروغ دیا جارہا ہے۔

سوال: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

جواب: کلاسیکیت اور جدیدیت کا رشتہ ہر اس چیز سے ہے جو ماضی میں تھی اور حال میں بھی موجود ہے۔ بالکل اردو زبان کی طرح جو ماضی میں تھی اور حال میں بھی نہ صرف موجود ہے بلکہ پہلے سے زیادہ تابندہ اور مستحکم ہے۔

زبان میں بگاڑ کو روکنے کے لیے ہمیں چاہیے کہ سب سے پہلے اردو میں گفتگو کے درمیان جو انگریزی کے الفاظ ہم صرف اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ ہماری گفتگو اثردار ہو اور سامنے والے کو ہمارا معیار بلند دکھائی دے ان الفاظ کا استعمال بند کرنا ہوگا۔ دراصل ایسا کر کے ہم زبان میں بگاڑ پیدا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ زبان کے بگاڑ کو روکنے کے لیے ہمیں چاہیے کہ بات نپی تلی اور مناسب الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کریں۔ اس کے لیے زبان پر عبور پیدا کرنا ہوگا۔

لہٰذا میں یہ کہتا ہوں کہ کلاسیکیت اور جدیدیت کی گفتگو سے زبان کو فائدہ ہی ہوگا۔ ماضی میں اس زبان میں جو الفاظ علاقوں کے اعتبار سے اردو زبان میں استعمال کیے جاتے تھے آج ان کی جگہ فصیح اور معیاری الفاظ نے لے لی ہے۔ اس طرح زبان کے اس سفر میں اردو الفاظ میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

جواب: ہمارے علاقے میں تقریباً بارہ اردو مدارس ہیں جن میں تقریباً اسی اساتذہ موجود ہیں۔ جو علاقے میں اردو کی آبیاری میں لگے ہوئے ہیں۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

جواب: ہمارے علاقے میں تقریباً بیس لائبریریاں ہیں جہاں لوک مت، لوک مت سماچار، بھاسکر، اورنگ آباد ٹائمز، دیویہ مراٹھی کے علاوہ دیگر پچیس قسم کے اخبار اور رسالوں میں بچوں کی دنیا، خواتین کی دنیا، اردو دنیا کے علاوہ دیگر علاقائی زبان کے کئی رسالے آتے ہیں۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

جواب: ہمارے علاقے میں کچھ وقت پہلے تک بزمِ دکن اردو تنظیم قائم تھی۔ جو تین ایوارڈ عصمتِ مراٹھواڑہ، ولی اورنگ آبادی اور ڈاکٹر لمہ جعفر آبادی کے نام اردو میں نمایاں خدمات انجام دینے والی شخصیات کو دیے جاتے تھے۔ مگر اب تنظیم سے جڑے حضرات کی دوسرے شہروں میں منتقلی کے سبب تنظیم کا کام ٹھہرا ہوا ہے۔

سوال: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

جواب: ہمارے علاقے میں اردو سے جڑی کئی شخصیات موجود ہیں۔ اور ان میں سے ہر کسی کا اردو کی خدمات کا علاقائی اور قومی سطح اعتراف کیا گیا ہے۔

سوال: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

جواب: جہاں تک اپنے طور پر اردو کے فروغ کی بات ہے تو میں اردو زبان کے فروغ کی کوشش کو کام نہیں بلکہ قرض مانتا ہوں۔ جس اردو نے مجھے یہ اعلیٰ مقام دیا اس اردو کے فروغ کے لیے طلبا میں خوش خطی کا مقابلہ کرانا، طلبا اور اپنے سے مخاطب شخص کے اردو کے تلفظ کو درست کرنا، اردو اخباروں کو نہ صرف پڑھنا بلکہ اوروں کو بھی اس کی ترغیب دینا، اردو میں مضامین لکھنا وغیرہ میرا روزانہ کا معمول ہے۔

سوال: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

جواب: فروغ اردو کے لیے ہمیں چاہیے کہ پہلے ہم ذاتی طور پر اردو سیکھیں اور پھر اس کے بعد اپنے نونہالوں کا داخلہ بھی اردو مدارس میں کروائیں تاکہ وہ بھی اردو زبان جاننے والے بن جائے۔ اس کے علاوہ دیگر زبانوں میں تحریر شدہ عمدہ اور اچھی کتابوں کا بڑے پیمانے پر اردو زبان میں ترجمہ کروانا چاہیے۔ ساتھ ہی اردو اخبار اور رسالوں کے مطالعے کا چلن عام کرنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی اسکولوں میں اردو تحریر اور بیت بازی سے متعلق مقابلوں کا انعقاد کرنا چاہیے۔ جن حضرات نے

جہاں تک اپنے طور پر اردو کے فروغ کی بات ہے تو میں اردو زبان کے فروغ کی کوشش کو کام نہیں بلکہ قرض مانتا ہوں۔ جس اردو نے مجھے یہ اعلیٰ مقام دیا اس اردو کے فروغ کے لیے طلبا میں خوش خطی کا مقابلہ کرانا، طلبا اور اپنے سے مخاطب شخص کے اردو کے تلفظ کو درست کرنا، اردو اخباروں کو نہ صرف پڑھنا بلکہ اوروں کو بھی اس کی ترغیب دینا، اردو میں مضامین لکھنا وغیرہ میرا روزانہ کا معمول ہے۔

اردو کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی یا جو اس کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں ایسے حضرات کو اعزاز و اکرام سے نوازہ جائے۔ دیگر مذہب کے لوگوں اور دوسری زبان کے طالب علموں میں اردو زبان کی شیرینی واضح کرتے ہوئے انھیں یہ جتایا جائے کہ اردو زبان کسی ایک قوم یا مذہب کی نہیں بلکہ عالمی زبان ہے اور اس کو پڑھنے کا حق ہر کسی کو حاصل ہے۔

سوال: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

جواب: یہ ایک بڑی فکر والی بات ہے کہ اردو رسم الخط کو ختم کر کے دیوناگری کو اس کے بدل کے طور پر لادنے کی کوشش ماضی سے ہوتی آرہی ہے۔ اور بدقسمتی تو یہ ہے کہ کئی اساتذہ اپنے شاگردوں کو جنھیں اردو نہیں آتی یا کم آتی ہے انھیں دیوناگری رسم الخط میں ہی تحریر کی اجازت دے دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ہم میں سے ہی بہت سے روشن خیال لوگ اردو کو دیوناگری رسم الخط میں تحریر کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اپنے نونہالوں کو اردو زبان سکھاتے ہوئے اردو رسم الخط میں ہی اردو لکھنا سکھائیں۔ اسکولوں میں اساتذہ کو اردو رسم الخط میں ہی طلبا کو تحریر کرنے کی جانب خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ خط و کتابت کرتے ہوئے اردو رسم الخط کا ہی استعمال کیا جانا چاہیے تبھی اردو رسم الخط جو اردو زبان کی اصل پہچان ہے زندہ رہے گا۔

سوال: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

جواب: علاقائی زبان میں موجود مختلف کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کر کے، علاقائی زبان بولنے والوں میں اردو کی شیرینی کا احساس پیدا کر کے علاقائی زبانوں میں اردو کا فروغ کیا جاسکتا ہے۔

سوال: کیا آپ کے اہلِ خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

جواب: ہاں، میرے اہل خانہ میں ہر کسی کی تعلیم اردو میں ہی ہوئی ہے۔ لہٰذا اہل خانہ میں ہر کوئی اردو پڑھنا، لکھنا اور بولنا جانتا ہے۔

سوال: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

جواب: ہاں بے شک میرے بعد بھی میرے گھر میں اردو نہ صرف زندہ بلکہ تابندہ رہے گی۔ میرے والدین نے مجھے اور میرے بھائی بہنوں کو اردو میں تعلیم دلوائی۔ اور اب میں اور میرے بھائی بھی اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دے رہے ہیں۔ اور میں اپنے بچوں کو اردو تعلیم دلوانے کے تئیں پوری طرح فکرمند ہوں۔ اور میرے بچوں کی بھی اردو کے تئیں خصوصی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے بعد بھی میرے گھر میں اردو زندہ رہے گی۔

سوال: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

جواب: ہمیں چاہیے کہ غیر اردو حلقے میں بھی اردو زبان کا سب کی زبان یا ملکی زبان کے طور پر تعارف کرایا جائے۔ آزادی سے قبل کس طرح ہر ہندوستان اس زبان کا استعمال کرتا تھا، اور اس زبان نے کس طرح ہر ہندوستانی کو اپنا گرویدہ بنایا ہوا تھا اس جانب توجہ مبذول کروانی ہوگی۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنے کالجیز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہیں؟

جواب: ہمارے علاقے اور خصوصی طور پر جالنہ ضلع میں بڑے پیمانے پر اردو کے کالج موجود ہیں جہاں طلبا بہتر طریقے سے اردو تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں انجمن اشاعت تعلیم کے زیر اہتمام اردو ہائی اسکول، جونیئر کالج اور امسال ہی سینئر کالج شروع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ فاصلاتی تعلیم میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، متسیو دری کالج میں شعبۂ اردو، نیشنل اسکول، ڈی ایڈ کالج شامل ہیں۔

سوال: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

جواب: اردو زبان صرف ملکی نہیں بلکہ عالمی زبان کا درجہ رکھتی ہے اس حیثیت سے اس کی ترویج و اشاعت بھی ہونی چاہیے۔ ملکی سطح پر کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی کتابوں کی اشاعت، اردو موبائیل ایپ، آن لائن بک تیار کرنے جیسے کاموں کی مدد لی جاسکتی ہے۔

سوال: سینٹرل اسکولوں اور نو دے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

جواب: ہمارے شہر اور اطراف میں سینٹرل اسکول اور نو دے ودیالیہ تو ہیں مگر اس میں اردو کا کوئی انتظام نہیں۔ ایسے اسکولوں میں مراٹھی اور ہندی ہی ذریعہ تعلیم ہے۔

■

Shaikh Sabiruddin Nooruddin
Temboorni
Tehseel: Jafrabad
Distt: Jalna - 431208 (MS)

ابن کنول

مرزا مظہر جانِ جاناں انسانیت کے علمبردار

اٹھارہویں صدی عیسوی ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی، تہذیبی اور ادبی اعتبار سے بہت اہم صدی رہی ہے، عظیم الشان مغل سلطنت کا زوال اس صدی میں ہوا، تہذیبی اقدار کا شیرازہ بکھر گیا، اردو زبان اور شاعری کو فروغ ملا۔ 1526 میں ظہیر الدین بابر نے جس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی 1707 میں اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد منتشر ہوگئی، اکبر اور شاہ جہاں کے قلعوں کی بنیادیں اس صدی میں ہلنے لگیں۔ بابر سے اورنگ زیب تک تقریباً پونے دو سو سال صرف چھ بادشاہ تخت نشیں ہوئے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد صورت حال اس قدر بدتر ہوگئی کہ صرف بارہ سال میں چھ بادشاہ بدل گئے۔ بادشاہ اور شاہزادے عیش ونشاط میں سرگرم تھے اور سلطنت تباہ ہورہی تھی۔ قوم کی بدتر حالت کے پیش نظر بزرگان دین نے ملک کو انتشار سے بچانے اور معاشرے کی اصلاح کی حتی الامکان کوشش کی۔ ہندوستان اور خصوصاً دہلی کی سماجی زندگی میں صوفیا اور خانقاہوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بادشاہوں سے لے کر عوام تک خانقاہوں میں حاضری کے لیے جاتے تھے۔ صوفیا کے حسن سلوک اور اخلاق سے ہر مذہب وملت کے افراد متاثر تھے۔ ان کے یہاں امیر غریب، ہندو مسلمان، مرد عورت برابر سمجھے جاتے تھے۔ یہ بزرگ درباری زندگی سے دور فقیرانہ زندگی گزار کر دین حق کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ گذشتہ صدیوں میں بکثرت مشائخ ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ تمام سلاطین صوفیا کے ساتھ انتہائی تعظیم وتکریم سے پیش آتے تھے۔ مغلیہ عہد میں تمام روحانی سلسلے ہندوستان میں موجود تھے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا تھا، عوام وخواص نے خانقاہوں میں پناہ تلاش کی۔ اس صدی میں شاہ ولی اللہ، شاہ کلیم اللہ، سعد اللہ گلشن، خواجہ ناصر عندلیب، شاہ فخر الدین دہلوی، مرزا مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد اور شاہ حاتم جیسی شخصیات موجود تھیں۔ جس وقت اورنگ زیب کا انتقال ہوا، دہلی میں صوفیانہ تصورات کو بہت زیادہ فروغ حاصل تھا۔ اس عہد میں خانقاہی ماحول اور درویشوں سے عقیدت کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ بیشتر امراء ووزراء ان بزرگوں کے یہاں حاضری دیتے تھے۔ یہ وہ بزرگ تھے جنھوں نے خود کو عبادت الٰہی اور خدمت خلق کے لیے وقف کردیا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد نقشبندیہ سلسلے کے اہم بزرگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ دونوں اردو شاعری کی تاریخ کا بھی اہم حصہ ہیں۔ خواجہ میر درد کہتے ہیں۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیے
پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیے
تیرے سوا نہیں کوئی دونوں جہان میں
موجود ہم جو ہیں بھی تو اپنے گمان میں

مرزا مظہر جان جاناں نقشبندی کا مرتبہ اپنے عہد میں بہت بلند تھا۔ ہر طبقے کے افراد عزت واحترام کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ جیسے عالم دین نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

’’شریعت وطریقت کے راستے اور کتاب وسنت کی پیروی میں اس قدر ثابت قدم تھے کہ اس وقت بلاد مذکور میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ شاید مرحومین میں بھی نہ ملے۔ بلکہ زمانے کے ہر حصے میں ایسے عزیز الوجود لوگ کم ہوئے ہیں۔ اس عہد کا تو ذکر ہی کیا جو فتنہ وفساد سے بھرا ہوا ہے۔‘‘

(تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی جلد دوم، ص 361)

مرزا مظہر جان جاناں کی حیات کے بارے میں مختلف تذکروں اور ان کے فارسی خطوط سے علم ہوتا ہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ ان کی نسبت کا سلسلہ چھبیس واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاملتا ہے۔ آٹھویں صدی ہجری میں ان کے بزرگ ترک وطن کرکے طائف سے ترکستان چلے گئے۔ مغل بادشاہ ہمایوں نے جب دوبارہ پٹھانوں کو شکست دے کر ہندوستان کی بادشاہت سنبھالی تو اس خاندان کے دو افراد مجنوں خان اور بابا خان ہمایوں کے ہمراہ ہندوستان آگئے۔ ان کا خاندان مغل دربار سے وابستہ رہا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے والد مرزا جان اورنگ زیب کے منصب داروں میں شامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب مرزا صاحب کی ولادت کی خبر اورنگ زیب کو ملی تو اس نے ان کا نام ان کے والد کے نام کی مناسبت سے جان جاں تجویز کیا جو بعد میں جان جاناں ہوگیا۔ اسی نام سے مرزا مظہر مشہور ہوئے۔ یوں ان کا نام شمس الدین اور لقب حبیب اللہ تھا۔ جب شاعری شروع کی تو تخلص مظہر اختیار کیا۔

مرزا مظہر کی ولادت 11 رمضان 1113 ہجری کو کالا باغ (مالوہ) میں ہوئی۔ سولہ سال کی عمر تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ بیس سال کی عمر میں فقر کی راہ اختیار کی۔ حاجی محمد افضل سے حدیث اور تفسیر کا درس لیا۔ اس وقت نقشبندی سلسلے کے بزرگ نور محمد بدایونی موجود تھے۔ ان سے طریقہ نقشبندیہ کا خرقہ اور اجازت مطلقہ حاصل کی۔ بدایونی کے انتقال کے بعد ایک اور بزرگ مرزا شیخ محمد عابد سنامی سے وابستہ ہوئے۔ بعد میں تمام عمر طالبان خدا کی تربیت میں مشغول رہے۔ ابتدا میں فارسی اور اردو میں شاعری کی لیکن درویشی اختیار کرنے کے بعد ترک کردی۔ اردو زبان کی اصلاح میں مرزا مظہر جان جاناں

نے اہم کردار ادا کیا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں دہلی کے سیاسی حالات بہت ابتر تھے۔ نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، مرہٹوں اور روہیلوں کے حملوں نے دہلی سلطنت کو کمزور کر دیا تھا، انگریزوں کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس ماحول میں مرزا جان جاناں کی مقبولیت عام و خواص میں بڑھ رہی تھی۔ ان کی خانقاہ کی شہرت دہلی سے باہر بھی بہت زیادہ تھی۔ روہیلوں کی آمد و رفت ان کے یہاں بہت کثیر تعداد میں تھی، روہیلے ان سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ دلّی سلطنت کے لیے روہیلے خطرہ بھی تھے۔ روہیلوں کی قربت مرزا جان جاناں کے قتل کا سبب بھی بنی۔ 1195 ہجری میں مرزا صاحب کو شہید کر دیا گیا۔

ہندوستان میں تصوف کی روایت حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی آمد ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں نقشبندیہ سلسلے کی ابتدا کی۔ جس کے فروغ میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اہم کردار ادا کیا۔ مرزا مظہر جان جاناں نے اٹھارہویں صدی میں حضرت مجدد الف ثانی کی روایت کو آگے بڑھایا اور پورے ہندوستان میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

مرزا مظہر جانا جاناں کا شمار اپنے عہد کی بہت اہم شخصیات میں ہوتا تھا۔ سیاسی، مذہبی اور ادبی معاملات کے علاوہ دیگر مسائل بھی لوگ ان کے پاس لے کر آتے تھے۔ مرزا صاحب کے افکار کا علم ان کے خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے مختلف افراد کو تحریر کیے۔ خطوط ذاتی رشتوں کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں جن میں لکھنے والا احوالِ دل بیان کرتا ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے عزیزوں، مریدوں اور دیگر احباب کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں بہت سی وضاحتیں کی ہیں بلکہ ان کی زندگی کے صحیح حالات کا علم بھی ان کے خطوط ہی سے ہوتا ہے۔ ان کے بعض دوستوں نے ان سے شریعت و طریقت کے مسائل معلوم کیے تو ان کا جواب انھوں نے اپنے خطوط ہی میں بیان کیا ہے۔ مرزا صاحب ہمہ وقت رشد و ہدایت میں مصروف رہتے تھے۔ اس لیے تصنیف و تالیف کو وقت نہیں دے پائے۔ ابتدائے عمر میں فارسی اور اردو میں شاعری کی، بعد میں وہ بھی ترک کر دی۔ ان کا ایک فارسی کلام کا دیوان ان کے مقدمے کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ اردو کلام مرتب نہیں ہو سکا۔ مختلف تذکروں میں ان کے اردو اشعار شامل ہیں۔ ان کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ ڈاکٹر خلیق انجم نے کیا۔ راقم نے اسی ترجمے سے استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم اپنے مقدمے میں خطوط کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مواد کے اعتبار سے بھی ان خطوط کی بہت زیادہ اہمیت ہے، بعض خطوط میں مرزا صاحب نے تصوف کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے، خاص طور پر ابتدائی 23 خط اس سلسلے میں بہت اہم ہیں، پہلے خط میں اپنے حسب و نسب اور مختصر سے خاندانی حالات بیان کیے ہیں۔ باقی خطوط میں مریدوں اور معتقدوں کے شبہات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ یہ خطوط مرزا کے مسلک، ان کے عقائد اور نظریات کو سمجھنے کا بہترین اور واحد ذریعہ ہیں۔ ان خطوط میں تصوف کے اہم ترین مسائل، جبر و اختیار، سماع، کرامات و خرق و عادات، وحدت وجود، نسبت، علم حضوری و حصولی، اتباعِ سنت اور ذکرِ جہر وغیرہ جیسے اہم مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے عقائد کے سلسلے میں جو چیز ہمیں سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ہندو دھرم کے بارے میں ان کے نظریات ہیں جن سے ان کی ذہنی کشادگی، وسعتِ قلب اور انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے۔''

(مرزا مظہر جانا جاناں کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، دہلی 1989، ص 83)

مرزا صاحب کے روبرو اکثر مرید اور دیگر افراد مسائل لے کر جاتے تھے جن کا وہ اطمینان بخش جواب دیتے تھے۔ دور دراز کے مرید خطوط کے ذریعے سوالات کیا کرتے تھے۔ حضرت نے اپنے خطوط میں ان کے جوابات دیے ہیں ان جوابات سے بہت سے اہم مذہبی نکات پر روشنی پڑتی ہے۔ حضرت کے بہت سے خطوط ایسے ہیں جن کے مکتوب الیہ کا نام معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ عموماً مرزا صاحب بغیر القاب کے خط شروع کر دیتے ہیں لیکن ہر خط میں سوال کرنے والے کا تسلی بخش جواب دیتے ہیں۔ ان کے یہ خطوط بہت سے مسائل کو سمجھنے میں آج بھی معاون ہوتے ہیں۔ ایک خط میں 'نسبت' کے متعلق لکھتے ہیں:

''تم نے پوچھا تھا کہ صوفیوں کی اصطلاح میں 'نسبت' کے کیا معنی ہیں، جاننا چاہیے کہ عربی لغت میں نسبت کا مطلب طرفین کا تعلق ہے اور اس قوم (صوفیا) کی اصطلاح میں وہ تعلق مراد ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان ہوتا ہے اور جسے متکلمین صانع اور مصنوع کے رشتے سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے کوزے اور کمہار سے رشتہ ہوتا ہے اور بہ ظاہر کتاب و سنت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔'' (خط 3، ص 101)

بعض افراد نے اپنے خطوط میں حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق سوالات کیے ہیں جن کا تفصیلی جواب مرزا مظہر جان جاناں نے لکھا ہے۔ کسی شخص نے ان سے یہ بھی معلوم کیا کہ مجدد الف ثانیؒ اور عبدالقادر جیلانیؒ میں کس کو فضیلت حاصل ہے، جس کا مرزا صاحب نے بہت ہی مشفقانہ لہجہ میں جواب دیتے ہوئے لکھا کہ:

''(کوئی) ایسا صاحب کشف بھی نظر نہیں آتا جو ان دونوں حضرات کے کمالات کا احاطہ کرے اور ان میں سے کسی ایک کی فضیلت کلی کا قطعی فیصلہ کر دے، اس لیے سب سے زیادہ سلامتی کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو علم الٰہی کے سپرد کر دیا جائے اور ایسی فضول باتوں کی طرف سے خاموشی اختیار کی جائے۔ ان دونوں بزرگوں کے فضائل کا اعتراف کرنا چاہیے اور اس میں زبان کھولنا سوئے ادب ہے کیونکہ یہ مسئلہ ضروریات دینی میں سے نہیں ہے کہ جس میں بولنا ضروری ہو۔'' (خط 7، ص 114)

میرا خیال ہے اس سے بہتر جواب ایک صوفی منش کے لیے نہیں ہو سکتا جو دنیا میں امن کا پیغام دینے کے لیے ہوتا ہے، اختلاف کا نہیں۔ یہاں تک کہ جب کسی نے مرزا مظہر جان جاناں سے معلوم کیا کہ ہندوؤں کے عقائد کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، تو انھوں نے بہت دانشمندانہ انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے ایک خط (خط 14) میں جواب دیا، حضرت نے خط میں ہندوؤں کی مقامی الہامی کتابوں یعنی چاروں وید کا ذکر کیا اور قرآن کی ایک آیت جس میں کہا گیا ہے کہ کوئی امت ایسی نہیں جس میں رسول نہ بھیجا گیا ہو، کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ

ممالک ہند میں بھی انبیا اور رسول بھیجے گئے ہیں اور جن کے احوال ان کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ بہت سے انبیا کے احوال کے بیان میں خاموشی ہے یعنی کچھ معلوم نہیں ہے، اس لیے ان کی شان میں خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ مرزا صاحب عملی طور بھی اس ذہنی کشادگی کا مظہر تھے، ان کے احباب اور عقیدت مندوں میں متعدد ہندو شامل تھے، وہ عقائد کے پیش نظر کسی میں تفریق نہیں کرتے تھے۔

مرزا صاحب کے یہاں انسان دوستی کو اولیت حاصل تھی، وہ چاہتے تھے کہ کسی بھی شخص کے عقائد اور عمل سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے۔ وہ اتباع سنّت کے معاملے میں بہت زیادہ سخت تھے، لیکن اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ کسی کو ان کے عمل سے تکلیف نہ ہو۔ اسی بات کی تلقین اپنے احباب اور مریدوں کو کرتے تھے۔ ایک خط میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو یوں نصیحت کرتے ہیں:

''میرے بھائی عجیب بات ہے پانی پت کا ہر شخص تمہاری شکایتوں سے بھرا آتا ہے، معلوم نہیں تم کیا کرتے ہو، اگر تمہاری سچائی اور دیانت لوگوں کی تکلیف کا سبب ہے تو ایسی راستی سے باز آؤ۔ لوگوں کی دلجوئی اور حفظِ حرمت کے لیے تاویل سے کام لیا کرو کیونکہ (تمہارے عمل سے) طریقہ اور پیران طریقہ بدنام ہوتے ہیں۔ ان کمالات ظاہری اور باطنی کے باوجود لیمُوں کی خاطر دوسروں کو آزردہ کرنا اور خود کو بدنام کرنا عقل سے دور کی بات ہے، لوگوں کی ناراضگی رشد و ہدایت کے سلسلے کو نقصان پہنچاتی ہے۔'' (خط 77، ص 240)

ایک اور خط میں قاضی ثناء اللہ کو لکھتے ہیں:

''ہم لوگوں کو جو اذیت اور تکلیف پہنچتی ہے وہ ہمارے اعمال کی سزا ہے۔ اگر بزرگوں کے ساتھ ادب اور چھوٹوں کے ساتھ پیار اور شفقت سے زندگی گزارو تو کوئی تم سے برائی نہیں کرے گا۔ شوہر کی خدمت اور اطاعت کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ دین اور دنیا کی فلاح اور رضائے خداوندی اسی پر موقوف ہے۔ غضب اور غصہ کو پی جانا چاہیے۔ واہیات باتوں سے زبان کو روکنا چاہیے اور نماز میں بھی پابندی کرنی چاہیے۔ اس کے بعد کس کی مجال ہے کہ تمہیں تکلیف پہنچائے۔''

(خط 82، ص 249)

ان خطوط سے مرزا مظہر جان جاناں کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی بزرگی ان کی کشادگیِ دل میں پوشیدہ تھی، ان کی عاجزی و انکساری نے ان کے مرتبے کو بلند کر دیا تھا۔ وہ دل میں کدورت نہیں رکھتے تھے، جو ایک بلند پایہ صوفی کا وصف ہے۔ معاف کرنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ نجف خاں جس نے ان پر قاتلانہ حملہ کروایا اور جو انتقال کا سبب بنا، انھوں نے اسے بھی معاف کر دیا۔ مرزا صاحب نے اپنی بد زبان اور دیوانی بیوی کے ساتھ بھی کوئی برا سلوک نہیں کیا۔ جنھوں نے ان کی زندگی عذاب بنادی تھی۔ ہمیشہ ان کی دلجوئی کی۔ اگر کبھی کسی سے ناراض ہوئے تو بہت جلد ناراضگی دور بھی ہو جاتی۔ میاں محمد قاسم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''فقیروں کی ناراضگی تو ایک مٹھی مٹی کی طرح ہوتی ہے جو دریا میں ڈال دی جائے۔ اب مجھ پر کوئی اثر نہیں۔ تم نے جو اس خط میں حد سے زیادہ معذرت کی ہے اس نے میرے دل کا غبار دھو دیا۔ بے فکر رہو۔''

(خط 34، ص 180)

مرزا صاحب اپنے مریدوں کو ہمیشہ انسان دوستی کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کا دل انسانیت اور محبت کے جذبات سے سرشار تھا۔ ایک اور خط میں شاہ محمد سالم کو لکھتے ہیں:

''تم شریعت کے التزام اور طریقت کے اشغال میں مصروف رہو۔ لوگوں سے خاکساری اور بے نفسی سے ملو، کیونکہ کمال نفس نیک نیتی میں ہے اور ہستی صرف خدا کے لیے مسلم ہے۔ عالموں اور فقیروں کی صحبت کو لازمی سمجھو۔ دنیا کے مکروہات پر صبر کرو کیونکہ مومنوں کے لیے دنیا قید خانہ ہے اور راحت کا وعدہ آخرت کے لیے ہے بشرطیکہ ایمان سلامت رہے۔ خدا کی عطا کی ہوئی کم و بیش نعمتوں پر شکر ادا کرو۔ بد خلقی سے پیروں کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی تمہارے طریقے کی طرف آئے تو اس سے خدمت نہیں لینی چاہیے، بلکہ اس کی خدمت کرو۔''

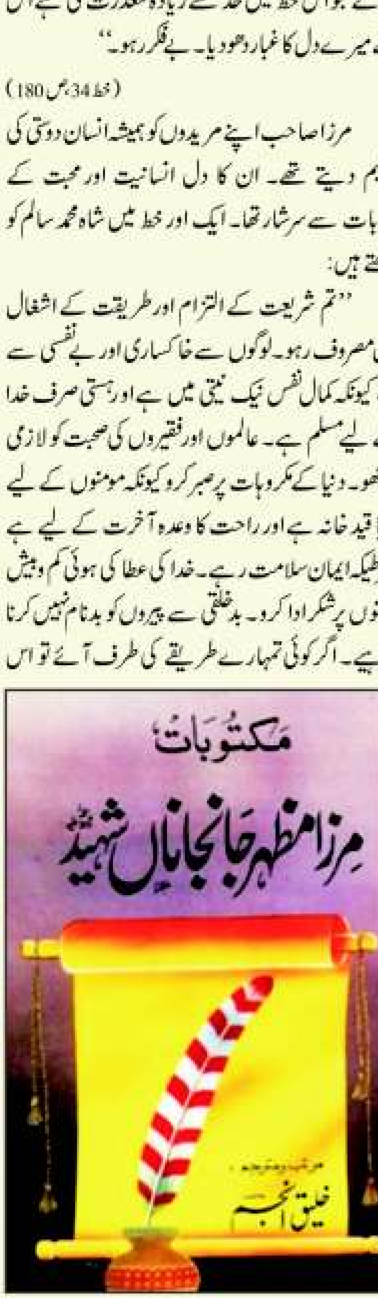

(خط 32، ص 176)

مرزا مظہر جان جاناں اپنے خطوط میں عزیزوں اور مریدوں کو شریعت اور طریقت کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہیں، لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایت دیتے ہیں۔ حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی کے خود بھی پابند تھے اور دوسروں کو بھی ان کی ذمے داریاں یاد دلاتے رہتے تھے۔ اس لیے مرزا جان جاناں نقشبندی کا شمار اٹھارہویں صدی کی بڑی شخصیات میں ہوتا ہے۔ سبھی تذکرہ نویس ان کی اعلیٰ صفات کو بیان کرتے ہیں۔ لوگ ان کی ظاہری شکل و صورت سے بھی مرعوب ہوتے تھے اور خوش گفتاری سے بھی۔ ان کے لہجے میں جو نفاست اور نزاکت تھی وہ ہر ایک کو ان کا گرویدہ بنا دیتی تھی۔ ان کے علم و فضل سے اس عہد کے علما بھی مرعوب تھے۔ علم حدیث، تصوف اور اسلامی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی، جس کا ثبوت ان کے خطوط بھی ہیں جن میں انھوں نے امور دینوی و دنیاوی نقل کیے ہیں۔ ان کے ہر عمل سے ان کی وسیع المشربی اور انداز فکر ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنے عہد کے سیاسی حالات پر نہ صرف نظر رکھتے ہوئے تھے بلکہ ملک و ملت کے لیے فکر مند بھی تھے، جس کا اظہار انھوں نے اپنے خطوں میں احباب سے بار بار کیا ہے۔ ایک خط میں صاحبزادہ غلام عسکری خاں کو لکھتے ہیں:

''شہر کے حال سے لے کر محل کی خبروں تک فقیر سے کچھ نہیں چھپا۔ اور جو حقیقت ہے فقیر تک پہنچ جاتی ہے۔ ہر چند میں نے کئی بار اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نواب جو کچھ کرنا چاہے مجھے بتا دے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ورنہ میں ایسی بنیاد رکھتا کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے۔ مشکل یہ ہے کہ نواب کے تمام مشورہ دینے والے لالچی اور خود غرض ہیں۔ اکثر نیچ قوم سے ہیں اور جو شریفوں میں سے ہیں وہ منافق ہیں۔'' (خط 70 ص 229)

مرزا مظہر جان جاناں نے تمام عمر سنّت نبوی پر سختی سے عمل کیا۔ انسان دوستی، سچائی اور صداقت ان کا ایمان تھا۔ ان کی وسعت قلبی اور ذہنی کشادگی نے ان کا مرتبہ صوفیا میں بہت بلند کر دیا ہے۔ ان کے ارشادات آج بھی دنیا میں انسانیت کے فروغ میں ان کے قیام کے لیے مشعل بن سکتے ہیں۔

■

Prof. Ibne Kanwal
Dept. of Urdu
Delhi University
Delhi - 110007

انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں

بلال احمد ڈار

جب ہم انشائیہ کے ابتدائی نقوش تلاش کرتے ہیں تو ہماری تلاش فرانس کے ادیب مشیل دی مونتین پر ختم ہوجاتی ہے کیونکہ انھیں مغرب میں اس صنف کا موجد و بانی قرار دیا گیا ہے۔ ان کی انشائیہ نگاری کا سورج ہر دور میں چمکتا ہی رہا ہے اور ہر زمانے میں اسے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ میسر آتا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ میں مونتین کی اولیت کے باوجود اسے حتمی، مثالی یا حرف آخر قرار نہیں دیا گیا۔ زندگی کے آخری ایام میں دنیا کے ہنگاموں سے بالاتر ہوکر مونتین نے اپنے آپ کو پڑھنے لکھنے کے لیے وقف کردیا۔ فرصت کے ان ایام میں اس نے اپنی فہم و فراست اور قابلِ داد صلاحیتوں کی آزمائش کے لیے مختلف عنوانات پر غیر رسمی انداز میں قلم برداشتہ لکھنا شروع کیا۔ مونتین نے اس ذہنی آزمائش اور غیر مربوط خیالات کو Essai کا نام دیا۔

مونتین کے ایسیز میں ادیب کی شخصیت اور ادیب کے جذبات و احساسات جلوہ گر ہیں جب کہ بیکن کے ایسیز معروضی نوعیت کے ہیں اور علمی ہونے کی وجہ سے فلسفیانہ رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ دونوں ادیب ایسّے نگاری میں الگ الگ اسلوب کے خالق ہیں۔ متاخرین میں ایسّے نگاروں کی ایک بڑی تعداد ان ہی دو نمایاں اور نمائندہ اسالیب کا تتبع کرتی نظر آتی ہیں۔ بیکن کے بعد انگریزی ایسّے نگاروں میں ابراہیم کاولے کو بہت ہی نمایاں مقام حاصل ہے۔ انگریزی ایسّے کے ابتدائی دور کے ایسّے نگاروں میں سر تھامس اوور بری اور جان ارل وہ ایسّے نگار ہیں جنھوں نے تھیو فراسٹس کے طرز پر کردار نگاری کی ہے۔ انگریزی اخبارات و جرائد نے بھی انگریزی ایسّے نگاری میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔

اردو ادب میں لفظ انشائیہ انگریزی لفظ Essay کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔ انگریزی میں رسمی یا غیر رسمی، شخصی، سماجی، تنقیدی، سیاسی یا مذہبی وغیرہ ہر طرح کے مضامین کے لیے یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ انگریزی ادب میں لائٹ ایسّے یا پرسنل ایسے یا آرٹیکل کو مجموعی طور پر ایسّے ہی کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ اردو میں پہلے پہل ایسّے کے لیے اردو زبان کا لفظ مضمون استعمال کیا جاتا تھا بعد میں اس لفظ کو اردو والوں نے متعدد معنوں میں استعمال کیا اور ہر قسم کے ادب پاروں مثلاً علمی، تنقیدی، سوانحی، رسمی یا غیر رسمی وغیرہ کے لیے لفظ 'مضمون' کا استعمال کیا جانے لگا۔ انگریزی لفظ ایسّے کی طرح اردو لفظ 'مضمون' بھی وسعت اور جامعیت کے اعتبار سے ہر طرح کے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹنے لگا۔ مضمون میں طنزیہ اور مزاحیہ ادب پارے بھی جگہ پاگئے۔ علمی مقالوں، مذہبی اور سوانحی مقالوں، شخصیات کے خاکوں، مراسلوں، جلسوں اور جلوسوں کی رپورتاژ، روزنامچوں اور اداریوں کو مجموعی طور پر مضمون ہی کہا جاتا تھا۔ لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ جوں ہی اردو زبان میں وسعت آئی اور اس میں مختلف ناموں کے تحت نئی اصناف نے جنم لینا شروع کیا اور بعض اصناف مغربی ادب کے زیر اثر اس میں پہنچنے لگیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ اردو ادب میں بعض ایسے ادب پارے تخلیق کیے جانے لگے جو غیر رسمی انداز بیان اور ایک منفرد اسلوب کی بنا پر مراسلوں، مقالوں، کیفیہ، سوانحی مضامین، اداریہ، خاکہ، روزنامچہ وغیرہ سے بالکل مختلف نوعیت کے حامل تھے۔ اس نوعیت کے مضامین کو لائٹ ایسّے، انشائے لطیف، لطیف پارہ، مضمون لطیف، طیفیہ، مراقبہ، افکار پریشاں وغیرہ کا نام دیا جانے لگا۔ بعد میں لائٹ ایسّے یا انشائے لطیف جیسے مضامین کو ہی انشائیہ کا نام ملا اور اردو ادب میں انشائیہ ایک تناور درخت کی صورت میں ابھر کر پروان چڑھنے لگا۔ دیگر اصناف کی طرح انشائیہ کو بھی ایک صنف کی حیثیت سے تسلیم کیا جانے لگا۔ اردو میں آکر ایسّے نے پہلے مضمون کا چولا اختیار کیا اور مضمون کے ہی بطن سے انشائیہ نے جنم لیا۔ انشائیہ ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے کرتے اپنی تکنیک، ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے نثری ادب میں ایک الگ صنف کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ سید محمد حسنین 'انشائیہ کی صنفی حیثیت کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

''انشائیہ مضمون کی ایک قسم ہے، بظاہر یہ خیال درست ہے۔ پر یہ وہ مضمون نہیں جس میں مراسلہ کی خیر و خیریت ملتی ہے یا مقالہ کی معلوماتی اور فکر انگیز روشنی، جس میں کیفیہ کی رقت خیزی ہو یا سوانح حیات کے تاریخ وار کارنامے، جس کی روئداد کی خشک کارروائیوں کا ذکر ہو یا روزنامچہ کے لخت لخت غیر متعلق بیانات، جس میں خاکہ کے رخ روشن کی تابانی نظر آئے یا رپورتاژ کی تاثراتی تفصیلات ...مراسلہ، مقالہ، کیفیہ، سوانح حیات، روئداد، خاکہ اور رپورتاژ مضمون کی مختلف شکلیں ہیں، ایسی مخصوص شکلیں جنھیں ہم 'اصناف' (Genres) کا مرتبہ دیتے ہیں۔

ان مضمون نما شکلوں میں انشائیہ بھی تحریر کی ایک منفرد صورت ہے اور نثری ادب میں اس کا اپنا ایک صنفی مقام ہے۔" (انشائیہ اور انشائیے: سید محمد حسنین، ص: 21)

لائٹ ایسّے، انشائے لطیف، مضمونِ پریشاں، کیفیہ وغیرہ کس طرح اور کب اردو ادب میں انشائیہ کے نام سے موسوم ہوئے اور انشائیہ کی اصطلاح کو اردو ادب میں سب سے پہلے کس نے رائج کیا اس بارے میں حتمی فیصلہ بہت ہی مشکل ہے۔ سید محمد حسنین کا کہنا ہے کہ اردو میں سب سے پہلے 'انشائیہ' کو صنفی لحاظ سے متعارف کرانے کا سہرا ڈاکٹر اختر اورینوی کے سر جاتا ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ 1944 میں 'ترنگ' کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں سید اختر نے 'تعارف' کے زیر عنوان مقدمہ لکھا۔ فاضل مقدمہ نگار نے اس طرح کی تحریروں کو انشائیہ کا نام دیا۔ پروفیسر یوسف بخی اس رائے سے متفق نہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ قول حقیقت پر مبنی نہیں کہ اردو میں انشائیہ کو صنفی لحاظ سے سب سے پہلے ڈاکٹر اختر اورینوی نے ادب میں روشناس کرایا۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں انشائیہ کے متعدد نمونے شائع ہوتے رہے جن میں خواجہ حسن نظامی کی سیپارۂ دل، نیاز فتحپوری کی 'نگارستان' کے انشائیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نثری نمونوں کی چھان بین سے ان سے پیشتر بھی انشائیوں کے نمونے ملتے ہیں۔"

(اردو زبان: انشائیہ نمبر، جلد 8 مارچ اپریل 1983 سرگودھا پاکستان، ص: 8)

سید سجاد نقوی کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے 'انشائیہ' کی اصطلاح ڈاکٹر وزیر آغا نے تجویز کی۔ پروفیسر جمیل آزر ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب 'خیال پارے' کو انشائیوں کا پہلا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انشائیوں کے اس مجموعے کی اشاعت کے ساتھ ہی اردو ادب میں اس صنف کی باقاعدہ تحریک کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اردو انشائیہ کے سلسلۂ نسب کے بارے میں خود کیا رائے رکھتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

"اختر اورینوی وہ پہلا ادیب تھا جس نے لوگوں کو شعوری طور پر لائٹ ایسّے کے مزاج سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ اختر اورینوی نے علی اکبر قاصد کے مضامین کے مجموعے کا جو دیباچہ تحریر کیا اس میں پہلی بار نہ صرف لائٹ ایسّے کے متقضیات کے بارے میں کھل کر لکھا بلکہ لائٹ ایسّے کے لیے انشائیہ کا لفظ بھی استعمال کیا مگر جن مضامین (یعنی علی اکبر قاصد کے مضامین) پر اس نے لفظ 'انشائیہ' چسپاں کرنے کی کوشش کی وہ عام سے طنزیہ مزاحیہ مضامین تھے، جن کا انشائیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اختر اورینوی انشائیہ کے متقضیات کو پیش کرنے پر قادر تھا لیکن انشائیہ کو پہچاننے میں کامیاب نہ ہوا، اسی لیے اس کا تجویز کردہ لفظ 'انشائیہ' بھی اس زمانے میں مقبول نہ ہوسکا۔"

(ماہنامہ 'شاعر' ممبئی، جلد 44 شمارہ: 2، 1995 ص: 10)

وزیر آغا کا کہنا ہے کہ 1950 سے 1960 تک کے عرصے میں انھوں نے رسالہ 'ادب لطیف' کے لیے بہت سارے پرسَل ایسّے تحریر کیے جنھیں ادب لطیف میں انشائے لطیف، لطیف پارہ، مضمون لطیف وغیرہ کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ پھر انھوں نے 'ادب لطیف' کے مدیر مرزا ادیب سے اس نوع کی تحریروں کے لیے 'انشائیہ' کا لفظ مختص کرنے کی تجویز پیش کی جس کو مرزا ادیب نے قبول کیا۔ وزیر آغا نے 'انشائیہ' کا لفظ بھارت کے کسی رسالے سے لیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"انھیں دنوں ہندوستان میں فکاہی مضامین کے لیے بعض ادبا نے 'انشائیہ' کا لفظ استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔ راقم الحروف نے ادب لطیف کی معاونت سے اس لفظ کو لائٹ ایسّے کے لیے استعمال کرنے کا آغاز کیا اور خوش قسمتی یہ ہوئی کہ نہ صرف اردو انشائیہ کی تحریک کامیاب ہوئی بلکہ اس کے ساتھ میں لفظ انشائیہ بھی مقبول ہوگیا۔"

(18 ماہنامہ "شاعر" ممبئی، جلد 44 شمارہ: 2، 1995 ص: 11)

ڈاکٹر سلیم اختر، وزیر آغا کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ اردو ادب میں لفظ 'انشائیہ' کو پہلی بار رائج کرنے کا سہرا وزیر آغا کے سر جاتا ہے۔ بقول ان کے کہ اردو ادب میں 'انشائیہ' کا لفظ بذاتِ خود خاصا پرانا ہے۔ ان کے خیال میں محمد حسین آزاد نے سب سے پہلے لفظ انشائیہ وضع کیا اور سب سے پہلا انشائیہ آزاد نے ہی لکھا ہے۔ سلیم اختر کا یہ بھی کہنا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلے بہت سارے ادیبوں نے اپنی تحریروں میں انشائیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مولانا شبلی نے 'موازنۂ انیس و دبیر' میں بلاغت کی بحث کے سلسلہ میں انشائیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ان مباحث کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی صنف ادب کو وجود میں آنے سے پہلے بہت سے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ انشائیہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ انگریزی کے ایسّے نے اردو میں آکر 'مضمون' کی صورت اختیار کی۔ مضمون نگاری کی کوکھ سے انشائیہ نے جنم لیا اور اب اردو ادب میں انشائیہ ایک تنومند درخت کی حیثیت سے اپنے قد و قامت اور منفرد خصوصیات کی بنا پر جانا اور پہچانا جاتا ہے۔

اردو انشائیہ کی اصطلاح ایک مخصوص صنف ادب کے لیے استعمال ہوتی ہے جس کا ایک خاص داخلی مزاج ہے۔ اردو میں بلا شبہ انشائیہ انگریزی سے آیا لیکن کچھ محققین کے مطابق اردو انشائیہ بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ انگریزی انشائیہ۔ جس دور میں Essay کو رواج دیا گیا، اردو میں بھی اسی طرح کے مضامین لکھے جارہے تھے۔ اس لیے کسی نے انشائیہ نگاری کی روایت کو ملا وجہی سے جوڑ دیا اور کسی نے سرسید سے اور کسی نے سجاد حیدر یلدرم سے۔ ڈاکٹر انور سدید 'انشائیہ اردو ادب میں' لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صنف کے کچھ نقوش بکھری ہوئی حالت میں قدیم اردو نثر میں بھی مل جاتے ہیں۔ جاوید وششٹ نے اپنی کتاب 'انشائیہ اور انشائیہ کچھی' میں ملا وجہی کی کتاب 'سب رس' کو انشائیہ کا نقش اول قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ وجہی نے سب سے زیادہ انشائیے فطرت انسانی سے متعلق ہی لکھے ہیں:

جاوید وششٹ نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اردو انشائیہ کوئی نئی کوشش نہیں بلکہ بہت قدیم ہے اور ملا وجہی پہلے انشائیہ نگار ہیں بہت زور صرف کیا لیکن ان کی بات کو اس لیے تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ ملا وجہی کی یہ تحریریں جداگانہ حیثیت میں نہیں لہٰذا ملا وجہی کی تحریروں کو انشائیہ نہیں بلکہ انشائیہ نما کہنا چاہیے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری بھی ان پر اعتراض کرتے ہیں اور ملا وجہی کی تحریروں کو صرف انشائیہ کے اولین نقوش قرار دیتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ملا وجہی کو اردو کا پہلا باقاعدہ انشائیہ نگار نہیں کہہ سکتے۔ سب رس میں موضوعات کا تنوع سہی مگر یہ سب تحریریں انشائیہ کے چند عناصر کی حامل تو ہوسکتی ہے، مکمل انشائیہ نہیں کہلائے جاسکتے۔ ملا وجہی کا دور وہی ہے جو عالمی ادب کے پہلے انشائیہ نگار مونٹین اور انگریزی Essay کے موجد بیکن کا ہے۔

اردو میں انشائیہ کے ابتدائی نقوش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وجہی کے ہاں ابتدائی نقوش ملتے ہیں لیکن درحقیقت تحقیق کے بعد اس بات کا پتہ چلا ہے کہ انشائیہ کے ابتدائی نقوش سرسید کے دور سے ملنا شروع ہوئے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس دور میں مغربی انشائیہ عروج پر تھا اور انگریزوں کے ساتھ ہی انشائیہ بھی مشرق میں آیا۔ خصوصاً جب سرسید نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا تو مغربی علوم سے واقفیت کی بنا پر اردو میں اس صنف کا آغاز ہوا لیکن درحقیقت ان کو انشائیہ

سے زیادہ مضمون کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کچھ مضامین ایسے بھی لکھے گئے جن میں انشائی عناصر ضرور پائے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ابتدائی مضامین نہ ہوتے تو انشائیہ کے وجود میں آنے میں کافی تاخیر ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کے دور کو انشائیہ کے حوالے سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ سرسید پہلے انشائیہ نگار تھے یا نہیں البتہ مضمون نگار ضرور تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان مضامین میں انشائیہ کے عناصر پہلی مرتبہ ضرور ملے لیکن بہت سے محققین نے سرسید کو ہی پہلا انشائیہ نگار تسلیم کیا ہے جن میں سید ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر وحید قریشی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر محمد زکریا، پروفیسر جمیل آزر، پروفیسر نظیر صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر وغیرہ شامل ہیں۔ سرسید کے مضامین طبع زاد نہیں تھے بلکہ انھوں نے ایڈیسن اور اسٹیل کی تقلید میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا اس لیے انھیں پہلا انشائیہ نگار ماننے میں قباحت نہیں۔ سرسید کے دور میں مضامین کو ہی انشائیہ سمجھا جاتا تھا پھر بھی ان کے کچھ مضامین انشائیے کے زمرے میں آتے ہیں مثلاً 'گزرا ہوا زمانہ'، 'امید کی خوشی'، 'سراب حیات' اور بحث و تکرار میں انشائی عناصر ملتے ہیں۔ ان کے مضامین میں کہیں سنجیدگی پائی جاتی ہے تو کہیں طنز و مزاح۔

جاوید وشسٹ کی طرح دوسرے محققین بھی انشائیہ کو نو خیز نہیں مانتے۔ خواجہ احمد فاروقی ماسٹر رام چندر کی تقدیمی حیثیت کو لائق احترام قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ماسٹر رام چندر نے اردو مضمون یعنی ایسے سے متعارف کروایا۔ ماسٹر رام چندر قدیم دلی کالج کے نامور اساتذہ میں سے تھے۔ خواجہ احمد فاروقی ان کو مضمون نگاری، ترجمہ، تاریخ اور سیرت نگاری میں چراغ راہ تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار خواجہ احمد فاروقی کی بات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ماسٹر رام چندر ایک علمی مضمون نگار تھے لیکن ادبی مضمون نگار نہیں تھے۔ ان کی نثر علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے تجربے کر رہی تھی، اس لیے اس میں ادبی نوعیت کی تلاش عبث ہے۔''

(مضامین رشید (مرتبہ) غلام حسین ذوالفقار، لاہور 1976)

اس قول سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ماسٹر رام چندر کے مضامین کی نوعیت تخلیقی نہیں تھی بلکہ وہ سائنسی عنوانات پر معلوماتی قسم کے مضامین تھے۔ ان کے مضامین میں خود ان کی شخصیت کے خدوخال نہیں اُبھرتے جو انشائیہ کا خاص وصف ہے اس لیے وہ انشائیہ کے فطری مزاج کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکے۔ بعض ناقدین مرزا غالب کے خطوط پر انشائیہ نگاری کا گمان کرتے ہیں جن میں وہ اپنے دوستوں سے محو کلام ہے اور تکلف کا کوئی پردہ ان کے درمیاں نہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''بے تکلفانہ گفتگو کا پیرایہ مجلسی زندگی کی یہ جزیات اور ماحول کے دلکش مرقع غالب کے بعض خطوط کو افسانے اور انشائیے کے قریب لے آتے ہیں۔''

(مضامین رشید (مرتبہ) غلام حسین ذوالفقار، لاہور 1976)

ایک انشائیہ نگار سے جس اسلوب کی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ یقیناً غالب کے ہاں موجود ہے۔ اس کی نثر میں انشائی مزاج سے مطابقت ملتی ہے لیکن موضوع کی عدم موجودگی اور ذات کے صرف نجی اور غیر ادبی گوشوں کی نقاب کشائی کی بنا پر انھیں انشائیہ نگار ثابت کرنے کے لیے تاریخی اسناد ہی کافی نہیں تخلیقی شواہد بھی ضروری ہیں۔

انشائیہ نگاری کا جو عمل انگریزی سے اردو میں آیا اس میں اگرچہ مضمون کی ہیئت تو موجود تھی لیکن طرز بیان میں زمین و آسمان کا فرق تھا کیونکہ انشائیہ لکھنے کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں ایک لمحے سے روک کر زندگی کے عام پہلوؤں کو پیش کرے جو ہماری نظروں کے گرفت میں آنے سے رہ گئے تھے یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ ہمارے سامنے موجود ہی نہیں تھے۔ اس مقام پر ایک انشائیہ لکھنے والا ایک سیاح کو درحقیقت وہ دکھانا چاہتا ہے جو کچھ اس کے سامنے ہونے کے باوجود موجود نہیں ہوتا۔ اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک انشائیہ لکھنے والا زندگی کے عام نظاروں کو ان تازہ پہلوؤں کو دیکھ لیتا ہے جو زندگی میں سطحی دلچسپی کے سبب ایک عام انسان کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ بلاشبہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ زندگی کی ان انوکھی اور تازہ کیفیات کا احساس دلانے کے لیے انشائیہ کا خالق کئی ایک طریقے اختیار کرتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ جیسے نثر نگار ایڈیسن اور اسٹیل کے تتبع میں انشائیہ نگاری کے قریب آجاتے ہیں مگر ایک سانس میں شرر سے امجد حسین تک سب کو وزیر آغا جیسا انشائیہ نگار بنا دینا انصاف نہیں اسی لیے ڈاکٹر انور سدید جیسے نقاد اس طرح کے غیر محتاط انداز میں گرفت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''جن محققین نے انشائیہ کا سراغ قدیم نثر میں لگایا ہے انھوں نے جزو کو کل پر فوقیت دینے کی کاوش کی ہے اور اپنے فیصلے کی اساس انشائیہ کی نثری اور غیر مرتب صورتوں پر رکھی ہے۔ مثال کے طور پر اسلوب کی روح پرور شگفتگی، میر امن کی باغ و بہار اور رجب علی بیگ سرور فسانہ عجائب میں بھی موجود ہے اور یہ انشائیہ کے مزاج کے ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ غیر رسمی انداز اور عدم تکمیل کی خوبی مرزا غالب کے خطوط میں بدرجہ اتم ملتی ہے۔ چنانچہ اگر انشائیہ کے کچھ عناصر لاشعوری طور پر ان کی نثر میں در آئے ہیں تو یہ اس صنف کی منضبط اور باقاعدہ ابتدا کی نشاندہی نہیں کرتے بلکہ محض اتفاقی ہے۔''

(23 انشائیہ اردو ادب میں: انور سدید، ص: 80)

ملا وجہی سے لے کر مرزا غالب تک اردو نثر کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ انشائیہ کے کچھ عناصر محض اتفاقی ہیں مگر سرسید کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ سرسید اپنے مضامین میں انشائیے کے مزاج سے واقف کار نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ایڈیسن اور اسٹیل کی تقلید میں مضمون نگاری کی ہے۔ ان کے بعض مضامین جدید انشائیہ کی تعریف سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔ گزرا ہوا زمانہ، امید کی خوشی، سراب حیات، بحث و تکرار، خوشامد وغیرہ اسی نوعیت کی تحریریں ہیں۔ انھوں نے ٹیٹلر اور سپکٹیٹر کی طرز پر تہذیب الاخلاق جاری کیا جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اصلاحی کردار کا آغاز کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے انگریزی ایسے میں فعال کردار ادا کرنے والے دیگر رسائل و جرائد سے بھی استفادہ کیا ہے۔ سرسید کے ہاں مقصدیت پر زیادہ زور صرف ہوا ہے اور چونکہ وہ انشائیہ برائے ادب کی غرض سے نہیں بلکہ مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے لکھ رہے تھے لہٰذا وہ اس کی تمام شعریات کو ملحوظ بھی رکھتے لیکن بحث و تکرار جیسے مضامین میں وہ ایک باقاعدہ انشائیہ نگار نظر آتے ہیں اور اسی وجہ سے سید ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر وحید قریشی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر محمد زکریا، پروفیسر جمیل آزر، پروفیسر نظیر صدیقی اور ڈاکٹر سلیم اختر جیسے نقاد انھیں اردو انشائیہ کے بانی کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ انگریزی سے اردو انشائیہ نگاری کا جو سفر شروع ہوا اس میں سرسید کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انگریزی ایسے کی طرز پر جدید انشائیے کے نقوش سرسید کے ہاں پوری طرح اجاگر ہوئے۔ سرسید اردو کے پہلے ادیب تھے جنھوں نے انگریزی ایسے کے بھرپور مطالعے کے بعد اردو میں اس صنف کو متعارف کرایا۔ ڈاکٹر سلیم اختر سرسید کے انشائی اسلوب کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''سرسید پہلے ادیب ہیں جنھوں نے انگریزی ایسے کی بدیسی صنف کی قلم کو گلشن اردو میں لگایا۔ انہوں نے

انگریزی ایسے کا مطالعہ کر رکھا تھا وہ اس کے مزاج داں بھی تھے۔انھوں نے طبع زاد لکھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی ایسے کے تراجم بھی کیے۔الغرض!اس نئی صنف سے وابستہ فنی اور اسلوبیاتی امکانات دریافت کرنے کی سعی کی۔" (انشائیہ کی بنیاد: ڈاکٹر سلیم اختر ،ص:71)

سرسید انشائیہ برائے تفنن کے مقصد کے لیے نہیں لکھتے تھے، انھیں انشائیہ میں شخصیت کے اظہار، اسلوب کی لطافت اور اس نوع کے دیگر فنی مباحث سے دلچسپی نہ تھی۔انھوں نے انگلستان کے قیام کے دوران ایسے پڑھے تو اس پہلو سے متاثر ہوئے۔ان کی انشائیہ نگاری خدمت قوم کا ہی ایک انداز تھی۔ان کے انشائیے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انشائیہ کے مزاج سے پوری طرح واقف کار تھے اور اگر انھوں نے انشائیہ لکھنا پسند کیا ہوتا تو وہ یقیناً صاحب طرز انشائیہ نگار ہوتے۔

سرسید کے معاصرین میں ایک اہم نام محمد حسین آزاد کا ہے جو سرسید کے رفقا میں تو شامل نہیں تھے بلکہ ان کے دور سے ہی تعلق رکھتے تھے۔محمد حسین آزاد اس دور کے وہ نثر نگار تھے جو اپنے منفرد اسلوب کی بنا پر اردو ادب میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔وہ نہ تو سرسید کی روکھی پھیکی نثر کو موزوں سمجھتے تھے اور نہ قدیم مقفی نثر کے حق میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے قدیم و جدید کے امتزاج سے ایک ایسا دلکش اسلوب اختیار کیا جو صرف انھی سے مخصوص ہے۔

اردو کے کچھ انشاپرداز جن کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں انشائیہ مل جاتا ہے ان میں مولوی ذکاء اللہ، مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، خلیق دہلوی، خواجہ حسن نظامی قابل ذکر ہیں۔ان میں مولوی ذکاء اللہ سرسید کے ساتھیوں میں سے تھے جب کہ بقیہ حضرات اس صدی کے ہیں جن کی مجموعی کاوشوں سے انشائیہ نگاری کے جس انداز نے فروغ پایا، اس پر پرسنل یا اس نوع کا کوئی لیبل نہیں لگایا جاسکتا لیکن نثر کے فروغ میں ان کی مساعی کی اہمیت کم نہیں کی جاسکتی۔

1975 سے لے کر اب تک کے دور کو بجا طور پر اردو انشائیے کی مسلسل کامرانیوں کا دور قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کی مقبولیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک امتزاجی صنف نثر ہے جس میں شعر جیسا حسن موجود ہے۔آزادی کے بعد ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان میں انشائیہ نے ترقی کے منازل طے کیں۔جس وقت پاکستان میں انشائیہ کی تحریک اپنے شباب پر تھی اس وقت ہندوستان کے صرف تین انشائیہ نگار اس صنف کے تحت اپنی تحریریں سپرد قلم کر رہے تھے جس کا اعتراف ڈاکٹر وزیر آغا نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"پاکستان میں انشائیہ نگاری ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکی ہے جب کہ بھارت میں تا حال صرف تین انشائیہ نگاروں نے اس میدان میں قدم رکھا ہے ان میں دو منجھے ہوئے ادیب ہیں یعنی احمد جمال پاشا اور رام لعل نابھوی لیکن تیسرا ایک نوجوان انشائیہ نگار محمد اسداللہ ہے۔" (پیش لفظ، بوڑھے کے رول میں: محمد اسداللہ)

احمد جمال پاشا کا نام اردو میں غیر افسانوی نثر کے حوالے سے محتاج تعارف نہیں۔احمد جمال پاشا نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا تو لوگ انگشت بدنداں ہوگئے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں 'کپور ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ' جیسا کامیاب مضمون لکھ کر لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔مگر'ادب میں مارشل لا' اور 'رستم امتحان کے میدان میں' لکھنے کے بعد ان کی ادبی حیثیت مسلم ہوگئی۔بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں احمد جمال پاشا کی تخلیقی صلاحیت اپنے شباب پر تھی۔ان کی کافی تعداد میں کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئیں۔ پاشا کے جو انشائیے ہندوستان و پاکستان کے متعدد رسائل میں شائع ہوتے رہے ان میں 'چھینکنا'، 'کچھ تنقید کے بارے میں'، 'بور'، 'ہجرت'، 'بے ترتیبی'، 'شور'، 'اصولوں کی مخالفت میں'، 'چغلی کھانا'، 'تنہائی کی حمایت میں' اور 'کچھ بلیوں کے سلسلے میں' وغیرہ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جو مضمون کے زمرے میں شامل ہیں لیکن وہ انشائیے سے قریب ہیں ان میں انشائیہ کی خصوصیات غالب ہیں۔انھیں بھی انشائیہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ان میں مونچھیں، نیا پیسہ، ٹائم ٹیبل، آنی جانی قیامت، ناپسندیدہ لوگ وغیرہ مضمون شامل ہیں۔احمد جمال پاشا کو انشائیہ کے فن میں مہارت حاصل تھی۔پاشا جب انشائیہ تخلیق کرتے تھے تو وہ کسی عام موضوع کو لے کر موضوع کا زاویہ بدل کر اس کے اندر چھپے ہوئے پہلوؤں کو اجاگر کرتے۔

رام لعل نابھوی کا نام بھی انشائیہ میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ان کے انشائیوں کا مجموعہ 'آم کے آم' منظر عام پر آیا جس میں اٹھارہ انشائیے شامل ہیں۔رام لعل موضوعات کے انتخاب میں کافی غور وفکر اور سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔انھوں نے مجرد کو جسم بنا کر پیش کیا ہے بالخصوص 'انتظار' فیشن، مسئلہ، تنہائی وغیرہ کو انھوں نے بڑے فنکارانہ انداز میں مجسم کیا ہے۔اس کے بعد جو انشائیہ نگار نمودار ہوئے ان میں سید آوارہ، اندر جیت لال، حسنین عظیم آبادی، مجتبیٰ حسین، پروفیسر خورشید جہاں، یوسف ناظم وغیرہ شامل ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں سے انشائیہ کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔موجودہ دور میں اس صنف کی آبیاری میں ادیبوں کی ایک لمبی قطار نظر آتی ہیں جن میں کچھ ادیب دو چار انشائیے لکھ کر نام کما چکے ہیں اور کچھ انشائی مجموعے شائع کر کے اس صنف میں ہندوپاک میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسداللہ موجودہ دور کے وہ انشائیہ نگار ہیں جس کے انشائیے ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں شہرت کی دہلیز پار کر چکے ہیں۔محمد اسداللہ انشائیے کے فن سے پوری طرح واقف نظر آتے ہیں۔محمد اسداللہ کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ 'بوڑھے کے رول میں 1991 میں شائع ہوا جس میں ان کے مشہور و معروف انشائیے 'انڈا'، 'نیچر کی گود میں'، 'ڈائری'، نافرمانی'، بوڑھے کے رول میں'، 'ٹائم پاس کرنا' عینک، دستخط وغیرہ شامل ہیں جو ان کے بیدار ذہنیت کا پتہ دیتے ہیں۔2015 میں ان کے انشائیوں اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ 'ڈبل رول' شائع ہوا جس میں ان کے گیارہ انشائیے شامل ہیں۔اسی سال ان کی انشائیہ پر اور ایک کتاب 'انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں' منظر عام پر آئی جس میں انھوں نے انشائیہ کو ایک منفرد صنف ادب کے طور پر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے طنزیہ ومزاحیہ مضمون اور انشائیے کے فرق کو بحسن وخوبی واضح کیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سارے ادیب ہیں جو اس صنف کی آبیاری، ترقی اور فروغ کے لیے تحریریں تخلیق کر رہے ہیں اور پہلے کے مقابلے میں موجودہ دور میں اس صنف کے تحت لکھنے والوں کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا ہے اور یہاں کے ادیب اس صنف کو پاکستان کے دوش بدوش کھڑا کرنے کی کوشش میں دل وجان سے محنت کر رہے ہیں۔آج انشائیہ موضوعاتی، فکری اور معنوی لحاظ سے وسعت پذیر ہے اور اس کی اب تک کی رفتار سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا مستقبل شاندار اور تابناک ہے۔نوجوان قلمکاروں کی رغبت اور دلچسپی اس صنف کے حوالے سے بڑھتی جارہی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ موجودہ صدی انشائیہ کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔

■

Bilal Ahmad Dar
Research Scholar, Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
(MANUU)
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob: 7006566968

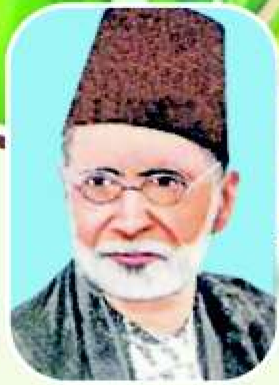

بہار میں جدید اردو مرثیہ
سمت و رفتار

محمد ارمان

مرثیہ اردو شاعری کی ایک عظیم و قدیم صنف ہے اور یقیناً جہاں اس کے اجزائے ترکیبی پر علمائے نقد و ادب نے ہمارے لیے نہایت قیمتی اور یادگار تحریریں چھوڑی ہیں، وہیں اس صنف کے منظر و پس منظر اور عہد بہ عہد ارتقا پر بھی نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، یہاں تک کہ مختلف علاقوں اور خطوں میں بھی اردو مرثیہ کے ارتقائی سفر اور اس کے متعلقہ صوبائی و دبستانی اختصاص پر تجزیاتی اظہار خیال میں کوئی کمی نہیں رکھی گئی ہے اور ان نکات کی صاف صاف نشاندہی کردی گئی ہے جن سے اس صنف کے ایسے امتیازات مبرہن ہوجاتے ہیں جو دکن، دہلی، لکھنو اور عظیم آباد کے رثائی اکتسابات کا فرق بخوبی سامنے لادیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ از روئے مقصدیت قدیم و جدید مرثیہ گوئی میں کیا بات وجہ تفاوت بنی ہے اور جدید اردو مرثیہ کی سمت و رفتار کا معاملہ کیا رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ قدیم دور میں مرثیے از راہ ثواب رونے اور رلانے کے مقصد سے لکھے گئے، جب کہ بیسویں صدی کے نصف اوّل سے مرثیہ گوئی کا مقصد حالات حاضرہ کی روشنی میں عزم و استقلال کے حصول کی نفسیاتی صورت اختیار کرگیا۔ مرثیہ کے تعلق سے انیس و دبیر کی خدمات بیشک ہمارے لیے ابدی سرمایہ افتخار ہیں، لیکن ان بزرگوں کے دور میں ہی ایک ذہنی خلش ابھرنے لگی تھی اور بہار میں اردو مرثیہ نگاری کے مایہ ناز فن کار جو اس صنف کے حوالے سے انیسویں صدی اور بیسویں صدی عیسوی کے سنگم پر کھڑے تھے، یہ محسوس کرنے لگے تھے، بلکہ اس احساس سے یک گونہ مایوس بھی ہورہے تھے کہ مرثیہ میں روایات صحیحہ کی پابندی کے ساتھ اہل بیت کے شیوۂ صبر و رضا کی عکاسی گویا نہیں ہورہی ہے۔ بہ الفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ مرثیہ میں مقصدیت کی سمت بدلنے کا احساس باقاعدہ اظہار کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔

یہاں تفصیلوں میں جانے کا موقع نہیں، لیکن اتنی بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ بہار میں ذہنی و فکری اعتبار سے جدید اردو مرثیہ کی داغ بیل اُسی دن پڑی، جس دن شاد نے اپنے مرثیہ پر مرزا دبیر کی اصلاح قبول کرنے سے معذرت کرلی اور پھر انھیں دنوں میر مونس کی معرفت وہ پیغام میر انیس تک بھی پہنچادیا گیا جس میں مولوی یحیٰ وکیل بھی شاد کے ہم خیال تھے، یا از روئے واقعہ یہ کہا جائے کہ شاد کے لیے مولوی یحیٰ وکیل ذہنی محرک بنے تھے۔

یہ 1872 کا واقعہ ہے اور اس کی تفصیل رسالہ 'ندیم' گیا کی 22 ویں جلد میں دیکھی جاسکتی ہے اور پھر جدید اردو مرثیہ کا بہار میں عملاً آغاز اس دن سے ہوا جس دن شاد نے میر انیس کے جوابی خیالات کے مدنظر اپنا دو سو بند پر مشتمل مرثیہ مکمل کرلیا۔ یہ 1884 کی بات ہے۔ گویا کم و بیش دس بارہ سال میں ایک ذہنی تحریک نے عملی صورت اختیار کی۔

میر انیس کا ارشاد یہ تھا کہ اگر صرف روایات صحیحہ اور تاریخی واقعات تک مرثیہ کو محدود کردیا جائے تو وہ موثر نہ ہوگا۔ ایسی فرمائش آسان ہے، لیکن اس طرح دس بند بھی نظم کرنا ممکن نہیں۔ میر انیس کی طرح میر خورشید علی نفیس بھی کچھ ایسا ہی سمجھتے تھے، لیکن 1889 میں جب شاد نے اپنا مذکورہ مرثیہ میر نفیس اور ان کے نواسے میر عارف کو سنایا تو انھیں شاد کی صلاحیت اور نظریاتی صلابت کا قائل ہونا پڑا اور شاد کی عملی کاوش پر یک گونہ مہر پزیرائی ثبت ہوئی۔ آیئے آگے بڑھنے سے پہلے شاد کے اس مرثیہ کا دو بند دیکھتے چلیں۔

بچوں کو تین دن سے تھی جو انتہا کی پیاس
بیٹھے ہوئے تھے ماؤں کے پہلو میں سب اداس
بازار موت گرم تھا، اور سب کے دل اداس
لیکن یہ کیا مجال کہ ظاہر کریں ہراس
رونے کو اضطراب کو ٹالے ہوئے تھے وہ
سیدانیوں کی گود کے پالے ہوئے تھے وہ

بس روک لو قلم نہ لکھو عامیانہ بین
کچھ کم ہے یہ کہ ذبح ہوئے شاہ مشرقین
اس بین سے نہ صبر میں آجائے فرق بین
کافی ہے بس یہ بیت پئے ماتم حسین
چوں خلق ز حلق تشنہ او بر زمیں رسید
طوفاں بر آسماں ز غبارش ہمیں رسید

ظاہر ہے کہ یہاں پہلے بند میں اہل بیت کا، بلکہ یوں کہا جائے کہ کم سن بچوں کا مثالی ثبات و قرار دکھایا گیا ہے جو بہ آسانی یہ بتادیتا ہے کہ جب ان نونہالوں کا صبر و ضبط اس درجہ پر تھا تو ان کے بڑوں کی سنجیدگی و شکیبائی کا عالم کیا ہوگا اور پھر دوسرے بند میں شاد نے اپنا نظریہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ قدما کا خیال یہی تھا کہ محض تا حد فصاحت و صداقت، مبالغہ آرائی کے بغیر اور بلاغت سے عدم احتراز کی صورت میں اثر آفرینی ممکن نہیں، لیکن شاد کے مذکورہ بند اس خیال کو، محض ایک مفروضہ ثابت کردینے میں یقیناً کامیاب ہیں۔ شاد کے پیغام 'بس روک لو نہ لکھو عامیانہ بین' سے بہار میں جدید اردو مرثیہ کی عملاً ابتدائی صورت سامنے آتی ہے۔ یہ اصل میں بیان مصائب میں تکرار اور آہ و بکا میں غلو کو بیان سیرت میں استحکام اور ضبط اظہار میں کمال استواری سے بدل دینے کا عمل ہے اور اس رُخ سے دیکھیں تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ سفارش حسین رضوی نے یہ غلط نہیں لکھا ہے کہ:

''مرثیہ گوئی میں شاد کو اپنے دور کا انیس کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مرثیہ کے قلب میں نئی روح پھونکی، نیا انداز بیان عطا کیا۔'' (اردو مرثیہ، 1965، ص 399)

بلاشبہ شاد نے مرثیہ نگاری کے آئین و اصول اور اس کے فن کی طرف جس طرح توجہ دلائی ہے، وہ تاریخ ارتقا کے اعتبار سے بہار میں جدید اردو مرثیہ کے اقدار عالیہ کی تعیین روشن ہوجاتی ہے۔

ہو جس میں ابتذال وہ مضموں نہ باندھنا
ہو پست و پائمال وہ مضموں نہ باندھنا
عقلاً ہو جو محال وہ مضموں نہ باندھنا
ہو جس پہ قیل و قال وہ مضموں نہ باندھنا
باتیں وہ کیا کہ جان سخن جن میں کچھ نہ ہو
مضموں کی جس میں ڈھانچ ہو باطن میں کچھ نہ ہو

داخل مبالغہ بھی محاسن میں ہے مگر
اتنا نہ ہو کہ نفس مطالب کا ہو ضرر
باتیں وہ ہوں پسند جن کو کریں ذی ہنر
آنکھوں کے آگے عین صداقت ہو جلوہ گر
اظہار مدعا میں کسی جا خلل نہ ہو
مطلب وہ کیا کہ جس کا کوئی ماحصل نہ ہو

حضرت شاد کا واقعی یہ تاریخی احسان ہے کہ جس طرح ان کی کاوشوں سے غزل میں دبستان دہلی اور لکھنو کی خلیج پاٹ دی گئی، اسی طرح ان کی فکر اور ان کی مرثیہ گوئی کی بدولت اردو مرثیہ میں اور خصوصاً بہار کے حوالے سے اردو مرثیہ میں اصلاح فکر وفن کی نئی راہ متعارف ہوئی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شاد مرثیہ میں بین کے نہیں بلکہ 'عامیانہ بین' کے مخالف ہیں اور ان کے نزدیک تبلیغ ناروا نہیں بلکہ غلو اور اغراق داخل معائب ہے۔

شاد نے ہمیں یہ شعور بخشا کہ مرثیہ میں مبالغہ 'اتنا نہ ہو کہ نفس مطالب کا ہو ضرر' اور کہنا چاہیے کہ یہیں سے مرثیہ نگاری کو جدید انقلابی ذہن ملا اور اس کی نئی سمت نے تعین پایا۔ شاد کے معاصرین میں صفیر، فضل حق آزاد، میر فدا حسین بحر، بہار حسین آبادی، سید علی اکبر کاظم عظیم آبادی اور منظر عظیمی جیسے مرثیہ نگاران بہار کا نام آتا ہے اور ذرا تکلف سے سہی، مگر یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ شاد کی انقلابی فکر کا اثر کسی نہ کسی طرح ان شعرا نے بھی قبول کیا ہے اور چونکہ ان میں سے بعض سرحد پار بھی چلے گئے، اس لیے ان اثرات کا دائرہ علاقائی تاریخ مراثی کے لحاظ سے مزید وسیع بھی ہوا ہے۔ مثال کے لیے علی اکبر کاظم کا مرثیہ بہ عنوان 'پالی کا علم' پیش کیا جاسکتا ہے، جس میں علی نگر پالی کے امام بارگاہ میں علم محترم کے نصب کیے جانے اور اس تعلق سے ہونے والے مناقشاتی واقعات کی پوری تاریخ بیان کردی گئی ہے۔ مرثیہ میں علاقائی تاریخی واقعات کی شمولیت یقیناً ایک ایسی بات ہے جو جدید رجحان کا پتہ دیتی ہے۔

شاد مرثیہ نگاری کے باب میں نری روایت پرستی اور روایت پسندی پر اپنی سنجیدہ و شدید ضرب لگا چکے تھے اور کامیابی ان سے قریب ہونے لگی تھی، یہاں تک کہ بیسویں صدی کا وسطی زمانہ آتے آتے، قدرت نے اردو مراثی کو جوش ملیح آبادی اور آل رضا کے ساتھ ساتھ بہار کے جمیل مظہری جیسے فن کار سے بھی نواز دیا جن کی بدولت یہاں جدید مرثیہ کا منظر نامہ پوری طرح روشن ہوگیا۔ جہاں تک علامہ جمیل مظہری کا تعلق ہے، یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ بہار کے حوالے سے اگر شاد جدید اردو مرثیے کے موسس ہیں تو علامہ جمیل مظہری، اسے بہمہ طور آگے بڑھانے والے سب سے کامیاب اور بزرگ فن کار کا درجہ رکھتے ہیں، جنھوں نے اردو مرثیہ سے قومی اصلاح اور بیداری کا کام لیا۔

شاد کی مساعی سے مرثیہ اس سمت پر آچکا تھا اور آگے بڑھنے لگا تھا کہ "باتیں وہ ہوں پسند جن کو کریں باہنر" اور جمیل مظہری نے اسے مزید اس سمت سے بھی قریب کردیا کہ باتیں وہ ہوں، پسند جن کو کریں ذی نظر "یعنی تقاضائے وقت کے بموجب مرثیہ صرف مذہبی نہ ہو ملی بھی ہو اور تشکیک وجمود کی فضا میں کربلا کا پیغام عزم و یقین اور ایثار و ثبات عام لوگوں تک پہنچتا رہے اور یہ دیکھا اور دکھایا جائے کہ امام عالی مقام صرف روحانیت کے پیکر ہی نہیں انسانیت کاملہ کے نمونہ بھی ہیں۔

شاد کی مرثیہ نگاری کا عہد 1924 میں تمام ہوتا ہے اور اس کے محض چھ سال بعد 1930 میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سے متاثر ہوکر جمیل مظہری کا مرثیہ 'عرفان عشق' سامنے آتا ہے جس میں بقول خویش انھوں نے باقاعدہ طور پر مرثیہ کا رشتہ قومی شعور سے جوڑا ہے۔ آیئے آگے بڑھنے سے پہلے اس مرثیہ کے فلسفہ بداماں پیامی بند دیکھتے چلیں۔

نبض جاں تیز رہے مقصد فطرت ہے یہی
دل دھڑکتے رہیں سینوں میں محبت ہے یہی
آدمی غم سے نہ گھبرائے شجاعت ہے یہی
دل پہ قابو رہے، شرط بشریت ہے یہی
نشہ ہو بیخودی شوق میں ہشیاری کا
زندگی نام ہے، جذبات کی بیداری کا
صبح منزل کی تمنا ہے سر شام عمل
کس قدر گرم تخیل ہے سبک گام عمل
اے خوشا بیخودی نشہ خود کام عمل
غور کیجیے تو شکستیں بھی ہیں پیغام عمل
وہ شکستیں جو نتائج کو اثر خیز کریں
عشق شوریدہ طبیعت کا جنوں تیز کریں

بعد ازیں 1935 میں جمیل مظہری کا مرثیہ 'پیمان وفا' اُس وقت سامنے آتا ہے جب ماہ عزا کا احترام بالائے طاق رکھتے ہوئے، فرنگی حکمرانوں نے جارج پنجم کی جوبلی کے موقع پر امام بارگاہ میں چراغاں کا حکم دیا تھا۔ اس مرثیہ میں ابن زیاد کی حامیان حسین کو دھمکیوں کے تاریخی پس منظر سے خصوصی غذا لی گئی ہے اور وسیع تر شعور و آگہی کے ساتھ سیاسی بصیرت یوں جلوہ گر ہوتی چلی گئی ہے کہ صبر و استقامت کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ برجستہ للکار کی ایک عجیب سی فضا چھا جاتی ہے جو یقیناً غیرت وحمیت کو تازیانے لگانے کے لیے کافی ہے۔

کہیں زنجیروں کی دھمکی تھی، کہیں بارش زر
کام کرنے لگا ہر سمت حکومت کا اثر
سن کے یہ غل کہ چلا آتا ہے شاہی لشکر
عورتیں لے گئیں مردوں کو قسم دے دے کر
یوں ہی ایماں کی طرف خوف کمیں ہوتا ہے
دل میں راسخ ہو غلامی تو یوں ہی ہوتا ہے
آج بھی جب کہ ہے ماضی سے کہیں بہتر حال
حاکم شہر کے بگڑے ہوئے تیور کا خیال
کتنے ایمانوں کو کرسکتا ہے دم بھر میں نڈھال
جوبلی ماہ عزا میں ہوئی خود اس کی مثال
کیوں، جہاں ہو علم شاہ شہیداں اے قوم
جوبلی میں اسی پھاٹک پہ چراغاں اے قوم

اتنا ہی نہیں بلکہ اس مرثیہ میں جمیل مظہری نے حضرت زینب کا کردار بھی جس رُخ سے دکھایا ہے، وہ نہایت ہی اہم ہے۔ جسے ہم بلاشبہ ہمت وولولہ کا اشاریہ کہہ سکتے ہیں۔

یہ چاہتی ہوں حق کا علم سرنگوں نہ ہو
بھائی کا خون ہو پہ صداقت کا خوں نہ ہو
چرچا ثبات و عزم کا نزدیک و دور ہو
ہے فیصلہ مرا کہ لڑائی ضرور ہو
حاضر رسن کے واسطے میرا گلا بھی ہے
پرچم کا کام دے تو یہ کہنہ ردا بھی ہے

جدید اردو مرثیے کو سمت و رفتار عطا کرنے میں یقیناً جمیل مظہری کا حصہ ناقابل فراموش ہے کہ انھوں نے مرثیہ کو بخوبی تمام تاریخ امروزہ سے پیام تہور کے ساتھ جوڑ دیا ہے اور اس طرح گویا ایک بڑا ملی تقاضا پورا کیا ہے۔

بہار کے شعرائے مراثی میں بدر عظیم آبادی، تھونی لال وحشی، احسن رضوی، ہوش عظیم آبادی، دانش عظیم آبادی، زار عظیم آبادی، مرتضی اظہر رضوی، شہزاد معصومی، نقی احمد ارشاد، صابر آروی اور فردوس عظیم آبادی کے نام بلاتکلف لیے جاسکتے ہیں، ان میں بدر عظیم آباد اور تھونی لال وحشی ہمارے وہ مرثیہ گو ہیں جنھوں نے جمیل مظہری کے اثرات بہت قریب سے قبول کیے ہیں اور یقیناً ان شعرا کی روایتوں کے بہترین اثرات آج اکیسویں صدی میں بھی ہمیں بخوبی تمام نواز رہے ہیں۔

■

Dr. Md. Arman
Kashinath Colony, Katari Hill Road
Opposite Ghanta Kothi
Gaya-823001 (Bihar)
Mob:9931441623

عاقل زیاد

موجودہ نسل اور اردو تحقیق و تنقید کا معیار

اردو تحقیق و تنقید کے معیار پر جب بھی سوال اٹھتا ہے تو کتنے ہی دانشور اور اہل نظر اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ محققین و ناقدین کی سہل پسندی نے ادب کے معیار کو مجروح کیا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آج تحقیقی عمل سست ہے اور تنقید عروج پر ہے، آخر کیوں؟ نظم کہنے والے عنقا ہو رہے ہیں اور غزلیہ شاعری پر بہار ہے۔ ایسے میں یہ سوال اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کے سامنے حل طلب ہے کہ اردو کی ترقی و ترویج آخر کس طرح ممکن ہے؟ اس مسئلے پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ جب بھی اجتماعی سطح پر اردو کی بات چلی تو محسوس ہوا کہ ملک میں کشمیر سے کنیا کماری تک اردو ہی سب سے عزیز ترین زبان ہے۔ لیکن جب سنجیدگی سے بات کی جاتی ہے تو دانشور حضرات دانتوں تلے انگلیاں دبا لیتے ہیں اور باشعور افراد زبان کی زبوں حالی پر ایک سرد سانس لے کر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ تازہ سروے پر اگر نگاہ ڈالیں تو اردو کی ریڈرشپ کا گراف گزشتہ دہائیوں کے مقابلے بہت نیچے پہنچ گیا ہے۔ ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد میں حیرت ناک حد تک کمی آئی ہے۔

پھر بھی عصر حاضر کے نامور ناقدین اور محققین کے بیسیوں مضامین ملک کے مختلف اخبار و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف عنوانات کے تحت روز نت نئے مضامین قارئین کے سامنے آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مضامین بہت عمدہ اور محنت سے لکھے گئے ہوتے ہیں اور ایک سچ یہ بھی ہے کہ ہمارے بیشتر مضمون نگاروں یا مقالہ نویسوں کی ایسی ایک لابی ہے جو ہر آن ایک دوسرے کی پذیرائی سے ذاتی تسکین میں اپنی توانائی صرف کرنے میں مصروف ہے، لیکن حقیقت میں ان کی تصانیف یا ان کی تخلیقات کو واقعی اردو ادب میں کسی قدر اضافہ تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ دعوے کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ معاصر نثار یا مقالہ نگاروں کی ایک بڑی جماعت ہے جن کی تصانیف بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر سچائی سے دیکھا جائے تو ایسے لکھاڑیوں سے اردو زبان کا کتنا بھلا ہو رہا ہے۔ اس معاملہ میں نثری تخلیقات ہوں یا شعری بہر حال سنجیدہ طبقے میں ایک قسم کی بیزاری دیکھی جا رہی ہے۔ نثری تخلیقات کے مقابلے شاعری پر زور آزمائی دیکھ کر تو طبیعت اور بھی مکدر ہونے لگتی ہے۔

ایک المیہ یہ بھی ہے کہ موجودہ دور میں کالجوں یا یونیورسٹیوں کے ذہین طلبا بھی اردو پڑھنے سے کتراتے ہیں، کیونکہ سنجیدہ حلقہ میں اب اکیڈمک ایجوکیشن کے رجحانات کم ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اردو کے حوالے سے جب دیکھتے ہیں تو اس حقیقت سے فرار مشکل ہو جاتا ہے کہ جہاں نئی نسل اردو سے بھاگ رہی ہے وہیں ہمارے دانشور بھی اپنی ذمہ داریوں سے بھاگ رہے ہیں۔ ان میں ایمانداری اور دیانتداری کا حد درجہ فقدان ہے جس کی وجہ سے اردو زبان و ادب مسلسل تنزلی کا شکار ہے۔ دوسری جانب سہولت یافتہ گھرانوں کے ذہین طلبا مختلف جامعات میں اردو، عربی یا فارسی شعبوں میں جانے کے بجائے انگریزی، معاشیات، سماجیات یا اسی طرح دوسرے مضامین میں ہی دلچسپی لیتے ہیں، جبکہ زیادہ تر معاشی سطح پر عام طور سے کمزور طلبا ہی اردو سے شغف رکھتے ہیں۔ حیرت ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں ایسے طلبا کو بھی کئی طرح کی دشواریوں کا سامنا ہے۔ بڑی اور مایہ ناز یونیورسٹیوں کی بات کریں تو آج اردو میں پوسٹ گریجویٹ میں داخلہ لینا عام طلبا کے لیے بہت سہل نہیں ہے۔ طرہ یہ کہ یو جی سی یا دیگر ذرائع سے ملنے والی سہولتیں یونیورسٹی کے دوسرے شعبہ جات کے مقابلے اردو پڑھنے والوں کو بہ مشکل دستیاب ہیں۔ اردو اساتذہ کو بھی دیکھیں تو ہر یونیورسٹی میں گروہ بندی ہے اور طلبا ان اساتذہ کے چکر میں ذہنی کشاکش میں مبتلا رہتے ہیں۔ ساتھ ہی ملک کی مختلف جامعات میں اردو، عربی یا فارسی پڑھنے والے طلبا میں اکثر احساس کمتری ہے۔ ایسے میں اس بات کا بھی ملال ہے کہ جس نے اردو پڑھی، روٹی دال سے ذرا فرصت ملی تو شعر و شاعری کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ گویا شعر گوئی ہی اردو کی اصل معراج ہے، حالانکہ سچائی تو یہ ہے کہ ایسے طلبا کو عروض و بلاغت تک کا علم نہیں ہوتا۔ تخلیقی ادب کی تو جیسے لٹیا ہی ڈوب رہی ہے۔ افسانہ نویسی کی

صف میں بیسیوں نام ہیں لیکن ان میں دو چار ہی ہیں جنھیں بمشکل جینوئن تخلیق کار کہا جا سکتا ہے۔ ناول کا دور یوں بھی ختم ہونے کے درپے ہے۔ کیوں ہے، یہ ایک لمبی بحث ہے۔ اس میں ٹی وی چینلوں یا موبائل اور انٹرنیٹ سروسز کو الزام دینا گویا حقیقت سے فرار پانے کا عمل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ویسے ناول ہی نہیں لکھے جا رہے کہ جن سے کسی نظریاتی استدلال کو استحکام ملے۔

ایسے میں سوال ہے کہ اردو کی ترقی یا یوں کہیں کسی زبان کی ترقی کیوں کر ممکن ہے۔ ظاہر ہے، جس زبان میں عوام کی دلچسپی زیادہ ہوگی یا جس کے قارئین زیادہ ہوں گے اسی زبان کو ترقی یافتہ کہہ سکتے ہیں، مگر اردو کے حوالے سے کوئی بھی جواب دینے سے پہلے اسے کئی زاویوں سے دیکھنا پڑے گا۔ یہاں قاری اور قلم کار کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ قلمکار ہی قاری ہے اور قاری ہی قلمکار ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ اردو زبان وادب کا فروغ ایسے میں ایک خواب کی طرح ہی لگتا ہے۔ ہمارے اسلاف نے اردو کے لیے جو کچھ کیا آج ہم اسی دیرینہ اثاثہ سے استفادہ کرنے میں مشغول ہیں۔ تجزیاتی نظریے سے دیکھیں تو گذشتہ دہائی سے لے کر تا حال کوئی بھی قابل ذکر تخلیق سامنے نہیں آئی اور نا ہی ہمارے قدیم اثاثے میں کوئی قابل قدر اضافہ ہی درج ہوا۔ شعری مجموعے اور نثری نگارشات پر مبنی کتابیں آئے دن شائع ہوتی ہیں مگر انھیں دیکھ کر اردو کی زوال پذیری بخوبی سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ فن ترجمہ نگاری وقت پارینہ کا حصہ بن گیا ہے اور اس طرف سے بھی مایوسی ہی ہاتھ لگتی ہے۔ نئی تصانیف میں کاپی پیسٹ کے بڑھتے رجحانات نے ایک طرف تخلیقیت کا بیڑا ڈبو یا ہے تو دوسری طرف تحقیق وتنقید کے معیار کو بھی غارت کیا ہے۔ حالانکہ ہمارے دانشور حضرات بہتر طور پر سب کچھ جانتے سمجھتے ہیں، پھر بھی ایک دوسرے کی پذیرائی میں آسمان وزمین کے قلابے ملانے میں لگے ہیں۔

یہاں سوال یہ بھی ہے کہ عوامی سطح پر اردو زبان کتنی موثر ہے۔ اسے ایک الگ مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ میرے خیال سے اردو میں شائع ہونے والے اخبارات ورسائل پر غور کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ایک ریاست یا شہر سے نکلنے والے جتنے اخبارات منظر عام پر ہیں ان سے کئی گنا زیادہ اخبارات حکومت کے دفاتر میں رجسٹرڈ ہیں جو کبھی دیکھے ہی نہیں گئے۔ اس طرح اردو زبان کو نقصان پہنچانے میں ان اخباروں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ بعض دانشوروں کا نظریہ ہے کہ اردو میڈیا اس قدر کمزور ہے کہ وہ دوسری میڈیا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں یہ بھی قابل غور ہے کہ جس زبان کی صحافتی خدمات میں اپنی ایک عہد ساز تاریخ رہی ہے، آج اسی زبان میں جرنلزم مشکوک ہے۔ ظاہر ہے اس کے اسباب پر غور کریں تو پائیں گے کہ آج ایک اردو اخبار اپنے قاری کو ہی اطمینان دلانے میں لگا ہوا ہے۔ یعنی قاری کیا چاہتا ہے، اسے اس فکر سے نجات ہی نہیں ملتی۔ اس کے برعکس انگریزی، ہندی یا دوسرے اخبارات اپنے مزاج ومقاصد کے حصول پر کاربند نظر آتے ہیں۔ چاہے زبان کی سطح پر ہو یا مذہبی یا نظریاتی سطح پر، لیکن اردو کے قاری کو مسجد، قبرستان اور قیامت کے موضوعات سے الگ فکر وفلسفہ میں جھانکنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں ہمارے کچھ دانشور حضرات مغربی میڈیا اور سرمایہ دارانہ نظام کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں، ممکن ہے اس میں بھی کوئی صداقت چھپی ہو جو اردو دانشوروں کے آگے سب سے بڑا چیلنج ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی سوال اہم ہے کہ میڈیا پر مغرب کی اجارہ داری آخر کیوں کر ختم ہوگی اور اس کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کرنا ہوگی؟ ظاہر ہے، علمیت کے اظہار کے لیے پبلسٹی نہیں، بلکہ نظریاتی اظہار میں علمیت کا مظاہرہ ضروری ہے۔ اس کے لیے جہاں مطبوعات کو معیاری بنانے کی ضرورت ہے وہیں اخباروں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے قارئین کو باذوق بنانے میں معاون رول ادا کرے۔

تنقیدی سرمائے پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ جلد سے جلد پروفیسری کے حصول کے لیے کم از کم ایک دو تصانیف کی لازمیت نے تنقید کو تقلید اور اردو میں نقل نویسی کو فروغ دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ غنیمت ہے کہ موضوعات کی تنگی نے نظیر واکبر جیسے شاعروں کو ادب کے معماروں میں شامل کر لیا اور انشائیہ جیسے لائٹ ایسے کو قبولیت مل گئی۔ اس سے الگ آج جس طرح ماہر غالبیات، اقبالیات ومیریات کی ہوا چلی ہے، تقریباً ہر دوسری یونیورسٹی میں کم سے کم ایسے ماہرین مل ہی جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں حالی وشبلی کے نظریات میں تضاد ڈھونڈنے یا میر وغالب اور اقبال شناسی میں نت نئے نکتے تلاش کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ کوئی شاہکار تخلیق وضع کی جائے، لیکن سوال ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے نہ صرف مشاہدات ومکاشفات، بلکہ گہرے مطالعے کی بھی ضرورت ہے اور ان سب چیزوں کے لیے ایک مدت بھی درکار ہوگی۔ میڈیا پر سرمایہ داری کے غلبے کا انٹرنیٹ کی مدد سے کس طرح دفع کیا جا سکتا ہے، اس نکتے پر بھی سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ یقیناً اس کام میں فکری وسعت اور پوٹینشلیٹی کی ضرورت ہے۔ اردو زبان کی خستہ حالی پر توجہ دیں تو اردو میں موضوعاتی یا نظریاتی تصور کو استحکام دینا نسبتاً زیادہ اہم ہے، تاکہ اردو میں نظریاتی ڈھانچے کو فروغ حاصل ہو۔ ہمارے دانشوروں کو اس کے لیے تنظیمی طریقہ کار پر سوچنا ہوگا۔ فن ترجمہ نگاری کو پھر سے زندہ کرنا ہوگا۔ آج اردو کے تمام شعبہ جات تقریباً بند ہوتے جا رہے ہیں، اور اگر زندہ ہے تو وہ ادب اور صرف ادب۔ وہ بھی اس درجہ قابل رحم کہ غیر اردو داں طبقہ کی اس جانب کبھی توجہ ہی نہیں جاتی۔

صورتحال یہ ہے کہ شعر وادب سے الگ دیگر مضامین کے حوالے سے اردو اپنی پہچان کھوتی جا رہی ہے۔ میرا خیال ہے ہر سنجیدہ قاری آج اس کمی کو شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ ایسے میں لازمی طور پر اردو تحقیق وتنقید کے شعبے میں بہتری کے لیے موجودہ دانشوروں کو گروپ ازم سے اوپر اٹھ کر کام کرنا ہوگا۔ ساتھ ہی متعدد جامعات میں زیر تعلیم اردو ریسرچ اسکالروں کو بھی ان کے کام اور اس کی اہمیت سے متعلق احساس دلانا ہوگا، تاکہ تحقیق ہو یا تنقید، ہر صورت میں اس کے اصول وضوابط کا پاس ولحاظ رکھا جائے۔ مضامین کا انتخاب بہت چھان پھٹک کر کیا جائے اور مقالے کی تکمیل میں سو فیصد پرفیکشن لائی جائے۔ ظاہر ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب اساتذہ اس تاریخ ساز کارنامہ کو انجام دینے میں دلچسپی لیں گے۔ اس کے برعکس آج ہو یہ رہا ہے کہ تحقیق کے لیے موضوعات کے انتخاب میں مواد کی فراہمی کی سہولت پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندہ لوگوں کی خدمات پر عنوانات تفویض کیے جاتے ہیں اور تنقید کی تنقید لکھی جا رہی ہے۔ اردو تحقیق وتنقید کے معیار میں تنزلی اس لیے بھی دیکھی جا رہی ہے کہ تحقیق کے نام پر تذکرہ اور تنقید کے نام پر تنقیص پیش کر کے ہمارے دانشور کریڈٹ لینے میں سرگرم ہیں۔ کوئی نام لیے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تصانیف کے انبار دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نئی نسل کچھ امید افزا کارنامہ انجام دینے پر آمادہ ہے، مگر جب ان کی کاوشوں پر نگاہ جاتی ہے تو زبان سے محض کلمہ تاسف ہی نکلتا ہے۔ ان سے قطع نظر مایوسی کفر ہے کہ ہماری تازہ کار نسل ہمہ وقت کچھ بہتر کرنے کی طرف گامزن ہے۔ ضرورت ہے اس کی ذہانت کو نئے آفاق دینے اور اس کی بہتر طور پر راہنمائی کرنے کی کہ اسی سے زبان وقوم کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔

■

Aquil Ziad
B-176, Pkt-1, Mayur Vihar -1
Delhi - 110091

تسنیم بانو

مولانا الطاف حسین حالی کی تحریروں میں تانیثیت کے آثار

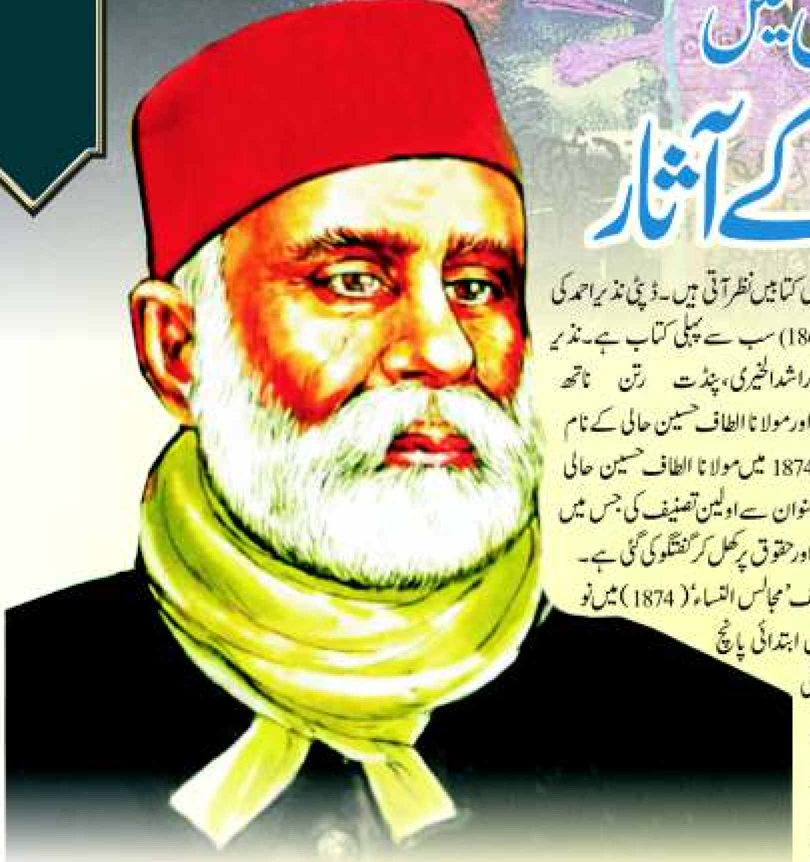

تانیثیت ایک فلسفہ حیات اور انداز فکر کا نام ہے۔ یہ ایک سماجی تحریک ہے جو عورتوں کے مساوی حقوق کی حصول یابی کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اس تحریک کے افکار و نظریات زمانہ، ماحول، جگہ اور معاشرے کے اعتبار سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اردو زبان میں اس کے لیے تحریک نسواں، آزادی نسواں، نسائی تحریک اور تانیثی تحریک جیسے الفاظ مروج ہیں لیکن جدید دور میں اس کے لیے لفظ 'تانیثیت' اصطلاح کے طور پر رائج ہو گیا ہے۔ اردو زبان میں تانیثیت سے متعلق جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ابتدائی نقوش انیسویں صدی کے ربع آخر میں نظر آتے ہیں ابتدا میں ہی خواتین کے سماجی، سیاسی، اقتصادی مسائل کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اردو ادب میں سماجی مسائل کی عکاسی دراصل معاشرتی مسائل کی ہی پروردہ ہے۔ اردو میں اس سے متعلق مقالے، مضامین، فکشن اور متعدد نثری کتابیں نظر آتی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کی 'مراۃ العروس' (1869) سب سے پہلی کتاب ہے۔ نذیر احمد کے بعد راشدالخیری، پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور مولانا الطاف حسین حالی کے نام سرفہرست ہیں۔ 1874 میں مولانا الطاف حسین حالی نے 'مجالس النساء' عنوان سے اولین تصنیف کی جس میں خواتین کے مسائل اور حقوق پر کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔

حالی کی تصنیف 'مجالس النساء' (1874) میں نو مجلس ہیں جس میں ابتدائی پانچ مجلس میں لڑکیوں کی اصلاح، گھر داری اور تعلیم نسواں اور مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ چھٹے سے لے کر نویں مجالس میں لڑکوں کی پرورش و تربیت کا ذکر ہے۔ (اس کے کردار آتو جی، محمودہ بیگم، مریم زمانی، زبیدہ خاتون، سید عباس، خواجہ کمیل، خواجہ فضیل، خواجہ ہذیل، غلام امام اور اسلام بیگ وغیرہ نام کے ہیں) اس میں حالی نے بیٹے اور بیٹیوں کی تعلیم و تربیت اور پرورش کو بہتر طریقے پر دینے پر زور دیا ہے۔ اس کتاب کو عورتوں کے مسائل، حقوق اور تعلیم نسواں کی حیثیت سے اولین نثری کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں خواتین کی بھرپور حمایت و کالت کی گئی ہے۔ اس میں حالی معاشرے سے سوال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ لڑکیوں کو علم کی دولت سے محروم کیوں رکھا گیا؟ ان کو بیٹوں کے برابر کیوں نہ عزیز سمجھا گیا؟ ان کو دین کا راستہ کیوں نہ بتایا؟ ان کو دنیا کی تمام برائی بھلائی سے کیوں نہ خبردار کیا ؟۔ اس میں سماجی اور معاشرتی حالات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس میں حالی نے ملک میں رائج تعلیمی تفریق کو پیش کیا ہے کہ ہندوستان کے وہ ہندو مسلمان جنھیں سماج میں اشراف کا درجہ حاصل ہے ان کے یہاں قدیم سے یہ دستور جاری ہے کہ بیٹی کو پڑھائیں یا نہ پڑھائیں لیکن بیٹوں کو تعلیم ضرور دلواتے ہیں خواہ غریب ہو یا امیر ہر شخص اپنی بساط کے موافق تعلیم حاصل کراتے ہیں۔ تفریق کے برے نتائج کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ نتائج کا ذکر آتو جی کی زبان سے یوں کراتے ہیں: ''خدا کو یہ بات نہ پسند آئی، اس نے بیٹوں کو بیٹیوں سے بھی بدتر کر دیا۔ وہ تو عورت ہو کے اَن پڑھ رہی تھیں، یہ مرد ہو کے جاہل رہے۔''[1] اس خیال کو بھی بیان کیا ہے جو لوگ صرف لڑکوں کی کمائی پر حق سمجھتے ہیں اور لڑکیوں کی کمائی سے کچھ

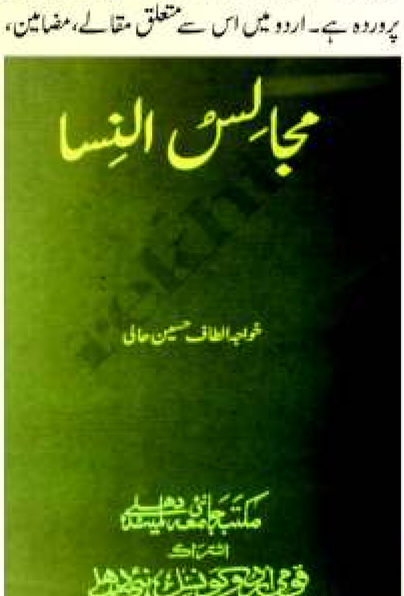

لینا بھی گوارا نہیں کرتے ہیں۔لیکن ان خیالات میں موجودہ عہد میں تبدیلی آئی ہے۔لڑکی کی پرورش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آتو جی کی زبان سے یوں ادا کیا ہے:

''ماں باپ کے گھر کتے بلی کی طرح پرورش پائیں اور خاوند کے یہاں جا کر لونڈیوں کی طرح اپنے دن پورے کریں۔جیسی بے خبر اور انجان دنیا میں آئی ہیں ویسی ہی بے خبر اور انجان سے چلی جائیں۔نہ خدا کو پہچانیں نہ اپنی حقیقت کو سمجھیں،نہ دنیا میں آنے کا کچھ پھل پائیں۔بلکہ ہم نے ان کو اس لیے پیدا کیا تھا کہ وہ بھی مردوں کی طرح اپنی عقل سے کچھ کام لیں،اور اپنی آدمیت سے کچھ فائدہ اٹھائیں۔اپنی برائی بھلائی کو سمجھیں.... افسوس کہ انھوں نے دنیا کے سارے حق ادا کیے پر دنیا نے ان کا کوئی حق ادا نہ کیا۔''[2]

حالی کے دل میں عورتوں کا بڑا احترام تھا۔اور ان کی تعلیم وتربیت اور بھلائی کی گھری فکر تھی۔اور اس کا بڑا دکھ تھا کہ عورت کو مردوں نے علم کی روشنی سے محروم رکھا ہے۔ اس احساس کی پہلی جھلک مجالس النسا میں نظر آتی ہے۔ بعد میں یہی درد چپ کی داد میں ڈھل کر سامنے آیا۔

اس میں انھوں نے لڑکیوں کی پیدائش سے لے کر ضعیفی تک کے مسائل،حق تلفی اور معاشرتی زیادتیوں کا ذکر کیا ہے۔نیز اس میں بعض جگہ شدت بھی اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''پکانا ریندھنا ان کو اس لیے سکھایا کہ ماما رکھنے کی ضرورت نہ ہو سینا پرونا ان کو اس لیے بتایا کہ درزی مغلانی کو سلائی نہ پڑے.... جہیز میں جو کچھ دیا وہ دنیا کے دکھاوے کو دیا۔ایک پڑھنا لکھنا ایسی چیز تھی جو دنیا اور آخرت میں ان کے کام آتا،سو ماں باپ نے اس کی ہوا تک نہ لگنے دی اور یہ سمجھا کہ اول تو ان کے پڑھانے لکھانے سے ہم کو کچھ فائدہ نہیں،دوسرے یہ پڑھنے لکھنے میں رہیں گی تو گھر کے کام دھندے کون کرے گا؟''[3]

تانیثیت کے علمبردار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ خواتین گھر کا 24 گھنٹے سارا کام مفت میں کرتی ہیں ان کو ان کی اجرت ملنی چاہیے۔ان افکار کی ترجمانی ہمیں حالی کی اس تحریر میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔لڑکیوں اور عورتوں پر متعدد پابندیاں رائج ہیں جس میں کھانے پینے،اٹھنے بیٹھنے،چلنے پھرنے،چلّانے،دوڑنے،آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے،قہقہ مار کر ہنسنے اور کھلا سر ہونے پر ہمہ وقت پابندیاں عائد ہوتی رہتی۔اس کے علاوہ انھیں گھریلو تعلیم سے آراستہ کرنے کے طور طریقوں کا واضح طور پر ذکر ملتا ہے۔

معاشرے کے حالات کو اجاگر کیا ہے جس میں یہاں کے رسم ورواج جو عورتوں کے لیے توہم اور فرسودہ ہیں جو دین ومذہب سے الگ ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر بچیوں کے پیدا ہوتے ہی زمین دوز کرنا،عورتوں کو ان کے مردہ شوہر کے ساتھ ستی کرنا وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔معاشرے میں کسی بھی کام اور اس کے طور طریقے کو مذہب کے پیش نظر عمل میں لایا جاتا ہے۔لیکن خواتین سے متعلق رسم وراج اور حق دین سے جدا کیوں کر ہوتے ہیں اس پر سوال کرتے ہوئے مجالس النساء میں لکھتے ہیں:

''کیا عورتوں کا مذہب دُور پار سب سے جدا ہے۔''[4]

خواتین کی زندگی سے توہم پرست خیالات اور ہزاروں خرافات معاشرے نے وابستہ کر دیے ہیں۔حالی ان رسومات کی مخالفت کرتے ہیں۔

اس وقت کی عورتوں خاص کر نواب زادیوں کا حال مجالس النساء کی تیسری مجلس میں حالی زبیدہ خاتون کی زبان سے ادا کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جن امیر زادیوں کے سامنے دس دس نوکریں کام کرنے ہر وقت موجود رہتی تھیں وہ آپ برقعہ اوڑھے گلی گلی ماما گیری کی نوکریاں ڈھونڈھتی پھرتی تھیں اور کوئی نہ پوچھتا تھا اور جو کلے کی مزدوری کر کے کھاتی تھیں ان کو خدا نے اس وقت بھی سب کچھ دے رکھا تھا۔اور بٹو! یہ بڑی بے وقوفی کی بات ہے کہ مردوں کی کمائی کے بھروسے پر آپ ہنر پیشہ کچھ نہ سیکھیں۔''[5]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی خواتین کے روزگار پیشہ ہونے کی حمایت بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یہ جملہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ 'یہ بڑی بے وقوفی کی بات ہے کہ مردوں کی کمائی کے بھروسے پر آپ ہنر پیشہ کچھ نہ سیکھیں۔'خواجہ الطاف حسین حالی کے ان خیالات کے بارے میں صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

''حالی کے دل میں عورتوں کا بڑا احترام تھا۔اور ان کی تعلیم وتربیت اور بھلائی کی گہری فکر تھی۔اور اس کا بڑا دکھ تھا کہ عورت کو مردوں نے علم کی روشنی سے محروم رکھا ہے۔اس احساس کی پہلی جھلک مجالس النسا میں نظر آتی ہے۔ بعد میں یہی درد چپ کی داد میں ڈھل کر سامنے آیا۔''[6]

اس کتاب کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے عورتوں کی اصلاح کی اور ساتھ ہی ان میں بیداری بھی پیدا کی،تعلیم نسواں کی اہمیت اور حقوق سے واقف کرانے کی غرض سے یہ کتاب تحریر کی گئی۔جس میں ان کی تعلیم کی ضرورت اور گھریلو تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔نیز انھیں بیدار کرنے پر زور صرف کیا ہے۔کم سنی کی شادی پر اعتراض اور شادی کے لیے لڑکی کی رضامندی کی اہمیت پر زور دیا ہے،قدیم رسم ورواج کی مخالفت بھی کی ہے۔فضول خرچی کی بھی مخالفت کی ہے۔خواتین کو روزگار سیکھنے کی حمایت کرتے ہوئے ان کے حقوق سے آگاہ کرایا ہے نیز مغرب میں تعلیم نسواں کے اصول اور طریقۂ کار کیسے ہیں ان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔صرف خواتین کے مسائل ہی نہیں پیش کیے بلکہ ان کا حل اور ان سے نجات کا طریقہ بھی بتلایا ہے۔

حالی نے 'مناجات بیوہ' 1884 میں مثنوی کی ہیئت میں تخلیق کی۔اس میں کل اشعار کی تعداد 445 ہے۔اس کی تخلیق کے زیر اثر ہندوستان میں بیوہ خواتین کی دوسری شادی کے لیے 'ہندو ریمیرج ایکٹ' 1856 میں تصحیح کی گئی۔ہندوستانی معاشرے میں بیوہ کی زندگی موت سے بدتر ہوتی تھی اپنے اور پرائے سب اس سے بیزار رہتے تھے اور اپنے سے اسے دور رکھتے تھے۔ساتھ ہی اس کو منحوس اور بدنصیب قرار دیتے۔حالی نے اس میں ایک بیوہ کے نفسیاتی احساسات وجذبات اور اس کے خاندانی اور سماجی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔اس کے دکھ و درد اور پریشانیوں کا بیان منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔مثال کے طور پر مختلف مقامات کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

میں لونڈی تیری دکھیاری　　دروازے کی تیری بھکاری
اپنے پرائے کی دھتکاری　　میکے اور سسرال پہ بھاری

آگے اپنے دکھ کا بیان کرتے ہوئے کہتی ہے کہ:

دل پر میرے داغ ہیں جتنے　　منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
تجھ پہ ہے روشن سب دکھوں کا　　تجھ سے حقیقت اپنی کہوں کیا

ایک عورت اپنی پیدائش پر ہی ملامت اور اظہار تاسف کرتی ہے:

یوں نہ میری اس جان پہ بنتی　　ماں مجھ کو اے کاش! نہ جنتی
عورت ذات کا تنہا جینا　　ہر دم خون جگر ہے پینا
ہے وہ بلا جو سہی نہ جائے　　پتا ہے جو کہی نہ جائے

عورت بیجا رسم ورواج میں جکڑی ہوئی ہے اس کا بیان کرتے ہوئے حالی اسی میں آگے رقمطراز ہیں:

اپنے بڑوں کی ریت نہ چھوٹے　　قوم کی باندھی رسم نہ ٹوٹے
ہو نہ کسی کو ہم سے ندامت　　ناک رہے کنبے کی سلامت
جان کسی کی جائے تو جائے　　آن میں اپنی فرق نہ آئے

اس میں خاندان کی عزت جانے کا ذکر کیا ہے کہ اگر کسی بیوہ کی شادی ہوتی ہے تو ان کے کنبے کی ناک کٹ جاتی ہے۔ ان حالات میں ایک بیوہ خدا سے فریاد کرتی ہے کہ:

کی جیو جو کچھ تیری خوشی ہو　　رانڈ مگر نہ کیجیو کسی کو
جب دکھیا پر پڑے یہ بپتا　　کر اسے تو پیوند زمیں کا
یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی　　جس سے گئی پربت جہاں کی
کام کوئی مشکل نہیں تجھ کو　　ایک یہ کیا گر تیری خوشی ہو

مذکورہ اشعار میں بیوہ کے جذبات واحساسات اور مسائل، دردوکرب کی عکاسی کے ساتھ قومی، ملکی، اصلاحی، اخلاقی اور فطری خیالات کے اظہار کا بیان دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے اس مثنوی کو تحریر کر کے سماجی اور ادبی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ اول یہ کہ انھوں نے لڑکیوں کے بچپن کی شادی پر پابندی اور بیوہ کی دوسری شادی کا حق سماجی طور پر حصول کرایا، خطرناک اور نقصان دہ رسم ورواج کی سخت مخالفت کی اور اس ناسور کا بھی علاج بتایا ہے۔ جس کی وجہ سے سماج اور قوم بیدار ہوئی حتیٰ کہ اس کے عملی نتیجے بھی برآمد ہوئے۔ ادب میں بھی اضافہ ہوا کہ خواتین سے متعلق تحریریں تخلیق کی جانے لگی۔ اس میں روزمرّہ کے حالات وواقعات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ نیز اس کے اثرات سے ہندوستان میں عورتوں کے مسائل دور کرنے، تعلیم کی حصول یابی اور حقوق کی بیداری کے لیے متعدد رسالے، ادارے اور انجمنوں کا بھی قیام عمل میں آیا جس کی بدولت معاشرے میں حقوق نسواں کی پاسداری کا جذبہ بیدار ہوا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو انھوں نے نظم میں متعدد موضوعات کو اٹھایا ہے۔ کمسنی کی شادی، بیوہ کی دوسری شادی، بیوہ کے دکھ و درد، گھریلو اور معاشرتی مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ خصوصی طور پر ایک کمسن اور غمگین بیوہ کے احساسات وجذبات، دل کی فریاد، گلہ شکوہ کا بیان ملتا ہے۔ یہ پوری مثنوی علامتوں، اشاروں، استعاروں، تشبیہوں اور محاوروں کے وسیلے سے آگے بڑھتی گئی ہے۔ اس مثنوی کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے کمسن بیوہ کے زخم پر ہاتھ رکھ کر اس کو پر تاثیر کر دیا ہے۔

الطاف حسین حالی نے 'چپ کی داد' کو 1905 میں ترکیب بند طور پر تحریر کیا اس میں کل 174 اشعار ہیں۔ اس کی اشاعت سب سے پہلے دسمبر 1905 میں رسالہ 'خاتون' میں ہوئی بعدہ فروری 1906 میں 'مخزن' کے شمارہ میں ہوئی تھی۔ اس نظم کو اسی سال جون میں حیدرآباد دکن کے جلسے میں پڑھا بھی تھا۔ اس میں انھوں نے خواتین کی عظمت اور سماج میں ان کے مقام ومرتبہ کو منفرد انداز میں ادا کیا ہے۔ نیز ظلم وزیادتی اور حق تلفی کا تذکرہ پُر درد انداز میں تفصیل سے کیا ہے۔

اس نظم میں انھوں نے خواتین کے جذبات واحساسات اور نفسیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل کا ذکر صاف طور پر کیا ہے وہ عورتوں کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظم 'چپ کی داد' میں لڑکیوں کو مخاطب کر کے وہ کہتے ہیں۔

افسوس! دنیا میں بہت تم پر ہوئے جور وجفا
حق تلفیاں تم نے سہیں، بے مہریاں جھیلیں سدا[7]
گو نیک مرد اکثر تمھارے نام کے عاشق رہے
پر نیک ہوں یا بد، رہے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم علم ودانش سے رہو محروم یہاں
آئی تھیں جیسی بے خبر، ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گمنام دنیا میں رہو
ہو تم کو دنیا کی نہ دنیا کو تمھاری کچھ خبر

حالی مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے اس طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ اور علم مردوں کے لیے اگر آب حیات ہے تو عورتوں کے لیے زہر کیوں سمجھا گیا وہ معاشرے سے سوال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات
ٹھیرا تمھارے حق میں وہ، زہر ہلاہل سر بسر

سوال کرنے کے علاوہ وہ ان حالات کو مستقبل کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ ایک وقت آئے گا جب دنیا کو ان زیادتیوں اور بے انصافیوں کا جواب دینا پڑے گا۔ اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ یہ سب تبدیل ہو جائے گا وہ گویا ہیں۔

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان، حق تلفیوں کا وہاں جواب[8]
ایسا نہ ہو، مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پاکر آدمی بنتا تمھیں زیبا نہیں[9]
بارے زمانہ نیند کے ماتوں کو لایا ہوش میں
آیا تمہارے صبر پر دریائے رحمت جوش میں[10]

چپ کی داد کا آٹھواں بند بیحد اہم ہے کیونکہ خواتین کے لیے جو مدتوں بعد تبدیلی کا آغاز ہوا۔ اس کا بیان دلکش پیرائے میں کیا گیا ہے۔

نوبت تمہاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے
انصاف نے دھندلی سی اک اپنی جھلک دکھلائی ہے
گو ہے تمھارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا
پر، حل ہر اک مشکل یونہی، دنیا میں ہوتی آئی ہے[11]

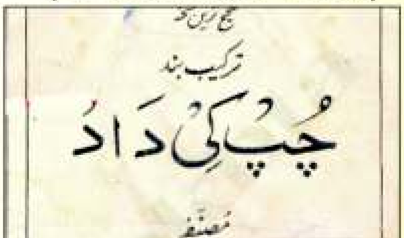

حالی کی اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خواتین کے حالات سے باخبر تھے انھیں یہ احساس تھا کہ جو پابندیاں عورتوں پر عائد کی جا رہی ہیں وہ سب بیکار اور فضول ہیں لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں اس کے برعکس لڑکوں کے لیے تمام راستے کھلے ہوئے ہیں۔ نظم میں شاید اسی لیے حالی نے لڑکیوں کو مخاطب کر کے انھیں ان کے حالات سے باخبر کرنے کی سعی کی۔ حالی نے اپنی نظم 'چپ کی داد' اور 'مناجات بیوہ' میں خواتین کے جذبات واحساسات اور مسائل کے ساتھ ساتھ انھیں بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ نظم 'چپ کی داد' میں عورتوں کی بے بسی، لاچاری اور خاموشی اور سماجی مسائل کو پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم نسواں کی حمایت بھی کی گئی ہے بھوپال کی بیگم سلطان جہاں تعلیم نسواں کے لیے متحرک رہی ہیں

ان کی صدا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

جو حق کی جانب دار ہیں بس ان کے بیڑے پار ہیں
بھوپال کی جانب سے یہ ہاتف کی آواز آئی ہے

حالی سے متاثر ہوکر احسن مارہروی نے بھی ایک نظم 'چپ کی فریاد' عنوان سے لکھی انھوں نے عورتوں کی زبان میں یا ان کی طرف سے مکالمے کو شعری پیرائے میں پیش کیے ہیں جس میں خواتین کے مسائل اور ناقدری کی طرف توجہ بھی دلائی گئی ہے کہ کن وجوہات سے عورتوں کو سماج میں کمتر سمجھا جاتا ہے۔ خواتین کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

''اے باپ بیٹو بھائیو ہم کو شکایت تم سے ہے
غیروں سے ہی کیا واسطہ اپنی قرابت تم سے ہے''

''عورت ہیں ہیرے کی طرح جوہر بہت سے ہیں نہاں
لیکن نہ ہو ترشا ہوا ہیرا تو قدر اس کی کہاں''12

مناجات بیوہ اور چپ کی داد کے علاوہ انھوں نے مدوجزر اسلام میں بھی خواتین کی خستہ حالت کا ذکر کچھ یوں کیا ہے۔

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر
تو خوف شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور
کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گو وا پسی نفرت سے کرتی تھی خالی
بنے سانپ جیسے کوئی جننے والی 13

اس بند میں خواتین سے وابستہ قدیم روایت کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں بچیوں کے پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ یہ روایت ابھی بھی بعض علاقوں میں رائج ہے۔

انیسویں صدی میں جب سرسید احمد خاں مردوں کی تعلیم کے بعد لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ کرنا چاہتے تھے وہیں دوسری طرف اکبرالہ آبادی عورتوں کی تعلیم کے سخت خلاف تھے۔ حالی نے اس وقت خواتین کے مسائل، حقوق اور تعلیم نسواں کی پرزور وکالت کی۔ نیز واضح طور پر وہ تعلیم نسواں اور حقوق نسواں کے حمایتی اور پاسدار تھے۔ انھوں نے تحریری اور عملی دونوں طرح سے فروغ دیا۔ حالی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف خواتین کے مسائل کو شعری پیکر میں بیان کیا ہے بلکہ اس پر عمل بھی کیا ہے۔ انھوں نے لڑکیوں کا پہلا مدرسہ اپنے گھر کے پاس پانی پت میں کھولا تھا اور اپنے گھر کی لڑکیوں کو تعلیم دینا شروع کیا تھا۔

اگر ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی کا موازنہ کیا جائے تو مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں مسائل کے ذکر کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں کی حمایت اور گھریلو تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔ حالی کے یہاں مذکورہ کے علاوہ خواتین کو ان کے حقوق کے لیے بیداری، فرسودہ رسم ورواج پر پابندی، کمسنی کی شادی کی مخالفت اور خواتین کے روزگار سیکھنے کی حمایت کی گئی ہے۔ نذیر احمد نے اپنی بچیوں کی اصلاح اور گھرداری سیکھنے کے لیے پہلی تحریریں لکھی تھیں لیکن حالی نے متعدد خواتین کی حق تلفی کے خلاف تحریریں تخلیق کی تھیں۔ وہ زندگی ہی کیا جو اپنے لیے جی جائے حقیقی زندگی وہ ہے جو دوسروں کے لیے جی جائے۔ ان کی کتاب مجالس النسا، مثنوی مناجات بیوہ، نظم چپ کی داد اور قطعہ بیٹیوں کی نسبت کی زبان میں سلاست، روانی، زبان وبیان، سوزوگداز اور درد وکرب بیحد نظر آتا ہے۔ جو اردو میں ایک مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ مناجات بیوہ کا ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے زیر اثر تعلیم نسواں کے زبردست حامی شیخ عبداللہ اور ان کے رفقا نے علی گڑھ میں لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیا۔ اس کے علاوہ حالی کے مشورے پر ہی سلطان جہاں یعنی بھوبیگم کے ذریعے علی گڑھ میں ہی گرلس ہاسٹل کا قیام عمل میں آیا۔

ہندوستان میں اٹھارہیں صدی میں جب راجہ رام موہن رائے نے اصلاحی تنظیم نافذ کی اور عورتوں کے ظلم وستم کی مخالفت اور حقوق کی حمایت کی اسی دور میں الطاف حسین حالی نے خواتین کے حق میں تحریریں لکھی جن میں مجالس النسا، مناجات بیوہ، چپ کی داد اور بیٹیوں کی نسبت کے عنوان سے لکھ کر مسلم معاشرے میں رستے اور بہتے ہوئے ناسور کو اجاگر کیا جس کی وجہ سے تمام معاشرہ بدبودار ہو گیا تھا۔ اسی لیے صغرامہدی نے کہا ہے کہ'' مسلمانوں میں تحریک نسواں کی ابتدا کرنے والے خواجہ الطاف حسین حالی تھے۔''14 حالی کو تحریک نسواں کا علمبردار بھی مانا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے سب سے پہلے

اگر ڈپٹی نذیر احمد اورمولانا حالی کا موازنہ کیا جائے تو مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولو ں میںمسائل کے ذکر کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں کی حمایت اور گھریلو تعلیم پر زور دیا گیا ہے ۔حالی کے یہا ںمذکورہ کے علاوہ خواتین کو ان کے حقوق کے لیے بیداری، فرسودہ رسم ورواج پرپابندی، کمسنی کی شادی کی مخالفت اور خواتین کے روزگار سیکھنے کی حمایت کی گئی ہے۔

خواتین کے حقوق کی آواز بلند کی۔

حالی کی نگاہ ماضی، حال اور مستقبل پر بہت گہری نظر تھی وہ ماضی، حال کی روشنی میں قوم کے روشن مستقبل کے خواہش مند تھے اس لیے انھوں نے سرسید کے وقت میں ہی خواتین کے مسائل، تعلیم نسواں اور حقوق نسواں پر قلم اٹھایا۔ ان کو بیسویں صدی میں تیز رفتار سائنس اور ٹکنالوجی کا مکمل احساس تھا ان کے تعلیمی نظریات میں جدید وقدیم اور دین ودنیا کی کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ مولانا حالی کی تحریروں میں مجالس النساء، مناجات بیوہ، چپ کی داد اور بیٹیوں کی نسبت میں تانیثیت کے اولین تصورات واضح طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں جس میں روشن خیال، حریت، سماجی اور معاشی تانیثیت کے افکار ونظریات قابل ذکر ہیں جس کی وجہ سے ہندوستان اور اردو ادب میں تحریک نسواں کی تاریخ میں حالی کی حیثیت اولین تانیثی علمبردار کے طور پر قائم رہے گی۔ جس طرح اردو تنقید اور شاعری کے پرستار حالی کے شکر گزار رہیں گے اسی طرح تانیثیت کے حوالے سے خواتین بھی ہمیشہ رہیں گی۔

حواشی:

1- مجالس النساء: مولانا الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، بار دوم دسمبر 1993، ص 17
2- ایضاً، ص 18
3- ایضاً، ص 19-20
4- ایضاً، ص 46
5- حوالہ مجالس النسا از الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، 1971، ص 75
6- 'مجالس النسا' از الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، 1961، ص 6
7- چپ کی داد اور چپ کی فریاد از حالی و احسن مارہروی، مرتبہ سید رفیق مارہروی، ناشر نسیم بکڈ پو لاٹوش روڈ لکھنؤ، 1959، ص 9
8- ایضاً، ص 11-12
9- ایضاً، ص 13
10- چپ ایضاً، ص 14
11- ایضاً، ص 14
12- ایضاً، ص 11
13- مدوجزر اسلام مسدس حالی از شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی، منشی تیج کمار وارث نولکشور پریس لکھنؤ، 17 بار اشاعت، ص 25
14- الطاف حسین حالی: تحقیقی وتنقیدی جائزے، مرتب پروفیسر نذیر احمد، ناشر غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ص 335

■

Dr. Tasneem Bano
G-10, Malkaganj
Delhi - 110007
Mob.:9990254708

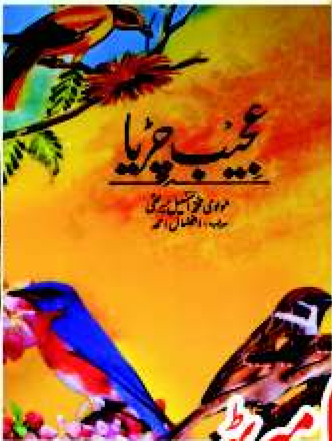

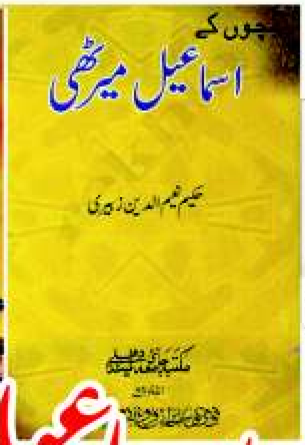

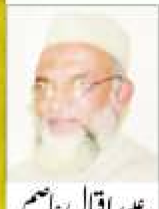

عبید اقبال عاصم

مولانا محمد اسماعیل میرٹھی اور بچوں کا نصاب

دنیا کے ہر مذہب نے اور ہر زبان نے تعلیم اطفال کو اپنا موضوع بنایا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ سادہ لوح بچوں کے ذہن میں ابتدائی طور پر اپنے مذہب و زبان کے ایسے نقوش مرتسم ہو جائیں جو انمٹ ہوں۔ دوسرے مذاہب سے ہٹ کر مذہب اسلام نے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی ہے اور اپنے متبعین کو واضح ہدایات دی ہیں کہ انھیں بچوں کے ساتھ کس انداز سے رہنا چاہیے، ان کے خورد و نوش، پرورش، تعلیم، ذہن سازی میں معاون چیزوں پر بھی توجہ دلائی گئی۔ تاکہ وہ بڑے ہو کر با اخلاق عمدہ شہری بن سکیں۔ اسی وجہ سے ماہرین تعلیم نے ہر مقام پر، ہر عہد میں اس امر کو ملحوظ رکھا کہ بچوں کی تعلیم کے دوران وہ طریقے اختیار کیے جائیں جس سے ان کی دلچسپیوں کا سامان ہوتا رہے، اسی وجہ سے کہانی، قصے، واقعات، نظم و نثر میں اس طرح پیش کیے جاتے ہیں، جس سے بچے کی دلچسپی بھی برقرار رہے اور وہ تعلیمی میدان میں ارتقائی مراحل بھی طے کرتا رہے۔

موجودہ زمانے کی ہمہ ہمی اور تعلیم کے نام پر چلنے والی تجارت کے عہد سے قدرے کچھ سالوں کے فاصلے پر چلے جائیے تو مسلمانوں کے اپنے اسکولوں میں بطور خاص اس بات کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ جو سلیبس بنایا جائے وہ بچے کے ذہن کی مناسبت سے بنایا جائے اور اس کے اندر اتنی کشش ہو کہ بچے کو پڑھائی میں کوئی بوریت یا اکتاہٹ نہ ہو بلکہ اس کی دلچسپی بڑھے۔ یوں تو یہ کام ہر دور میں ہوتا رہا لیکن انیسویں صدی میں جب باقاعدہ درجہ بندی کی جانے لگی تو مولانا محمد اسماعیل خاں صاحب میرٹھی نے اس طرف خاص توجہ دی۔

انیسویں صدی عیسوی ہندوستانیوں کے لیے انتہائی صبر آزما گذری ہے۔ مغلیہ سلطنت کے اختتام کے بعد انگریزوں کے مکمل تسلط کے بعد یہ پوری صدی بالخصوص اس کا نصف آخر مسلمانوں کے لیے قیامت سے کم نہیں گزرا۔ ان حالات میں مولانا محمد اسماعیل کی پیدائش 12 نومبر 1844 کو میرٹھ کے شیخ پیر بخش کے گھرانے میں ہوئی جو میرٹھ کے تعلیم یافتہ معزز ترین افراد میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا کے پہلے استاد ہونے کا شرف بھی انھیں کو حاصل ہے۔ اس دور کے رواج کے مطابق قرآن مجید اور ابتدائی فارسی کتب گھر پر ہی پڑھیں پھر فارسی زبان کی اعلیٰ تعلیم میرٹھ کے ایک عالم رحیم بیگ صاحب سے حاصل کی۔ بچپن سے ہی آپ علمی کاموں میں منہمک رہنے کے عادی تھے، آپ کے اس انہماک کو دیکھ کر آپ کے استاد رحیم بیگ نے 'برہان قاطع' مؤلفہ مرزا غالب پر کیے جانے والے تنقیدی کام میں آپ کو شامل رکھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مولانا کو مختلف لغات پڑھنے نت نئے الفاظ کے معانی و مطالب سمجھنے اور ان کے افہام و تفہیم پر قدرت حاصل ہوگئی اور نہایت کم عمری میں آپ نے فارسی زبان پر دسترس حاصل کرلی۔ ابھی مولانا عنفوان شباب میں قدم رکھ ہی رہے تھے کہ 10 رمئی 1857 مطابق 14 ر رمضان المبارک 1274ھ کو میرٹھ کا وہ معرکۂ حریت پیش آیا جسے انگریزوں نے بغاوت اور غدر کا نام دیا۔ اس کے ناکام ہونے کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں پر ظلم و بربریت کے جو پہاڑ توڑے اس کی الگ داستان ہے۔ بہرحال مولانا مرحوم ان حالات سے زبردست متاثر ہوئے اور انھوں نے حالات کا جائزہ لے کر اپنی مایوس و خوف زدہ قوم کو جگانے اور جگائے رکھنے پر کمر باندھ لی۔

مولانا محمد اسماعیل ایک باوقار علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے کم عمری میں ہی فارسی کی بہت سی کتابیں بشمول گلستاں و بوستاں مروجہ دستور کے مطابق پڑھ لی تھیں۔ اس کے بعد میرٹھ میں ہی ایک اسکول میں داخل ہوگئے۔ بچپن سے ہی نہایت ذہین واقع ہوئے تھے انھیں فن تعمیرات سے دلچسپی تھی جس کی وجہ سے رڑکی کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا لیکن یہ تعلیم مکمل نہ ہوسکی اور اپنی گھریلو مجبوریوں کے باعث واپس میرٹھ آگئے اور محض سولہ سال کی عمر میں حکومت کے محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہوگئے۔ کچھ عرصہ کلرک رہے اور پھر تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ مولانا کی شخصیت و شاعری پر تحقیق کرنے والی محترمہ ڈاکٹر شاداب علیم صاحبہ کی یہ تحقیق بالکل درست ہے کہ ''بحیثیت معلم وہ اعلیٰ کردار کے حامل تھے، اپنے پیشے کے فرائض بہت ہی متانت و سنجیدگی سے انجام دیے۔ علم کو مفید و مؤثر انداز میں پھیلانے کے لیے کوشاں رہتے۔ اس عمل کو عبادت سے تعبیر کرتے، بچوں سے بہت شفقت و محبت سے پیش آتے۔ ان کے لیے ادب تحریر کرتے کیونکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ آج کے بچے ہی کل کا مستقبل ہیں۔ وہ اپنے مشفقانہ انداز سے نوخیز ذہنوں کی تربیت فرماتے زندگی بھر بچوں کو اعلیٰ اخلاقی تعلیم کا درس دیا تاکہ وہ ایک بہتر شخص بن سکیں۔ بچوں کے ذہن میں اتر کر اور ان کی نفسیات کا مطالعہ کر کے ایک ایسا ادب تخلیق کرنا جو نہ صرف بچوں کے لیے فرحت و انبساط کا ذریعہ بنے بلکہ ان کو اعلیٰ انسانی اقدار کی سمت میں گامزن بھی کرے، جوئے شیر لانے سے کم نہیں

تھا مگر مولانا نے اس مشکل ترین امر کو بخوبی انجام دیا ہے۔

(ماخوذ از جدید شاعری کا نقطۂ آغاز، اسماعیل میرٹھی، ڈاکٹر شاداب علیم، مطبوعہ میرٹھ، 2010، ص 33)

انھوں نے تدریسی فرائض انجام دیتے ہوئے ایک عظیم منصوبے کے تحت ملک وقوم کے نونہالوں کی شخصیت سازی اور نئی نسل کے ذہنوں کو کجی و بربادی سے بچانے کے لیے بچوں کی نفسیات کے مطابق ایسا نصاب تیار کیا جس میں ان کی تعلیم کے ساتھ ہی دلچسپ قصوں اور کہانیوں کے ذریعے ان کی غیر مرئی انداز سے تربیت بھی ہو سکے اور ابتدائے عمر سے ہی بچے کے دل و دماغ پر وہ نقوش جم جائیں، جن سے اس کے اخلاق درست ہوں اور وہ آگے چل کر ایک اچھے کامیاب اور باوقار شہری بن سکیں۔

مولانا دردمند دل رکھتے تھے، ملت کی زبوں حالی اور مسلمانوں کی پسماندگی کا وہ دور اندیشی کے ساتھ دیرپا حل نکالنا چاہتے تھے، مولانا نے شعور سنبھالنے کے ساتھ ہی جس ماحول کا مشاہدہ کیا اس میں سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی و اخلاقی لحاظ سے مسلمانوں کی حالت بہت زیادہ خراب تھی، تعلیم کا تصور بالعموم مفقود تھا، تعلیم یافتہ افراد کو سماج سے کوئی غرض نہیں تھی، مولانا سماج کی اصلاح کی خواہش لے کر میدانِ عمل میں آئے، اس کے لیے انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کو ضروری سمجھا اور بامقصد تعلیم کے لیے بچوں کی عمر کے لحاظ سے ان کی ذہنی نشو و نما کو سامنے رکھتے ہوئے محنت وعرق ریزی کے ساتھ ایسا نصاب تیار کیا جس میں بچوں کی ظاہری تعلیم پر ہی اکتفا نہ ہو بلکہ ان کی اندرونی حالت میں سدھار آئے۔ چونکہ اس وقت سرکاری اور مادری زبان اردو تھی اس لیے انھوں نے اردو زبان میں الف بے تے سے شروع ہونے والا چھ سالہ نصاب بچوں کی فکر کے اندر ایک انقلاب پیدا کرنے کے لیے تیار کیا۔ مسلمانوں کی مذہبی، سماجی، اخلاقی اور تعلیمی اصلاح کی کوششوں کو روبہ عمل لانے میں اس زمانے میں بہت سے ادارے وجود میں آئے لیکن مولانا نے تن تنہا جو کام انجام دیا وہ ان کے خلوص وللّٰہیت کی بنا پر بہت سے اداروں سے بڑھ گیا۔ اگر ہم اس نصاب کا سرسری جائزہ لیں تو یہ ڈیڑھ صدی سے زیادہ گذر جانے کے باوجود آج بھی اتنا ہی مفید اور کارآمد ہے جتنا نصاب ترتیب دیتے وقت تھا۔ تین چار دہائی قبل تک یہ نصاب سرکاری و غیر سرکاری اسکولوں میں رائج تھا لیکن بچوں کی تعمیری صلاحیتوں کو مختلف زاویوں میں تقسیم کر کے اس نصاب کو سرکاری اسکولوں کی دیکھا دیکھی دوسرے اسکولوں نے بھی ہٹا لیا لیکن اس کی افادیت میں کوئی کمی نہیں۔

درجہ اول کے لیے اردو زبان کی پہلی کتاب سے بھی پہلے اردو زبان کا قاعدہ ان نوآموز مبتدی بچوں کے لیے ہے جو اپنی کم عمری کے باعث ابھی اسکول میں داخل ہوئے ہوں یا اردو سیکھنے کے خواہشمند ہوں۔ موجودہ زمانے میں ہم اسے نرسری کا نصاب بھی کہہ سکتے ہیں۔ اردو کی پہلی کتاب کی شروعات تو چار حرفی الفاظ کے لکھنے سے ہوتی ہے۔ پھر پانچ حرفی، چھ حرفی، سات حرفی، آٹھ حرفی حروف کو ملا کر لفظ بنانا، پھر ان سے جملے بنانے کی مشق بھی کرائی گئی ہے۔ تقریباً پندرہ اسباق اسی مشق میں گذر جاتے ہیں۔

سولہویں سبق میں ہندی، انگریزی مہینوں کے نام اور ان کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ سترہویں سبق میں آدمیوں، شہروں، ندیوں، پہاڑوں، جانوروں، درختوں، برتنوں، رنگوں پھولوں، کپڑوں، کاموں اور پیشوں سے متعلق متعدد وہ الفاظ بچوں کے ذہن نشین کرا دیے جاتے ہیں جن سے بچہ ان کو بولنا پڑھنا اور لکھنا بھی سیکھ جائے اسی کے ساتھ اس کے ذہن میں یہ بھی رہے کہ یہ الفاظ کس سے متعلق ہیں تاکہ مستقبل میں وہ جب بھی ان الفاظ کو سنے تو اس کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ آئے۔

اب جب بچہ الفاظ کے بولنے، لکھنے، پڑھنے اور سمجھنے پر قادر ہو گیا تو بتدریج اُسے ایسے اسباق پڑھائے جاتے ہیں جن سے وہ اور زیادہ معلومات حاصل کر لے مثلاً پہلی کتاب کا اٹھارہواں سبق ''بستی'' ہے جو ایک طریقے سے علم مدنیت سے تعلق رکھتا ہے اس میں بچوں کو بستی (یعنی جہاں کا وہ رہنے والا ہے) کے بارے میں تو بتایا ہی جاتا ہے اس کو شعوری طور پر ان فرائض سے بھی آگاہ کرا دیا جاتا ہے جو بستی میں اپنے سے متعلق اس پر عائد ہوتے ہیں، اسی طریقے پر سبق 19 'آدمیوں کے کام''، بیسواں سبق 'وقت'، اکیسواں سبق 'مشہور شہر اور دریا' معلوماتی بھی ہیں اور پند و نصائح سے بھرپور ہیں۔

بائیسویں سبق میں ایک تمثیلی کہانی پڑھا کر بچوں کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ ہمیں دوسروں سے زیادہ اپنی برائی پر غور کرنا چاہیے، تئیسویں سبق میں بدن کے حصوں اور ان کے نام بتائے گئے ہیں تو چوبیسویں سبق میں قدرے تفصیل سے زراعت اور اس کے شعبوں کھیت، زمین، پودوں، موسم اور فصلوں سے متعلق بچوں کو انتہائی مفید معلومات بہت ہی مناسب انداز سے فراہم کی گئی ہیں۔

اردو زبان کی دوسری کتاب چھوٹے بڑے چوالیس اسباق پر مشتمل ہے جس کی ابتدا 'خدا کی خلقت' سے ہوتی ہے اور اختتام 'زراعت' پر ہوتا ہے۔ حسب معمول مولانا نے مشکل سمجھے جانے والے الفاظ کو ہر سبق کے آخیر میں دیا ہے تاکہ بچہ ان الفاظ کے ہجے اور معانی یاد کر سکے۔

دوسرا اور تیسرا سبق 'نور کا تڑکا' اور 'آفتاب' معلوماتی ہیں تو چوتھے سبق میں بچوں کو ''اچھے عادات و اطوار اپنانے کے لیے 'خوش خوئی' کا عنوان دے کر اچھی عادتوں کے فائدوں کو بتایا گیا ہے۔ یہ سبق بچوں کے ذہن کی مناسبت سے بہت ہی زیادہ مفید معلوم ہوتا ہے، اس میں بچوں کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کو خوشگواری کے ساتھ گذارنے کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔ پانچواں سبق 'مچھلی' قدرت کی کاریگری کو ظاہر کرتا ہے تو اس سے اگلے منظوم سبق 'پن چکی' میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ روٹی پکانے کے لیے جو آٹا آتا ہے وہ کس طرح تیار ہوتا ہے۔ اس میں مولانا نے اپنا پیغام

دل سے محنت کرو خوشی کے ساتھ
نہ کہ اکتائے خامشی کے ساتھ''

کی شکل میں محنت کی تلقین پیدا کرنے کے لیے دے دیا ہے، اس سے اگلا سبق 'شیر اور چیتے' کی مختصری کہانی پر مشتمل ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ غصہ اور لڑائی کے کیا نقصانات ہیں؟ اس میں دونوں فریق کو نقصان ہوتا ہے اور کوئی تیسرا چالاک فریق ایسے مواقع کا فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ علاوہ ازیں درج ذیل کہانیوں میں زمانے کی

مولانا دردمند دل رکھتے تھے، ملت کی زبوں حالی اور مسلمانوں کی پسماندگی کا وہ دور اندیشی کے ساتھ دیر پا حل نکالنا چاہتے تھے، مولانا نے شعور سنبھالنے کے ساتھ ہی جس ماحول کا مشاہدہ کیا اس میں سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی و اخلاقی لحاظ سے مسلمانوں کی حالت بہت زیادہ خراب تھی، تعلیم کا تصور بالعموم مفقود تھا، تعلیم یافتہ افراد کو سماج سے کوئی غرض نہیں تھی، مولانا سماج کی اصلاح کی خواہش لے کر میدان عمل میں آئے، اس کے لیے انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم کو ضروری سمجھا اور با مقصد تعلیم کے لیے بچوں کی عمر کے لحاظ سے ان کی ذہنی نشوو نما کو سامنے رکھتے ہوئے محنت و عرق ریزی کے ساتھ ایسا نصاب تیار کیا جس میں بچوں کی ظاہری تعلیم پر ہی اکتفا نہ ہو بلکہ ان کی اندرونی حالت میں سدھار آئے۔

برائیوں کو تمثیلی کہانیوں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے مثلاً 'ایک مرغا اور لومڑی' میں ظالموں کی حیلہ بازیاں، 'ایک ہاتھی اور گیدڑ' میں لالچ کے انجام اور 'چوہے اور بلی' میں بزدلی و کم ہمتی کے نقصانات، 'ایک اونٹ اور چوہا' میں احمقانہ فیصلے، 'ایک شہری اور جنگلی چوہا' میں آزادی کے فوائد بتاتے ہوئے مولانا نے ایک قطعہ نظم کیا ہے جو اب تک ضرب المثل بنتا آ رہا ہے۔

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو
بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو

'ایک حریص بلی' نامی نظم میں لالچ کی برائی دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے تو 'چند نصیحتیں' نامی سبق میں بالکل سیدھے اور سپاٹ انداز میں بچوں کو کارآمد نصیحتیں ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔

'رب کا شکر ادا کر بھائی — جس نے ہماری گائے بنائی' 'ہماری گائے' نامی نظم کا پہلا مشہور شعر ہے اس میں گائے کی معصومیت، بھولے پن اور عوام کو فائدہ پہنچانے کے مزاج کو نظم کیا گیا ہے۔ 'کلہاڑی اور درخت' نامی سبق میں دور اندیشی نہ ہونے کے نقصانات، 'برسات اور گاؤں' میں موسم برسات کے خوشنما منظر اور کسانوں کی خوشحالی کو پیش کیا گیا ہے۔ مولانا نے درمیان کتاب میں نظیر اکبرآبادی کی مشہور نظم 'بنجارہ نامہ' کے دو تین بند پیش کر کے دنیا کی بے ثباتی کو بھی بچوں کے ذہن نشین کرا دیا ہے۔

'کھانے پینے کے آداب'، 'اپنی عزت آپ کرو'، 'گفتگو کے آداب' اور 'نشست و برخاست کے آداب' اسباق بچوں کے اُن اوصاف کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں جو اسے خانگی و سماجی زندگی میں عزت و وقار سے ہم کنار کر سکیں۔ کچھ چھوٹی چھوٹی نظمیں بہت سی برائیوں کو ترک کرنے پر ذہن سازی کرتی ہیں، 'کاموں کی تقسیم'، 'تجارت' اور 'زراعت' کے عنوان سے اسباق ان کاموں سے وابستہ افراد اور ان کی ضرورت کو ثابت کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں ہیں جو کردار سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

بچے کی عمر چھ سات سال ہوتے ہوئے اس کے ذہن میں الفاظ کا ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ بچہ پڑھنے کا سلیقہ، لکھنے کا طریقہ بھی سیکھ لیتا ہے اور اس کو گفتگو کا انداز، مجلس اور نشست و برخاست کے آداب بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔

عمر کے بڑھنے کے ساتھ بچے کے اندر تجسس پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ مولانا نے اپنے اس نصاب میں اس کا خاص خیال رکھا ہے بچہ اردو کی تیسری کتاب پڑھتا ہے تو اسے بہت سی چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں جن میں کچھ کاشت سے تعلق رکھتی ہیں اور کچھ معدنیات سے، 'ریشم'، 'ناریل کا درخت'، 'چائے'، 'نیل' اور 'نمک' نامی اسباق میں ان چیزوں کے فوائد طریقۂ کار اور ان سے وابستہ بہت سے کارآمد نسخے طالب علم کے ذہن نشین کرا دیے جاتے ہیں تو 'پلاٹینم'، 'سونا'، 'چاندی'، 'پارہ'، 'تانبہ'، 'جستہ'، 'لوہا'، 'سیسہ' اور 'رانگ' نامی اسباق میں دھاتوں کے بارے میں بچے کو مفید معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔ نظموں کا سلسلہ کتاب کی ابتدا میں 'خدا کی تعریف' سے شروع ہوتا ہے اور دو دو تین اسباق کے بعد کسی نہ کسی نئے عنوان سے بچوں کی عمر کی مناسبت سے خوبصورت نظمیں دی گئی ہیں جن میں زیادہ تر ایسی کارآمد نصیحتیں ہیں جو تا عمر کام آنے والی ہیں۔ 'ایک مور اور کلنگ'، 'ایک ایماندار لڑکا'، 'تھوڑا تھوڑا بہت ہو جاتا ہے'، 'دال کی فریاد'، 'صبح کی آمد'، 'سچ اور جھوٹ'، 'ماں کی مامتا'، 'طمع کی انگوٹھی' اور 'ریل گاڑی' ایسی نظمیں ہیں جو پڑھنے میں بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں اور ذہن کو اچھا پیغام پہنچانے کا کام بھی کرتی ہیں۔ حسب معمول کتاب کے اس حصے میں بھی بہت سی حکایتیں ہیں جن میں بین السطور اچھائیوں کو کرتے رہنے اور برائیوں سے بچتے رہنے کا پیغام نہایت مؤثر انداز میں دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک طالب علم کو درخواست کس طرح لکھنی چاہیے، آداب و القاب کس طرح کے ہونے چاہئیں، 'مطالعہ اور آموختہ' کے کیا فوائد ہیں، تندرستی کے لیے ہوا، پانی اور غذا کا کیسا التزام ہونا چاہیے، آدمی کا لباس کیسا ہو جس

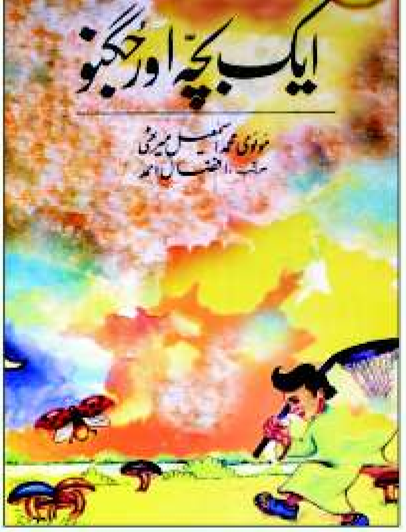

سے اس کے وقار میں اضافہ ہو، موسم، زمین، مکان کے ساتھ ساتھ زراعت جو اس وقت ہندوستانی باشندوں کی اکثریت کا ذریعۂ معاش تھا، اس کے بارے میں بتدریج پچھلی جماعت سے آگے کی بات کی گئی ہے۔

چوتھی کتاب میں بہت سے تاریخی افراد کے واقعات بھی ملتے ہیں جن میں محمود غزنوی، نور جہاں بیگم، سلطان ناصرالدین، سلطان جلال الدین خلجی، سلطان فیروز، شیر شاہ سوری، غیاث الدین، شہاب الدین، پرتھوی راج، جلال الدین محمد اکبر، اہلیا بائی، سیتا جی، بیرم خان، ابوالفضل فیضی، راجہ ٹوڈرمل، راجہ بیربل وغیرہ سے متعلق کچھ قصے کہانیاں اور کچھ ان سربراہان مملکت کے عقل و تدبر، ذہانت و فطانت اور جرأت و حکمت کے واقعات محض اس غرض سے پیش کیے گئے ہیں تاکہ بچے ان سے عبرت و موعظت حاصل کر سکیں۔ 'خدا کی قدرت'، 'گرمی کا موسم'، 'میرا خدا میرے ساتھ ہے'، 'ایک پودا اور گھاس'، 'کوشش کیے جاؤ'، 'دو مکھیاں'، 'اشعار ذوق'، 'اشعار رند'، 'آم کی تعریف'، 'بارش کا پہلا قطرہ'، 'ہندوستان کے پھول'، 'تاروں بھری رات' ایسی نظمیں ہیں جو مفید معلومات سے بھرپور ہیں، 'کچھوا اور خرگوش'، 'بے فائدہ کوشش' اور 'ترک تکبر' جیسی نظمیں کارآمد نصیحتوں کا پشتارہ ہیں تو 'قوت برق'، 'دخانی کشتی'، 'ریلوے انجن' اور 'چھاپہ کا ایجاد' وغیرہ ایسے اسباق ہیں جو طلباء کو نت نئی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ زراعت چونکہ اس وقت کا عام پیشہ تھا اس لیے مولانا نے اس کتاب کے آخیر میں بھی اس کے تعلق سے طلباء کی ذہن سازی کی ہے اور بتایا ہے کہ زراعت کرنے والے کو کون کون سے جانور پالنے چاہئیں؟ کاشتکاری اور گلہ بانی کے کیا فائدے ہیں؟ باغبانی کسے کہتے ہیں؟ کاشت کے لیے زمین کو کیسے مؤثر بنایا جائے؟ اقسام زمین کیا ہیں؟ زمین کو نرم کرنے اور اسے قابل کاشت بنانے کے لیے اس میں جو ہل چلایا جاتا ہے وہ کیا ہوتا ہے؟ ہل اور اس کے الگ الگ پرزوں کے نام بچوں کے ذہن نشین کرا دیے گئے ہیں اور پھر جوتائی اور کھیتوں کی سیرابی اور میائی پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ کھاد اور کھاد بنانے کے طریقے بھی بتا کر بچوں کو اس قابل کر دیا جاتا ہے کہ اگر وہ حالات کی مجبوری کے سبب اپنی تعلیم کو آگے جاری نہیں رکھ سکتے اور کاشتکاری کو ذریعہ معاش بنانا چاہتے ہیں تو انھیں کسی قسم کی کوئی دشواری نہ ہو اور وہ ایک بہترین کاشتکار بن کر ملک و قوم کی ترقی میں معاون ہوں۔

اردو زبان کی پانچویں کتاب کی ابتدا بھی اللہ کی حمد سے ہی ہوتی ہے۔ مولانا نے اس معاملے میں بھی بتدریج

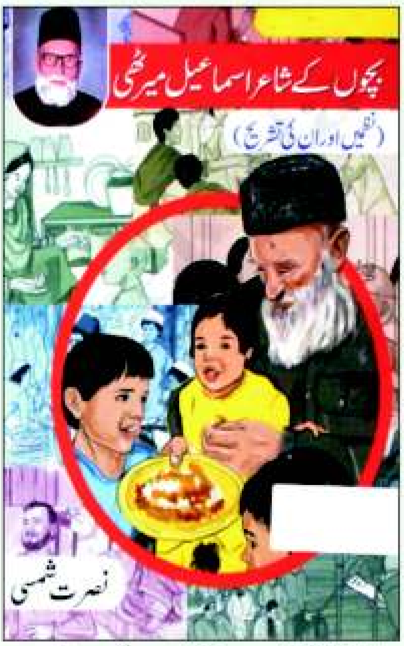

بچوں کی ذہن سازی کی ہے۔ مثلاً دوسری کتاب کا آغاز ایک نثری مضمون 'خدا کی خلقت' سے کیا گیا تھا تو تیسری کتاب کی ابتدا ایک نظم 'خدا کی تعریف' سے ہوئی تھی۔ چوتھی کتاب 'خدا کی قدرت' نامی نظم سے شروع کی جاتی ہے تو پانچویں کتاب کا آغاز 'خدا رزاق ہے' سے معنون نظم سے ہوئی جو مولوی عبدالحکیم کی ہے۔

خود نظم کردہ گیارہ ایسی نظمیں کتاب کی زینت بنا کر بطور سبق دی گئی ہیں جو طالب علموں کی طبیعت میں نشاط بھی پیدا کرتی ہیں اور زندگی میں امنگ بھی پیدا کرتی ہیں، بچوں کو جینے کا سلیقہ بھی سکھاتی ہیں اور ان کے علم میں اضافہ بھی کرتی ہیں۔ اس کتاب کی تالیف کے وقت مؤلف نے بطور خاص اس بات کا خیال رکھا ہے کہ بہترین کارآمد مفید اور ناصحانہ منظوم کلام ایسا ہو جس سے بچوں کی ذہن سازی میں بھی تعاون مل سکے، ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہو اور ادبی پیرایہ میں آسانی کے ساتھ سمجھا جانے والا کلام ہو۔ اور جس میں پڑھنے و پڑھانے والے دونوں کی دلچسپی کا بھی سامان ہو، اس کے لیے انھوں نے صرف اپنے ہی کلام کو پیش نہیں کیا بلکہ دوسرے مشہور شعرا کے کلام سے بھی طلبا کو استفادہ کا موقع دیا اور ہر نظم کے شروع میں شاعر کے نام کی بھی وضاحت کردی۔ مثلاً جس شاعر (مولوی عبدالحکیم) کے منظوم کلام سے کتاب کی ابتدا کی گئی انھیں کی دو نظمیں 'علم زندگی ہے' اور 'راستی نجات ہے' سبق 19 و 20 کی شکل میں ملتی ہیں جن میں اول الذکر نظم میں پرانے زمانے میں علم کی اہمیت و افادیت کو کسریٰ بادشاہ سے منسوب ایک واقعہ کی صورت میں نظم کیا گیا ہے اس سبق میں علم کے حوالے سے ہندوستان کی عظمت بھی ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ دوسری نظم میں حجاج بن یوسف جیسے جابر و ظالم بادشاہ کے سامنے ایک شخص کا بطور گواہ پیش ہو کر حجاج بن یوسف کی برائی کو سچائی کے ساتھ بیان کر دینے پر رہائی مل جانے کے واقعہ کو ناصحانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ چوتھا، چھٹا، چھبیسواں اور سینتالیسویں اسباق مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی نظموں کی شکل میں 'امید' 'علم کی ضرورت' 'اپنی ترقی کرو' اور 'راست گوئی' کے عنوان سے ملتے ہیں۔

پنڈت دیا شنکر نسیم کی مشہور مثنوی سے 'مرغ اسیر' اور 'ایک طلسم' کو کتاب میں جگہ دے کر طالب علموں کے ذہن کو ادب سے قریب تر کیا گیا ہے تو اردو کے دوسرے معروف مثنوی نگار میر حسن کی مثنوی میں سے ایک ٹکڑا 'داستان' کے عنوان سے دے کر اردو کے دونوں مثنوی نگاروں کے بارے میں بتانے کے لیے اساتذہ کو ذمے داری تفویض کردی ہے۔ تاکہ طلباء اردو کی اس اہم صنف کے بارے میں بھی جان سکیں اور مثنوی نگاروں سے بھی واقفیت حاصل کرسکیں۔

علاوہ ازیں آپ نے کچھ سبق آموز مختصر نظمیں قدرت صاحب کی 'عبرت' سوز کی 'حرص' میر تقی میر کی 'یاروں کا گلہ' نظیر اکبرآبادی کی 'تعریف روضہ تاج گنج' اردو ادب کے معروف شعرا آتش و انشاء کے مشہور سبق آموز اشعار کو کتاب میں جگہ دے کر بھرپور کوشش کی ہے کہ طالبان علم بامقصد علم حاصل کرکے سنجیدگی و شائستگی کے ساتھ زندگی کے عملی میدان میں داخل ہوں۔

اردو زبان کی مذکورہ پانچوں کتابوں کے مطالعے کی روشنی میں یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی ایک کامیاب مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ ملت کے نبض شناس بھی تھے۔ اس وقت کے حالات کے تناظر میں انھوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ اگر اس نوخیز نسل کی تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت نہ کی گئی تو یہ ہماری تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کے ذریعے ترتیب دیا گیا نصاب تعلیم ادب اطفال کا بیش قیمت نمونہ ہے، ہمیں یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ انیسویں صدی عیسوی کا آخری نصف اور بیسویں صدی عیسوی کا ابتدائی خراب زمانہ صرف مسلمانانِ ہند کے لیے ہی نہیں بلکہ باشندگانِ ہندوستان کے لیے انتہائی دشوار گذار زمانہ تھا، ایسے حالات میں جو افراد جہالت کے خلاف نبرد آزما ہوئے وہ لائق صد تحسین ہیں، ان حالات میں بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر کسی بامقصد کورس کو ترتیب دینا انتہائی وقت طلب کام تھا جسے مولانا محمد اسماعیل میرٹھی نے انجام دیا۔ جس کے لیے وہ عنداللہ تو اجر عظیم کے مستحق ہیں ہی عوام الناس کے شکریہ کے بھی مستحق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ہلکے پھلکے انداز میں بچوں کے ذہنوں میں جو کچھ بٹھا دیا اس نے ایک صالح معاشرہ کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت کے جن بچوں نے کھلے ذہن سے اس نصاب کو پڑھا ان کی زندگی پر اس کے اثرات مرتب ہوئے اور وہ آگے چل کر ایسے مہذب شہری بنے جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ملک و ملت کا نام روشن کیا۔

آج کے پرآشوب حالات میں جبکہ بچوں کا بچپن چھین کر انھیں ایام طفولیت میں ہی حیاباختہ اور اخلاق سوز تعلیمات کی سوغات 'علم' کے نام پر دی جارہی ہیں۔ ترقی کے نام پر تنزلی کی تمام حدود کو پار کیا جارہا ہے۔ اسمارٹ فون کے نام پر بچوں کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو برباد اور سماج میں رہنے کے طور طریقوں کو تباہ و برباد کیا جارہا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز اور اس کی حقیقتوں پر پردہ ڈال کر بچوں کو دنیا کی چکاچوند حاصل کرنے کے پرفریب دام میں الجھایا جارہا ہے ایسے وقت میں انتہائی ضروری ہے کہ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کے اس نصاب کو عام کیا جائے اور اسے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے ہندی و انگریزی میں ترجمہ کرکے نیز اس میں موجود کہانیوں و منظوم کلام کو ڈیجیٹلائز کرکے پیش کیا جائے تاکہ اس بے راہ روی کے دور میں پروان چڑھنے والی نئی نسل صرف تعلیم سے ہی نہیں بلکہ بامقصد تعلیم سے بہرہ ور ہوکر ملک و ملت کی خدمت کی اہل ہوسکے اور ادب عالیہ سے بھی مستفید ہوسکے۔

نوٹ:

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا۔

(1) 'جدید شاعری کا نقطۂ آغاز، اسماعیل میرٹھی'، ڈاکٹر شاداب علیم، شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ۔
(2) 'بچوں کے اسماعیل میرٹھی'، حکیم نعیم الدین زبیری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، 2013
(3) اردو زبان کی پہلی کتاب، مولانا محمد اسماعیل میرٹھی
(4) اردو زبان کی دوسری کتاب، مولانا محمد اسماعیل میرٹھی
(5) اردو زبان کی تیسری کتاب، مولانا محمد اسماعیل میرٹھی
(6) اردو زبان کی چوتھی کتاب، مولانا محمد اسماعیل میرٹھی
(7) اردو زبان کی پانچویں کتاب، مولانا محمد اسماعیل میرٹھی۔

■

(Dr.) Obaid Iqbal Asim
Wadeye Ismayeel
Near Masjid Ibraheem
Dhurra Mafeeh
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.:9358318995
E-mail: ubaidiqbalasim@gmail.com

حقانی القاسمی

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی اور ماحولیاتی شعور

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی (12 نومبر 1844 - 1 نومبر 1917) کے امتیازات اور اولیات پر گفتگو سے قبل چند اہم نکات اور جہات پر توجہ ضروری ہے۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے بعد ہی اردو شاعری اور نثر کی صورت اور شکل تبدیل ہوئی۔ لائٹنر (Leitner) اور کرنل ہالرائڈ (Col. Holroyd) کی کوششوں سے اردو شاعری کو نئی سمت ملی اور اردو شاعری کا ماڈرنائزیشن ہوا۔ تو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے جان گلکرسٹ کی وجہ سے اردو نثر کو نیا رخ ملا۔ اور پھر دلی کالج کے مسٹر بوترو (Felix Boutras)، اسپرنگر (Dr. Sprenger) اور ٹیلر (Francis Taylor) نے سائنسی علوم وفنون کے ترجمہ کے ذریعہ اردو زبان کو ترقی یافتہ صورت عطا کی جس کا اعتراف مولوی عبدالحق نے یوں کیا ہے کہ ''ہم اپنی زبان کو اس وقت جو ترقی یافتہ صورت میں دیکھتے ہیں تو اس پر بلا واسطہ اور بالواسطہ دہلی کالج کی تحریک کا کچھ اثر ہے۔''

اسی کالج کے اساتذہ اور فیض یافتگاں نے بقول خواجہ احمد فاروقی ''جدید نثر کے ایوان کو رفعت عطا کی'' ان میں ماسٹر رام چند قابل ذکر ہیں جو مشہور ریاضی داں تھے اور جن کی تحریروں نے اردو نثر کو ایک انقلابی رخ عطا کیا، اردو نثر کے مزاج کو تبدیل کیا۔ اسے منطقیت اور معروضیت سے روشناس کرایا۔

اردو ادب پر انگریزوں کا بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اردو ادب کا رشتہ زندگی کی موضوعیت، معروضیت اور ارتقائیت سے جوڑا اور ادب کے افادی تصور کو عام کیا۔ انجمن پنجاب کا ارتکاز مطالب مفیدہ پر تھا۔ اس طرح اردو ادب کا کینوس وسیع ہوا اور اردو ادب میں نئے خیالات اور تصورات شامل ہوتے گئے۔ پیروی مغرب سے ادب میں امکانات کے نئے دروازے کھلتے گئے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعرو شاعری جیسی معرکۃ الآرا کتاب بھی اسی پیروی مغرب کا بہترین ثمرہ ہے۔ مغربی خیالات سے ہی اردو کے ادبی تمول میں اضافہ ہوا ہے، اس کا اعتراف کھلے دل سے کیا جانا چاہیے۔ اور انگریزوں کی نیت پر شک کے بجائے اس کے مثبت نتائج

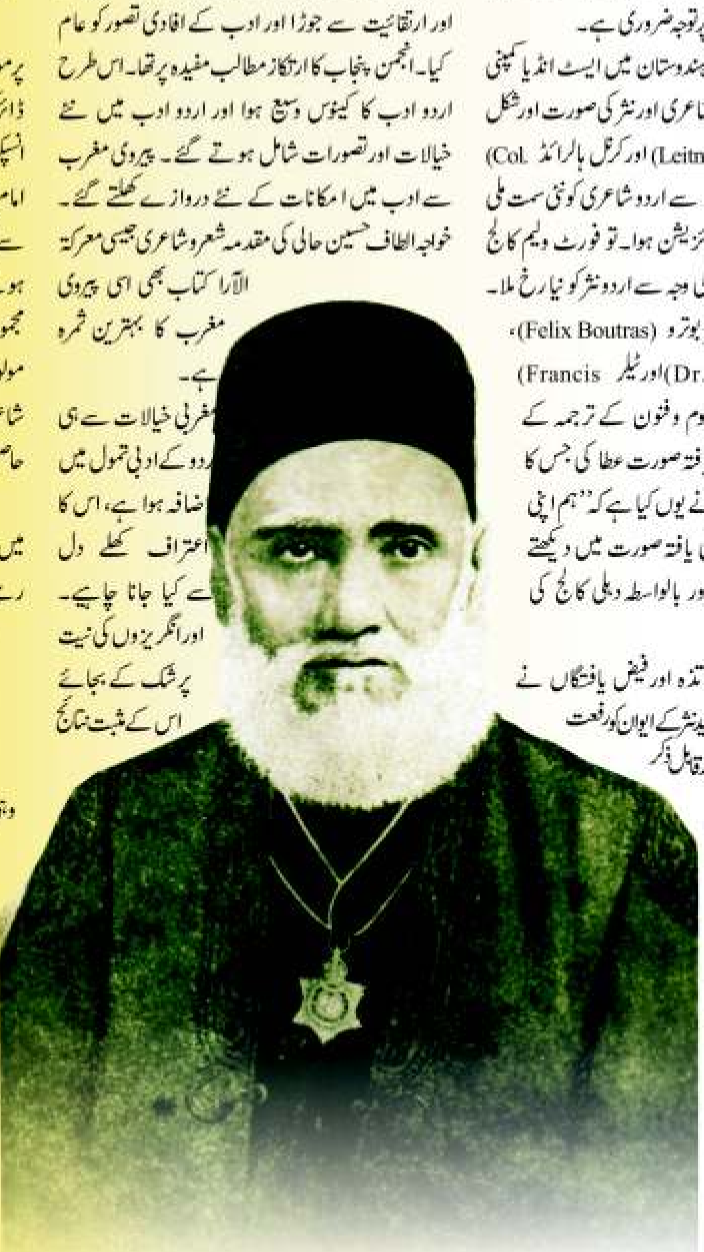

پر غور کرنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اردو اصناف ادب کو جتنی وسعتیں ملی ہیں، بیشتر مغربی ادب کی دین ہیں۔

کرنل ہالرائیڈ ناظم سرشتہ تعلیمات پنجاب کے ایما پر مولوی محمد حسین آزاد نے نظم جدید کی ترویج نہ کی ہوتی یا ڈائرکٹر سرشتہ تعلیم مسٹر کیمسن کے حکم پر مسٹرئی جے کیمن انسپکٹر مدارس سرکل میرٹھ نے مومن خاں مومن اور مولانا امام بخش صہبائی کے شاگرد غلام محمد مولا بخش قلق میرٹھی سے انگریزی کی اخلاقی نظموں کے منظوم ترجمے نہ کرائے ہوتے اور انگریزی شاعری کے اردو منظوم ترجموں کا پہلا مجموعہ جواہر منظوم (گورنمنٹ پریس الہ آباد، 1867) مولوی اسماعیل میرٹھی کی نظر سے نہ گزرا ہوتا تو کیا نظمیہ شاعری میں مولوی اسماعیل کا وہ مقام ہوتا جو آج انھیں حاصل ہے؟

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی غزل کے روایتی مضامین میں ہی الجھ کر رہ جاتے اور کچھ اس طرح کے ہی شعر کہتے رہتے۔

رقیب سر بھی پٹکتے تو میں نہ ہلتا کاش
ملا نہ بخت مجھے تیرے سنگ در کا سا
کسی کی برق تبسم جو دل میں کوند گئی
تو چشم تر کا ہوا حال ابر تر کا سا

وہی رقیب، وہی واعظ، وہی ساقی وہی ناصح ان کی شاعری میں بھی ہوتا۔ مگر 'جواہر منظوم' نے ان کے ذہن کا رخ بدل دیا اور غزلیہ شاعری سے رشتہ توڑ کر دیارِ نظم میں آگئے، جہاں غزل کی بہ نسبت زیادہ وسعت تھی۔ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے صاحبزادے اسلم سیفی نے لکھا ہے کہ:

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اس ترجمہ کو دیکھ کر استعجاب ہوا کہ شاعر ایسا کلام بھی لکھتے ہیں۔ ایک طرف دور از کار حیرت انگیز مبالغہ جو غزل اور قصیدے کی جان سمجھا جاتا تھا ادھر اس ترجمہ کا

مطالعہ ایک امر اتفاقی تھا جس نے مولانا کی طبیعت کا رخ بالکل بدل دیا۔''

طبیعت کی اسی تبدیلی کا اثر تھا کہ 'جریدہ عبرت' میں سخنوران زماں پر طنز کرتے ہوئے وہ قصیدہ کہا جو پیراڈائم شفٹ کی ایک بہترین مثال ہے کہ اس میں علماء، مشائخ، شعراء پر طنز ہے۔ اس میں سرسید اور غالب کی فکر کا پرتو ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

سوائے عشق نہیں سوجھتا انھیں مضموں
سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا اک طومار
نہ لکھتے ہیں کبھی نیرنگ حکمت و قدرت
نہ واقعات کے وہ کھینچتے ہیں نقش و نگار
مبالغہ ہے تو بے ہودہ عقل سے خارج
ہے استعارہ تو بے لطف اور دور ازکار
کیا ہے نام زٹل قافیہ کا اپنے سخن
وہ کنکری ہے جسے کہتے ہیں دُر شہوار
جو ان کے دیکھئے دیواں تو بوز کے لڈو
غلیظ و گندہ سراسر نتیجہ افکار
وہی ہے شاعر غرا جو بے تکی ہانکے
یہی ہے شعر کا اس دور میں معیار
نہ جس سے طبع کو تفریح ہو نہ دل کو خوشی
غزل ہے یا کوئی ہذیان ہے بوقت بخار

انگریزی نظموں نے مولوی اسماعیل میرٹھی کے ذہن اور دل کی دنیا ہی بدل دی، اتنا گہرا اثر ہوا کہ انھوں نے خود چھ انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کیے جو ان کی 45 نظموں کے مجموعہ 'ریزہ جواہر' میں شامل ہیں۔ کیڑا، ایک قانع مفلس، موت کی گھڑی، فادر ولیم، حب وطن، انسان کی خام خیالی۔ یہ انگریزی کی 6 سبق آموز اخلاقی نظموں کے ترجمے ہیں جس کی تحریک انگریزی نظموں کے مزاج اور موضوع سے ملی۔ اس طرح نظم جدید سے جڑنے کا سہرا انگریزی شاعری کے سر ہے۔ اس کی روشنی میں مولوی اسماعیل میرٹھی نے اردو کی نظمیہ شاعری کو کیا نئے امکانات عطا کیے اور ان کے امتیازات کیا ہیں اس پر گفتگو بعد میں ہوگی۔

پہلے ایک اور اہم نکتہ پر توجہ ضروری ہے جس سے مولوی اسماعیل کی شخصیت اور فکر کی تفہیم میں مدد مل سکتی ہے۔ اور وہ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے آبا و اجداد مغل حکمراں ظہیر الدین محمد بابر کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے۔ یہاں انھیں منصب اور جاگیریں بھی دی گئی تھیں۔ مغل حکمرانوں سے ان کے خاندان کی گہری وابستگی رہی ہے۔ قصبہ لاوڑ میرٹھ کی جاگیر بھی مغلوں کی عطا کردہ تھی، ان کے خاندان پر مغلوں کے بڑے احسانات ہیں اور مولوی اسماعیل میرٹھی 1857 کی پہلی جنگ آزادی جسے غدر کا نام دیا جاتا ہے سے تقریباً 13 سال قبل 12 نومبر 1844 کو پیدا ہوئے، اور انھوں نے اپنی معصوم آنکھوں سے غدر کا منظر بھی دیکھا اور اس میرٹھ میں دیکھا جس نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ مغلوں کے احسانات کا تقاضا یہ تھا کہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی انگریزوں سے نفرت کرتے، ان کے قائم کردہ عصری اسکولوں سے اجتناب برتتے اور سرکاری ملازمت سے باز رہتے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے سررشتہ تعلیم میرٹھ میں کلرک کی ملازمت کی اور پھر سرکاری اسکولوں میں ہی مدرسی اور معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ سینٹرل نارمل اسکول آگرہ سے پنشن حاصل کر کے میرٹھ میں مقیم ہو گئے۔

شاید سرسید کی طرح مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ مزاحمت سے مشکلیں بڑھتی ہیں اور مفاہمت سے راہیں کھلتی ہیں۔ اسی لیے انھوں نے دقیانوسی سماج کے دو اینٹی ہیرو غالب اور سرسید کی طرح انگریزی حکومت کو باعث خیر و برکت جانا۔ یہاں مولوی اسماعیل میرٹھی اور سرسید احمد کی مخلوط وفاداری Mixed Loyal ty کے حوالے سے کچھ لوگ نکتہ چینی کر سکتے ہیں کہ سرسید کا خانوادہ بھی مغلیہ دربار سے وابستہ رہا ہے اور سرسید کو مغلیہ دربار سے عارف جنگ جوادالدولہ کے خطابات بھی ملے تھے اور انگریزوں نے بھی انھیں کئی خطابات دیے۔ آخر وفاداری کی اس تبدیلی کے اسباب کیا ہیں؟

میرے خیال میں ہندوستانی سیاست پر برطانوی اقتدار کے منفی اثرات ضرور پڑے ہوں گے مگر تعلیم اور تخلیق پر اس کے مثبت اور صحت مند اثرات بھی سامنے آئے، اسی وجہ سے سرسید اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے دوراندیشی اور حکمت عملی کے تحت انگریزوں کے تئیں اپنا رخ بدلا اور انگریزی اقتدار کی حمایت کی۔ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی ایک رباعی میں کہتے ہیں۔

لاکھوں چیزیں بنا کر بھیجے انگریز
سب کرتے ہیں دندان ہوس اس پر تیز
چڑتے ہیں مگر علوم انگریز سے
گڑ کھاتے ہیں اور گلگلوں سے پرہیز

انھوں نے انگریزی اقتدار کی مدح میں قصیدے بھی لکھے ہیں۔ ان کا ایک قصیدہ تہنیت سالگرہ حضور ملکہ معظمہ فیض ہند دام اقبالہا ہے۔ 'تہنیت جشن جوبلی حضور ملکہ معظمہ وکٹوریہ قیصر ہند' کے عنوان سے بھی ایک قصیدہ ہے جس میں انھوں نے برطانوی حکومت کی بہت تعریف کی ہے، اقدامات علم و امن کی ستائش کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

میرے خیال میں ہندوستانی سیاست پر برطانوی اقتدار کے منفی اثرات ضرور پڑے ہوں گے مگر تعلیم اور تخلیق پر اس کے مثبت اور صحت مند اثرات بھی سامنے آئے. اسی وجہ سے سرسید اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے دوراندیشی اور حکمت عملی کے تحت انگریزوں کے تئیں اپنا رخ بدلا اور انگریزی اقتدار کی حمایت کی۔

عہد دولت سے ترے پائی دلوں نے تسکیں
سکہ زر کی طرح چل گیا تیرا قرطاس
ہیں ہنر تیرے زمانے کے بغایت روشن
روغن و موم کی جا جلنے لگی برق اور گیاس
تار کے سامنے یکساں ہے نہ کچھ دیر نہ جلد
ریل کے آگے برابر ہے نہ کچھ دور نہ پاس
گاؤں در گاؤں ہوئیں علم کی نہریں جاری
اوکھ سے پینے لگے جن کو لگی زور کی پیاس
فیض تعلیم سے عالم ہوئے جاہل ہندی
کوئی عالم کوئی منشی تو کوئی حرف شناس
دم بدم ابر ترقی ہوا گوہر افشاں
کوئی ایف اے کوئی بی اے کوئی ایم اے پاس
دور شاہی نے ترے ان کو بنایا انساں
جن میں کھانے کا سلیقہ تھا نہ تمیز لباس
جشن جوبلی کا ہوا غلغلہ برپا گھر گھر
خیر سے تخت نشینی کو ہوئے سال پچاس
تیری دولت کی دعائیں ہے دلوں سے جاری
جیسے گنگوتری کے چشمے سے گنگا کا نکاس

ایک اور قصیدہ نوید مقدم شاہی کے عنوان سے ہے جس میں انھوں نے جارج پنجم کی ہندوستان آمد کو بہار بوستاں سے تعبیر کیا ہے اور ترقی ملک کے لیے حکومت برطانیہ کے اقدامات کی ستائش کی ہے۔

علم و دانش کے لیے دریا رواں
ریگ زاروں کو بنایا لالہ زار
عرض و طول ملک میں پھیلا دیے
مثل شریان و عصب ریل اور تار
کیا زراعت کیا تجارت کیا ہنر
سب پھلے پھولے نکالے برگ و بار

ایک اور مخمس 'خدا قیصرۃ الہند کو سلامت رکھے' کے عنوان سے ہے:

عیش و طرب کے ہیں یہاں چہچہے
کون بھلا جبر کسی کا سہے
کیوں نہ تہہ دل سے رعایا کہے
جب تک اس اقلیم میں گنگا بہے
قیصرۃ الہند سلامت رہے

ہند کا اس عہد میں بدلا مزاج
عدل نے اس دور میں پایا رواج
جملہ مفاسد کا ہوا ہے علاج
سب کی تمنا ہے کہ باتخت و تاج
قیصرۃ الہند سلامت رہے

بس کہ رعایا پہ ہے وہ مہرباں
کرتی رعایا ہے نثار اس پہ جاں
شرق سے تا غرب کراں تا کراں
ملک اس آہنگ میں ہے نغمہ خواں
قیصرۃ الہند سلامت رہے

قوم کی عمومی روش اور موروثی روایت سے یہی انحراف ان کی نظمیہ شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ مولوی اسماعیل میرٹھی ایک روایت شکن اور انحرافی ذہن کے حامل تھے، اور اسی انحراف نے انھیں اردو شاعری میں انفراد، امتیاز اور اعتبار عطا کیا۔

مولوی اسماعیل میرٹھی نے قصیدے لکھے تو اس کے روایتی عناصر ترکیبی سے انحراف کیا، تشبیہ کے عنصر کو بھی مکمل طور پر خارج کر دیا، اسی طرح غزل میں بھی مطلع اور مقطع کا التزام نہ رکھا جب کہ وہ قادر الکلام شاعر تھے، مطلع اور مقطع ان کے لیے بڑی بات نہ تھی کہ اپنے برادر نسبتی شیخ قمرالدین رسالدار کو مشاعرہ میں پڑھنے کے لیے جو غزلیں دیتے تھے اس میں قمر تخلص کا التزام ہوتا تھا۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے مختلف شعری اصناف کی مروجہ اور مقررہ ہیئتوں سے بھی انحراف کیا ہے۔ رباعیات اور قطعات میں بھی ہیئتوں کی پابندی نہیں کی۔ مردف، چہار قوافی اور سہ قوافی رباعیاں لکھیں۔ جدید نظم میں آزاد اور حالی کی طرح صرف مثنوی اور مسدس نہیں بلکہ مثلث، مربع، مخمس، مثمن اور ترجیع بند جیسی ہیئتوں کا استعمال کیا۔ انہوں نے جدید نظم میں بہت سے ہیئتی تجربے کیے ہیں۔ نظم معری بھی انہی کی ایجاد و اختراع ہے جو انگریزی میں بلینک ورس اور اردو میں نظم غیر مقفی، نظم بے قافیہ کے نام سے معروف ہے۔ جس میں انگریزی کے برعکس قافیہ تو نہیں ہوتا مگر بحر ہوتی ہے۔ تاروں بھری رات اور چڑیا کے بچے نظم معری کی عمدہ مثال ہیں۔

ارے چھوٹے چھوٹے تارو
کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہووے
مجھے کس طرح تحیر
کہ تم اونچے آسماں پر
جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے
کہ کس نے جڑ دیے ہیں
گہر اور لعل گویا

(تاروں بھری رات)

یہ شاید Twinkle Twinkle Little Star کا ترجمہ ہے۔

جدید نظم کے ذیل میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے جو ہیئتی تجربے کیے ہیں، وہ قابل قدر ہیں۔ اس تعلق سے ممتاز ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ کی یہ رائے بہت اہم اور فکر انگیز ہے کہ" مولوی اسماعیل میرٹھی کا شمار جدید نظم کے ہیئتی تجربوں کے بنیاد گزاروں میں ہونا چاہیے۔"

مولوی محمد اسماعیل نے ہی ابیات سے متعارف کرایا، عیدیاں اور شب براتیاں جیسے تجربے کیے۔ ان کے ابیات میں

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ
اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

اور

بد کی صحبت میں مت بیٹھو بد کا ہے انجام برا
بد نہ بنے تو بد کہلائے بد اچھا بدنام برا

زبان زد خاص و عام ہیں۔

اسی طرح ان کے قطعات میں

ملے خشک روٹی جو آزاد ہو کر
وہ ہے خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے اور مقبول عام و خاص ہے۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے یہاں ہیئت کی سطح پر جہاں تنوع ہے وہیں ان کا موضوعی کینوس بھی کم وسیع نہیں ہے۔ زمین و زماں، مکین و مکاں کے بہت سے مسائل ان کی شاعری کا حصہ بنے ہیں۔ تصوف، تعلیم اور ترقی کے موضوعات بھی ان کی شاعری میں ہیں اور ان کے متن کا ایک معتد بہ حصہ ماحولیات پر بھی محیط ہے۔ فرد اور فطرت کے مابین حیاتیاتی رشتے کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ زمین اور اس کے متعلقات سے ان کی شاعری جڑی ہوئی ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں ہیں جن سے ان کے زمینی اور ماحولیاتی شعور کا ادراک کیا جا سکتا ہے نوائے زمستان، جاڑا اور گرمی، مثنوی آب زلال، کوہ ہمالہ وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں جو ارض مرکوز ہیں۔

اسی کے دم سے دنیا میں تری ہے
اسی کی چاہ سے کھیتی ہری ہے
ہر اک ریشے میں ہے اس کی رسائی
غذا ہے جڑ سے کونپل تک چڑھائی
پھلوں کا ہے اسی سے تازہ چہرہ
اسی کے سر پہ ہے پھولوں کا سہرہ

پانی، پہاڑ، ہوا یہ سب زمینی تلازمات ہیں۔ دشت و کہسار، سبزہ و گل یہ سب ماحولیات سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے متن کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جس کا ماحولیاتی تنقید (Eco criticism) کے تناظر میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ماحولیاتی تنقید میں دیہی مناظر اور مظاہر بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اور مولانا کی بہت سی نظمیں دیہی تناظر میں ہیں۔ کاشت کاری، ساون کی جھڑی ایسی ہی نظمیں ہیں۔ اور ان کے اس پہلو کو کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر ناقد نے بھی سراہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ" جو چیز ان کو ذکر کا مستحق بناتی ہے، وہ ان کی دیہی شاعری ہے۔"

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا ماحولیات مرکوز شاعری کا مطالعہ Ecological perspective میں کیا جائے تو بہت سی نئی طرفیں سامنے آئیں گی۔ یہ فطرت سے مربوط شاعری ہے۔ جس میں فطرت کے تئیں انسان کے رویے کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

انساں بخلاف حکم قدرت
کرتا ہے خیال ترک فطرت

یہ اس وقت کی شاعری ہے جب نہ تو ماحولیات گمبھیر مسئلہ

تھا اور نہ ہی تحفظ ماحولیات کی تنظیمیں اور ادارے قائم تھے اور نہ Literature and ecology جیسے مطالعات سامنے آئے تھے۔ Social Ecology اور Deep ecology کی بحث بھی نہیں چھڑی تھی۔ اس دور میں بھی اسماعیل میرٹھی کا ماحولیاتی شعور بہت بالیدہ تھا۔ ان کی نثری تحریروں میں بھی ماحولیات سے جڑے ہوئے مضامین ملتے ہیں۔ آج کی ماحولیاتی تنقید کے لیے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے تخلیقی متون میں بیش بہا مواد ہے۔ انھوں نے قدرت کے فطری وسائل و ذرائع کے حوالے سے جو شعر کہے ہیں، آج کے ماحولیاتی بحران کے عہد میں ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

دراصل مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے فطرت پر اس لیے زیادہ زور دیا ہے کہ فطرت ہی اخلاقی اقدار اور آداب زندگی کی تشکیل کرتی ہے۔ ان کی شاعری دراصل Poetry of Earth ہے جس کے بارے میں کیٹس نے کہا تھا کہ

"The Poetry of earth is never dead"

زلزلوں اور قیامتوں کے باوجود زمین اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے اور وہ شاعری جو زمین سے جڑی ہوتی ہو، وہ ذہنوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ زمین کی جمالیاتی قدر کو مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے اپنی شاعری میں بہت ہنرمندی اور فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری سے صدیوں بعد بھی ذہنوں کا رشتہ قائم ہے۔

ہیئت اور موضوع ہی نہیں بلکہ لسان کی سطح پر بھی ان کے ہاں بہت سے نئے تجربے ملتے ہیں۔ لسانی استراجیت یا Code Mixing کے علاوہ ان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ لسانی یا لفظی اشرافیت کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے سرسید احمد خاں کے زیر اثر اشرافیہ ذہن کی لسانی حد بندی سے گریز کیا ہے اور لفظ کے ترسیلی جوہر کو ہی مدنظر رکھا ہے کہ بسا اوقات اشرافی الفاظ جذبہ و احساس کی صحیح طور پر ترسیل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنے قصائد اور نظموں میں دیہی الفاظ

> **مولوی اسماعیل میرٹھی جامع کمالات تھے۔ اور ان کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ اردو ادب کا ایک ناقابل فراموش کردار ہیں۔ جب تک اردو زبان و ادب کے چراغ جل رہے ہیں، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا نام اردو کے افق پر روشن رہے گا۔ لوح مزار پر ان کا نام کندہ رہے یا نہ رہے لوح ذہن پر مولوی اسماعیل میرٹھی کا نام ہمیشہ زندہ اور محفوظ رہے گا۔**

، محاوروں اور روزمرہ کا استعمال کیا ہے۔ اور زبان کے باب میں سماج کی سطح اور ساخت کا بھی خیال رکھا ہے۔ اور جس معاشرہ یا طبقہ سے ان کا تخاطب ہے ان کے وضع کردہ لسانی نظام کو ہی ترجیح دی ہے۔ ان کے نزدیک ہر لفظ اپنے معنی کی ترسیل میں خود مکتفی اور آزاد ہے۔ جدید لسانیات کے نقطہ نظر سے بھی مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی شاعری کا مطالعہ سود مند ثابت ہوسکتا ہے۔ اور ہماری سنگتی سنکرتی فرہنگ میں بہت سے الفاظ کا اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔

مولوی محمد اسماعیل کی شاعری میں بڑی وسعتیں اور امکانات ہیں۔ ان کی نظموں کا نیا قاری مختلف تنقیدی طریق کار سے ان کا مطالعہ کرسکتا ہے۔ مارکسی اور مابعد جدید تنقیدی طریق کار سے بھی ان کے شعری متون کی تفہیم ممکن ہے کیوں کہ جہاں انھوں نے اپنی نظموں میں مزدوروں اور کسانوں کا کرب بیان کیا ہے وہیں حاشیائی طبقات کے مسائل اور ثقافتی جڑوں سے وابستگی اور مقامیت کے عناصر بھی ان کی شاعری میں ہیں۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی صرف شاعر ہی نہیں، اعلیٰ پایہ کے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثر کا نمونہ، تذکرہ غوثیہ، ہے جو ان کے مرشد غوث علی شاہ پانی پتی کے ارشادات پر محیط ہے۔ اس میں تصوف اور کشف کے مسائل ہیں۔ اس کتاب پر گوکہ سید گل حسن شاہ کا نام درج ہے مگر داخلی شواہد سے اس کی تصدیق ہو چکی ہے کہ یہ مولوی اسماعیل میرٹھی کی تصنیف ہے۔ امیر خسرو کی مثنوی قران السعدین کا مقدمہ بھی ان کی نثر اور گہری تنقیدی بصیرت کا عمدہ نمونہ ہے۔ غیر مطبوعہ تصانیف میں حیات امیر خسرو کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب مکمل ہوگئی ہوتی تو خسرو شناسی میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتا۔ اس کے مجوزہ خاکہ سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ منشی ذکاء اللہ کی مبادی الانشاء پر ان کا تبصرہ بھی ان کی علمیت اور بہترین نثر کا ثبوت ہے۔

اردو کی نصابی کتابوں کی تدوین و تالیف بھی ان کا اہم کارنامہ ہے۔ اردو زبان کا قاعدہ، اردو کی پہلی دوسری تیسری چوتھی اور پانچویں کتاب اور ترک اردو، سفینہ اردو، کمک اردو جیسے ریڈر بہت اہم ہیں کہ ان کی تعریف علمائے ادب نے کی ہے۔ ان کتابوں نے کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے۔ زبان کے فروغ میں ان کتابوں کا کردار بہت نمایاں ہے۔ مولوی اسماعیل میرٹھی نے بچوں کی نفسیات کے پیش نظر ہوئے درسی کتابوں کی تشکیل کی ہے اور وہی موضوعات منتخب کیے ہیں جو بچوں کی دلچسپی کے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کے مرتب کردہ ان ثقافتی بیانیوں سے بچہ بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ انھوں نے بچوں کو ان کتابوں کے ذریعہ تخلیقی کلچر سے جوڑنے کا کام کیا ہے۔ تاریخی، اخلاقی، زراعتی اور حفظان صحت، سائنس جغرافیہ جیسے اہم موضوعات کو ان کتابوں میں سمیٹا ہے۔

صحیح معنوں میں مولوی اسماعیل میرٹھی معمار اور محسن اردو ہیں جنھوں نے ہر ذہن میں اردو کی شمع روشن کی ہے۔

انھوں نے بچوں کا عمدہ شعری ادب تخلیق کیا ہے۔ کتے، بلی اونٹ، کوا، شیر اور دیگر چرند پرند کے علاوہ دال اور چپاتی، دال کی فریاد، پن چکی جیسی نظمیں لکھی ہیں جو بچوں کے لیے بہت معنی خیز ہیں۔ انھوں نے چرند پرند کے اتنے اوصاف بیان کیے ہیں کہ Biocent ric equality کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

ان کی سب سے مشہور نظم گائے ہے جو شاید ہر ایک کی زبان پر ہوگی کہ

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

کسی اور چرند پرند کا ذکر کرتے ہوئے مولوی اسماعیل میرٹھی نے شاید ہی رب کا شکر ادا کیا ہے مگر گائے کا ذکر کرتے ہوئے بطور خاص خدا کا شکر ادا کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک گائے کتنی مقدس اور معصوم ہے۔

بچوں کے ادب میں اسماعیل میرٹھی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی شخصیت کے اس رخ کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ وہ صرف بچوں کے ادیب بنا دیے گئے جب کہ بڑوں کے لیے بھی ان کی خدمات کم اہم نہیں ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بہت صحیح بات کہی ہے کہ ''اسماعیل کو صرف بچوں کا شاعر سمجھنا ایک ادبی اور تاریخی غلطی ہے جس کی اصلاح ہونی چاہیے۔''

مولوی اسماعیل میرٹھی جامع کمالات تھے۔ اور ان کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ اردو ادب کا ایک ناقابل فراموش کردار ہیں۔ جب تک اردو زبان و ادب کے چراغ جل رہے ہیں، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا نام اردو کے افق پر روشن رہے گا۔ لوح مزار پر ان کا نام کندہ رہے یا نہ رہے لوح ذہن پر مولوی اسماعیل میرٹھی کا نام ہمیشہ زندہ اور محفوظ رہے گا۔

اس مضمون کی ترتیب و تشکیل میں ڈاکٹر سیفی پریمی اور ڈاکٹر شاداب علیم کی تحقیقی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کے باب میں یہ دونوں کتابیں بہت اہم ہیں۔

■

Haqqani Al-Qasmi
Mob.: 9891726444
haqqanialqasmi@gmail.com

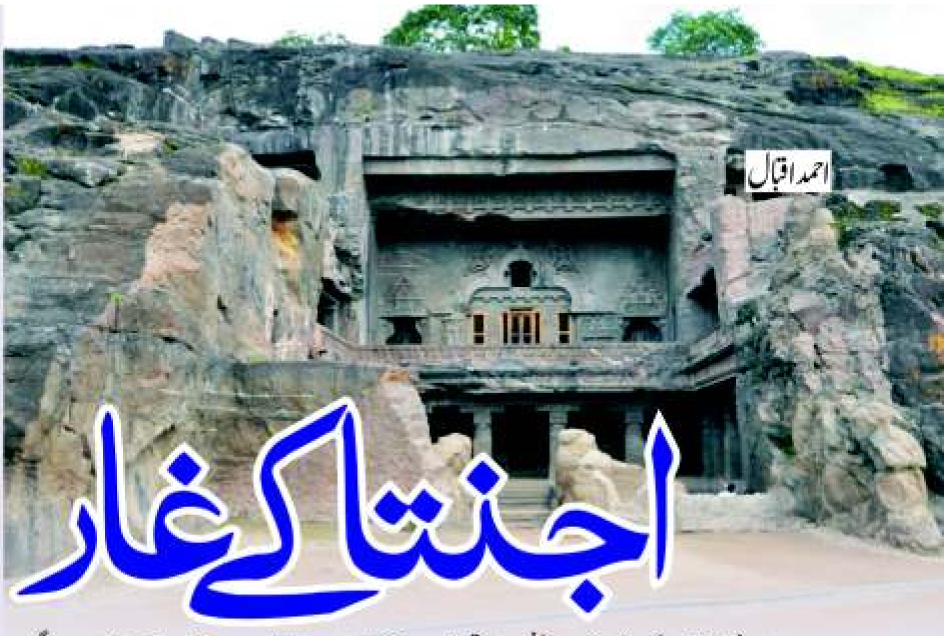

اجنتا کے غار

احمد اقبال

مہاراشٹر کا شہر اورنگ آباد ایک تاریخی و سیاحتی شہر ہے۔ اندرون شہر کئی قدیم عمارتیں اور آثار ہیں جیسے دکن کا تاج (بی بی کا مقبرہ)، پن چکی، فصیل شہر، تاریخی دروازے، ملک عنبرؒ اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد کی عمارتیں، سنہری محل، نپٹ نرنجن کی سادھی اور اورنگ آباد کے غار وغیرہ۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق ضلع اورنگ آباد میں جس قدر غار اور مورتیاں ہیں، شاید پورے بھارت میں نہیں ہوں گی۔ ایک اندازے کے مطابق غاروں کی تعداد ایک (100) سو ہے۔

بیرون شہر جانب مغرب قلعہ دولت آباد، خلد آباد اور فن سنگ تراشی کے شاہ کار ایلورہ کے غار واقع ہیں۔ جانب شمال شہرہ آفاق اجنتا کے غار ہیں جنھیں World Heritage Monuments کا درجہ حاصل ہے۔

اجنتا کے عالمی شہرت یافتہ غار، بدھ مت کی بولتی تاریخ ہے گوتم بدھ کے ماننے والوں نے ان کی زندگی اور تعلیمات کو تصاویر کی شکل میں غاروں کی دیواروں پر تحریر کیا ہے۔

اجنتا، ہندوستان کا وہ چھوٹا سا گاؤں ہے جو ساری دنیا کے سیاحوں، مداحوں اور ماہرین آثار قدیمہ کی توجہ کا مرکز ہے۔ ان غاروں کی قدامت کا اندازہ چینی سیاح ہیون سانگ اور فاہیان کے سفرناموں سے بھی ہوتا ہے۔ سطح مرتفع دکن میں واقع یہ غار انسانی ہاتھوں کی کاری گری اور محنت شاقہ کا بے مثال کارنامہ ہے۔ ان میں سب سے پرانے غار تو وہ ہیں جو تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل بنائے گئے تھے اور کچھ غار چھٹی صدی عیسوی میں تراشے گئے ہیں۔ اس طرح ان غاروں کو تراشنے میں اندازاً کئی نسلوں نے اپنے خون جگر کا نذرانہ پیش کرکے تصاویر اور سنگ تراشی کے ذریعہ مہاتما گوتم بدھ کو دنیا کے سامنے پھر سے لا کھڑا کیا ہے۔ اجنتا کے یہ فن کار نباتات اور جمادات کی مدد سے رنگ خود تیار کرتے اور ان رنگوں کے فنکارانہ استعمال سے واقف تھے۔ تصاویر اور رنگوں کے امتزاج کی گہرائی سے جانچ کرنے پر یہ بھی پتہ چلا ہے کہ رنگوں کی تیاری میں ایسی اشیاء کا استعمال کرتے تھے جن میں نیلا توتیا (کاپر سلفیٹ) اور آیوڈین بھی پائی جاتی تھیں۔ اجنتا کے یہ ماہرین فن بڑے حساس، جدت پسند، اختراعی اور سائنٹفک ذہن کے مالک ہی نہ تھے بلکہ کشش ثقل اور علم ہندسہ کے بارے میں بھی اچھی خاصی معلومات رکھتے تھے۔ زاویے، قوسین، دائرے، فاصلے، طول و عرض، حجم اور Light & Shed کا استعمال بڑی مہارت سے کرتے تھے۔ ان کا مشاہدہ، شاعرانہ مزاج اور ذوق جمال بھی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا جیسے کوئی غیبی طاقت ان کی مددگار رہی ہو۔ ان غاروں میں کچھ تصاویر ایسی بھی ہیں جنھیں ہم آج کی دنیا میں دیکھتے ہیں جیسے فولڈنگ ٹیبل، ایک کرسی جس پر ہیٹ اور ٹائی پہنے غیر ملکی سیاح بیٹھا ہے۔

اجنتا کے غار جن لوگوں نے دیکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان غاروں میں آج کل الیکٹریسٹی کا استعمال ہوتا ہے جبکہ صدیوں پہلے بدھ بھکشوؤں نے روشنی کے حصول کے لیے ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا وہ یہ کہ غاروں کے منہ پر صیقل شدہ فولادی چادریں رکھ دی جاتیں جب ان پر سورج کی روشنی پڑتی تو اس کا عکس غاروں کے اندر پڑتا۔ یہی نہیں، اندرونی حصوں میں بھی اسی طرح کی چادریں رکھ دی جاتیں تاکہ کام میں آسانی ہو۔ مشعلیں بھی استعمال کی جاسکتی تھیں لیکن دھوئیں سے تصاویر کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ علاقے کے قدیم راجاؤں نے جو خود بھی بدھ مذہب کے پیروکار تھے اس کام کے لیے اعلیٰ درجے کے فنکاروں کی سرپرستی کی تھی۔ یہ سلسلہ صدیوں پر محیط ہے۔

اجنتا کے غار اورنگ آباد سے ایک سو دس کلومیٹر اور جلگاؤں سے پچپن کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں۔ ہوائی اور ریل کا رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے صرف سڑک کے ذریعہ پہنچا جاسکتا ہے۔ دور و نزدیک کے سیاح علی الصبح پہنچ جاتے ہیں۔ محکمہ سیاحت نے غاروں سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر ایک خوبصورت ٹورسٹ اسپاٹ T. Point کی شکل میں ڈیولپ کیا ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں سے دوربین کی مدد سے ان غاروں کو دریافت کیا گیا تھا۔ یہاں سے CNG کی AC اور Non-AC بسوں کے ذریعہ غاروں تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اخباری رپورٹ کے مطابق محکمہ ایس ٹی کو سالانہ لاکھوں روپیوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ سیاحوں کو مختلف سہولتیں دی جاتی ہیں جس کے لیے فیس یا Tax کے نام پر اچھی خاصی رقم وصول کی جاتی ہے۔ ملکی لوگوں سے داخلہ فیس چالیس روپئے اور غیر ملکیوں سے چھ سو پچاس روپے یا اس کے مساوی ڈالر لیے جاتے ہیں۔ کیمرے سے تصویر کشی ممنوع ہے۔

اجنتا کے غار اجنتا رینج پہاڑی سلسلے میں واقع ہیں۔ ان پتھروں کو Valcanic یا Amedgalight Hinyadri کہتے ہیں۔ ان گہرے سیاہ پتھروں کی خاص بات یہ ہے کہ آسانی سے تراشے جانے والے ہوتے ہیں۔ ان کے ریشے ایک دوسرے سے پیوست اور پرت در پرت والی چٹانوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے شلپ کاروں نے ان کا انتخاب کیا۔ بدھ مت کے عروج کے زمانے میں یہ غار مکمل ہوئے۔

کہتے ہیں زمانہ سدا ایک حال پر نہیں رہتا۔ آخر وہ وقت بھی آیا جب برہمن مت کو فروغ ہونے لگا اور بدھ مت کے ماننے والوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ ڈر اور خوف کی وجہ سے لوگوں کا ترک مقام بھی یہاں تک کہ کوئی بدھ مت کا نام لیوا بھی باقی نہ رہا۔ سیکڑوں برس بیت گئے لوگ بھول گئے کہ یہ علاقہ کبھی بدھ مذہب کا ایک بڑا مرکز بھی تھا۔

اجنتا کے ان غاروں کی بازیافت نواب سکندر جاہ آصف ثالث کے عہد میں ہوئی۔ مشہور ہے کہ کچھ شکاری اس مقام سے گزر رہے تھے۔ یہاں انھیں کچھ غار نظر آئے۔ اندر انھیں بڑی خوبصورت تصاویر اور مورتیاں نظر آئیں وہ حیران رہ گئے۔ اس بات کی اطلاع ایسٹ انڈیا کمپنی کو دی گئی اور کمپنی نے غاروں کو محفوظ کرنے کے اقدامات کیے۔ تصاویر کی نقل کاری کی تیاری کا کام شروع ہوا۔ یہ ذمہ داری میجر گل کو دی گئی تھی۔

1885 میں ایک کتاب 'اجنتا میں بدھ مت کے غاروں کی تصاویر' شائع کی گئی۔ دلچسپی رکھنے والوں نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہیں سے یورپی سیاحوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔

1924 میں آصف سابع میر عثمان علی خان بہادر کے حکم پر مولوی غلام یزدانی صاحب کو ناظم آثار قدیمہ بنا کر اورنگ آباد بھیجا گیا۔ جب انھوں نے یہاں کا انتظام سنبھالا اس وقت غاروں میں غلاظت بھری پڑی تھی۔ چھت سے پانی ٹپکتا تھا، غاروں میں نمی تھی، حشرات الارض نے غاروں کو اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس جانب خصوصی توجہ دی۔ مٹی ہٹا کر صفائی کروائی گئی۔ غار نمبر ایک سے انتیس تک راستہ تعمیر کیا گیا۔ قریب ترین فرداپوری سڑک کی مرمت کروائی گئی۔ ان بنیادی کاموں کے ساتھ ساتھ گیارہ اہم تصاویر کی نقول جرمنی میں چھپوانے کے لیے بھجوائی گئیں۔ 1934 میں یزدانی صاحب کا یہ کارنامہ منظر عام پر آیا۔ اجنتا پر اردو زبان میں شائع ہونے والی یہ اولین کتاب تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان بھر میں رنگین تصاویر کی چھپائی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان گیارہ رنگین تصاویر کی فہرست اس طرح ہے:

1۔ محل کے دروازے پر کھڑا بھکشو (دراصل خود گوتم بدھ ہیں)
2۔ محل کا منظر
3۔ محل کے اندر رقص و سرور کا منظر
4۔ بدھی ستوا پدما پانی
5۔ بدھی ستوا اولوکیشور
6۔ زیورات پہنے ہوئے کالی رانی
7۔ شہزادی ماپابوگ (کالی رانی)
8۔ ایرن وتی
9۔ ہیلوں کی لڑائی کا ایک منظر
10۔ 11۔ چھت پر بنی دو تصاویر

یزدانی صاحب نے اپنے معاونین کی مدد سے جو خدمات انجام دی ہیں ان میں سیاحوں کے لیے خصوصی کیمپ، گیسٹ ہاؤس، پانی کی فراہمی وغیرہ بنیادی کام شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے دست راست مولوی خان بہادر سید احمد کی خدمات بھی لائق ذکر ہیں۔ یہ وہی خان بہادر سید احمد صاحب ہیں جنھوں نے انجمن اشاعت تعلیم کو اورنگ آباد کے محلے بڈی لین کا اپنا ذاتی وسیع اور رہائشی گھر بہت معمولی قیمت پر لڑکیوں کے اسکول کے لیے انجمن کو دیا تھا جہاں آج کل ضیاء العلوم گرلس ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج جاری ہے۔

میر عثمان علی خان والی دکن کی فیاضانہ امداد سے آج اجنتا دنیا کے نقشے پر نظر آ رہا ہے۔ اہل وطن کو چاہیے کہ وہ ان کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کریں کیونکہ انھوں نے اجنتا کے غاروں کو منظر عام پر لانے کے لیے ذاتی طور پر دلچسپی لی تھی۔ حالانکہ جنگ عظیم اول کی تباہ کاریوں سے دنیا دوچار ہو چکی تھی۔ ہر طرف خوف اور خاموشی چھائی ہوئی تھی حیدرآباد میں بظاہر اطمینان کی فضا تھی۔ علم دوستی اور فن پروری کے لیے والی دکن نے جو کچھ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ 1914 میں ہی فن مصوری کی ایک دلدادہ خاتون Lady Herringhan جب اجنتا آئیں تو ان کا حکومت وقت کی طرف سے نہ صرف استقبال کیا گیا بلکہ ان کی رہائش و آرام کا خصوصی انتظام کیا گیا۔ اس عمل سے دکن کی تہذیبی روایات اور خواتین کے ساتھ احترام کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مصوری کے ان شاہکاروں کی دیکھ بھال اور ان کی نقول بنانے کے لیے جرمنی، فرانس، اٹلی وغیرہ یورپین ممالک سے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مصوری سے دلچسپی رکھنے والے مقامی لوگوں کو بھی اس کام میں لگایا گیا تاکہ بعد میں غیر ملکی ماہرین کی محتاجی نہ رہے اور یہ سب کچھ بادشاہ وقت میر عثمان علی خان کی خاص ہدایت پر ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں مصوری سکھانے کے لیے آرٹ اسکول قائم ہونے لگے۔ بمبئی کا مشہور جے جے کالج آف آرٹ تقریباً اسی زمانے میں قائم ہوا۔

دن گزرتے گئے۔ نظام حکومت نے کام کو آگے بڑھایا۔ مزید تصاویر کی نقول کروائیں۔ ماہرین فن نے اجنتا کی تصاویر کا بغور مطالعہ کیا۔ ان میں گوتم بدھ کی زندگی کی تلاش کی۔ ان تصاویر کا آپسی تعلق دریافت کیا گیا۔ گوتم بدھ کے بارے میں آج جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ ان ہی تصاویر کا مرہون منت ہے اور غالباً ان مصوروں کا اصل مقصد یہی تھا کہ آنے والے زمانے میں لوگ ان تصاویر کی مدد سے گوتم بدھ کی حیات اور تعلیمات کے بارے میں جان سکیں۔

ابتدا میں آرٹ کے ان نمونوں کو فنی نقطہ نظر سے دیکھا گیا لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے ان میں مذہبی پہلو بھی در آیا۔

بہرحال اجنتا کی مصوری کے ان شاہکار نمونوں کو دیکھ کر ان کے بنانے والوں کی ہنرمندی، ایثار و قربانی، خلوص و انہماک اور سب سے بڑھ کر ان کے جذبۂ صادق کی داد دینی ہوگی اور ان کے اپنے مذہب کے تئیں سچی محبت اور مر مٹنے کی تمنا کا اظہار نظر آتا ہے۔ آبادی کے شور وشغف اور ہنگاموں سے دور، گھنے جنگلوں میں ایک پرفضا مقام پر گیان دھیان کے لیے جو مناسب جگہ درکار تھی وہ انھیں مل چکی تھی۔ موسموں کی سختی کی پرواہ کیے بغیر وہ اپنی عبادت گاہوں کی، جن میں استوپا، استمبھ اور دھرم شالائیں شامل ہیں، بنانے میں جٹ گئے۔ یہاں پانی بھی وافر مقدار میں موجود تھا۔ واگھور ندی جو آگے چل کر تاپتی ندی بن جاتی ہے اسی پہاڑی سلسلے سے نکلتی ہے۔ کنارے کا پورا ماحول نہایت خوش نما، ندی کے بہتے پانی سے پیدا ہونے والا جلترنگ، سرسبز و شاداب درخت، سبز مخملیں گھاس، جابجا مختلف رنگوں کے پھولوں اور پودوں کی افراط، رنگ برنگے پرندوں کی چہچہاہٹ نے اجنتا کے غاروں کو ایسی خوبصورتی اور بانکپن بخشا ہے کہ جو ایک بار دیکھتا ہے دوسری بار دیکھنے کی حسرت لیے واپس لوٹتا ہے۔ اجنتا اور ایلورہ کے غاروں کے اندر فنکاروں نے جو بے مثال کارنامے انجام دیے ہیں اور جو کام چھوڑا ہے۔ وجد کے بقول:

''کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے''

اس کارنامے کو انجام دے کر یہ فن کار سو گئے جیسے نروان کے بعد خود گوتم بدھ سو گئے تھے۔ اجنتا کے غاروں کو کس طرح بنایا گیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں ماہرین آثار قدیمہ نے کافی غور و خوض کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ غاروں کو بڑی ہوشیاری ہنرمندی اور منصوبہ بند طریقے سے تراشا گیا ہے۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ ہمارے گھر بنانے کے عمل سے مختلف تھا۔ یعنی بجائے نیچے سے اوپر جانے کے، چٹانوں کو اوپر سے نیچے معمولی اوزاروں، چھینی اور ہتھوڑی کی مدد سے نہایت صبر و ضبط کے ساتھ تراشا گیا۔ ابتدائی مرحلے کے بعد سطح زمین سے اونچائی کا تعین کیا گیا۔ چٹانوں کے تودوں، آگے پیچھے اور بازو کے کچھ حصوں کو عمداً چھوڑ دیا جاتا۔ بعد میں انھیں کھمبوں اور ستونوں کی شکل دی جاتی۔ فرش صاف کیا جاتا۔ دیواروں پر گوبر اور چاول کے بھوسے کے آمیزے سے لیپ دے کر چکنا بنایا جاتا۔ تب کہیں جا کر اتنی عمدہ تصاویر بنائی جا سکیں۔ غار نمبر پانچ دیکھ کر ان باتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ کھدائی کا کام اسی ترتیب سے ہوا۔ بدھ مت کے ماننے والے یہ فنکار غاروں کی توسیع، مورتیوں کو تراشنے کے ساتھ ساتھ تصاویر کی زبانی بدھ مت کی تعلیمات کو پھیلانے کا کام بھی کرتے رہے۔

اجنتا کے غاروں کی جملہ تعداد تیس ہے۔ ماہرین نے ان غاروں کو 'چیتیہ گرہ' اور 'وہارہ' دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ آیئے دیکھیں یہ تقسیم کس طرح کی ہے:

1) چیتیہ گرہ: دراصل ان گھپاؤں کو کہا جاتا ہے جن میں بدھ دھرم والے عبادت کرتے تھے۔

2) وہارہ: وہ مقام جہاں یہ لوگ سوتے جاگتے اور کھاتے پیتے اور رہتے تھے۔

اپنی بات کو بڑھانے سے قبل بدھ مت کی تعلیمات کے بارے میں مختصراً جان لینا ضروری ہے۔ گوتم بدھ کے آٹھ اہم اپدیش ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ انسان کو آٹھ چیزوں سے پناہ مانگنا چاہیے کیونکہ ان میں سے کسی کا

بھروسہ نہیں۔ وہ آٹھ چیزیں یہ ہیں: 1۔ آگ، 2۔ پانی، 3۔ تپ لرزہ، 4۔ فتنہ قتل و غارت گری، 5۔ سانپ، 6۔ شیر، 7۔ ہاتھی اور 8۔ بچے کی پیدائش۔

مہاتما بدھ کا یہ بھی کہنا تھا کہ زندگی میں پیش آنے والے دکھ، مصیبت اور ڈر سے چھٹکارہ پانا ہی 'نروان' ہے۔ اس کے لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے من کو صاف رکھے اور برے کام خواہ کتنے ہی اچھے اور دلکش کیوں نہ ہوں انھیں ترک کردے کیونکہ برے کام کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے اور آخر میں پچھتاوا ہاتھ آتا ہے۔ غریبوں، ضرورت مندوں، مصیبت زدوں کی مدد ہی میں اصل خوشی ہے۔ بالآخران کی تپیا رنگ لائی۔ بہار میں بدھ گیا کے مقام پر برگد کے درخت کے نیچے انھیں نروان حاصل ہوا اس وقت ان کی عمر 35 / برس تھی۔ بقیہ عمر انھوں نے اپنے مذہب کی اشاعت میں لگائی۔ گوتم بدھ کا انتقال 80 / برس کی عمر میں ہوا۔ سیکڑوں برس کی یکسانیت کی وجہ سے بدھ مت کے پیروں میں اختلافات نے سر اٹھایا جس کے نتیجے میں اس مذہب کے ماننے والے دو الگ الگ فرقوں 'ہن یان' اور 'مہایان' میں بٹ گئے۔

'ہن یان' کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں مہاتما گوتم بدھ کی مورتی پوجا نہیں ہوتی کیونکہ خود گوتم بدھ مورتی پوجا کے خلاف تھے۔ اسی لیے چیتہ گرہ میں بدھ کی مورتی دکھائی نہیں دیتی۔ اس کے بجائے پتھر سے تراشے گئے استوپا نظر آتے ہیں۔ یہ دراصل گوتم بدھ کی سمبالک ورشپ (علامتی عبادت) کا مقام سمجھا جاتا ہے۔

تیسری صدی میں 'مہایان' فرقہ وجود میں آیا جو مورتی پوجا کا قائل تھا۔ انھوں نے مہاتما گوتم بدھ کی مورتی تراش کر اس کی پوجا شروع کردی۔ یہ عمل بدھ مذہب کی تعلیمات کے عین خلاف تھا۔ ان کی گپھاؤں میں گوتم بدھ کی مورتی دکھائی دیتی ہے۔

اجنتا کے تیس غاروں میں سے 26,19,10,9 نمبر کے غار چیتہ کہلاتے ہیں باقی تمام وہارہ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان چار چیتہ غاروں میں 10,9 'ہن یان' کے فرقے کے جبکہ 26,19 مہایان فرقے کے مندر ہیں۔

اسی طرح غار نمبر ایک تا آٹھ، اٹھارہ، بیس تا پچیس اور ستائیس تا تیس مہایان فرقے کے اور بقیہ گیارہ غار 'ہین یان' فرقے کے ہیں۔ فی الحال چار غاروں، ایک، دو، سولہ اور سترہ میں جاتک تصاویر کو محفوظ کردیا گیا ہے۔ جاتک دراصل اس کہانی کو کہا جاتا ہے جس میں لارڈ بدھا کے سابقہ جنموں، جدوجہد، قربانی کے واقعات کے علاوہ انھیں اپدیش دیتے ہوئے فنکارانہ انداز میں تصاویر کے ذریعہ دکھایا گیا ہے۔ ان میں لارڈ بدھا کی زندگی کی مرحلہ وار جھلکیاں دکھائی گئیں ہیں۔ بدھ مت کے ماننے والوں کے عقیدے کے مطابق گوتم بدھ نے کئی جنم لیے۔ تاریخی اعتبار سے انسانی روپ میں وہ صرف ایک بار ہمالیہ کی ترائی میں واقع ایک ریاست 'کپل وستو' کے راجہ سدھودھن کے گھر پیدا ہوئے۔ اس موقع پر راجہ نے ایک جیوتشی سے ان کا زائچہ بنوایا۔ اس نے بتایا کہ نومولود کا یہ تیسرا جنم ہے یہ بچہ آگے چل کر بڑے دبدبے والا راجہ بنے گا یا ایک مہاپرش بنے گا اور جس کا نام ساری دنیا میں ہمیشہ باقی رہے گا۔ یہ سن کر گوتم بدھ کی ماں مہامایاوتی کے ہاتھ سے کنول کا پھول چھوٹ کر گرنے لگتا ہے (اس منظر کو غار نمبر ایک میں دکھایا گیا ہے)۔ یہ اور اس طرح کے کئی سوال ہیں جن کے جوابات تلاش کرنے کی ان سطور میں کوشش کی گئی ہے۔

بچپن ہی سے گوتم کی شاہی انداز میں تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی وہ سوچ بچار کرتے رہتے۔ انھیں عیش و آرام کی زندگی ناپسند تھی۔ وہ سوچتے ''کیا ہماری تمام خواہشیں پوری ہوں گی؟'' ''انسان دنیا میں کیوں پیدا ہوئے''، ''ایسا کون سا طریقہ ہے کہ تکلیفیں دور ہوں''۔ ایک مرتبہ انھیں ایک زخمی پرندہ نظر آیا' ایک بار ایک بوڑھے کو دیکھا، ایک ارتھی پر بھی ان کی نظر پڑی، وہ ہر بار غور و فکر میں ڈوب جاتے۔ ''لوگ مرتے کیوں ہیں؟'' ''مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟'' ''کیا انسان خود پیدا ہوتا ہے یا اسے پیدا کرنے والی کوئی اور ہستی ہے؟'' اس طرح کے کئی سوال انھیں بے چین کردیتے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ''یہ دنیا دکھوں اور مصیبتوں کی جگہ ہے اور خوشی اور مسرت بھاگتے سائے کی طرح ہیں''۔

گوتم کی زندگی دنیاوی رنگینی سے دور خاموش رہنے میں گزرنے لگی۔ وہ جوان ہوگئے۔ ان کی شادی ایک خوبصورت راجکماری یشودھا سے کردی گئی۔ ماں باپ اور بیوی سبھی کو امید تھی کہ آگے چل کر وہ راج پاٹ سنبھالیں گے۔ وہ راج گدی کے تنہا وارث تھے اور عوام میں بے حد مقبول بھی تھے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ان کی غور و فکر کی عادت نہیں گئی۔ اسی دوران ایک سادھو نے گوتم سے کہا ''تمھیں سچائی اور سکون کی تلاش ہے تو جنگل میں جا کر بھگوان سے لو لگاؤ، خوب تپیا کرو، کامیابی تمھیں وہیں ملے گی'' چنانچہ وہ راج کمار جو محلوں میں پلا بڑھا، عیش و عشرت کی زندگی گزاری، محل میں لڑکے کی پیدائش کا جشن رقص و سرور اور اپنی بیوی بچے کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۹ / سال کی تھی۔ اس واقعہ کی تصویر بھی بنائی گئی ہے۔

تنگ و تاریک جنگل بیاباں، چاروں طرف ہو کا عالم، ہر طرف جنگلی اور خونخوار جانور، انھیں بے شمار تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ نہ کھانا نہ پانی، کبھی کبھی گیان دھیان میں گھنٹوں بلکہ پہروں تک آنکھ بھی نہ کھولنا۔ کچھ دنوں بعد بھوک پیاس اور تکالیف کی وجہ سے ان کا تندرست و توانا جسم سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔ ادھر موسم کی پریشانیاں، غرض ان تمام مشکلات کا وہ سامنا کرتے رہے۔ اس دوران وہ کئی سادھوؤں اور سنیاسیوں سے بھی ملتے لیکن ان کی تشنگی کم نہ ہوتی اور دن مہینوں اور برسوں میں بدلتے گئے۔ وہ نروان یعنی نجات کا راستہ ابدی سکون یا ہمیشہ قائم رہنے والی خوشی کا راز جاننا چاہتے تھے۔ اس دوران وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ''انسانی زندگی میں رنج و آلام بھرے ہیں اور انسان خواہشات کا غلام بن گیا ہے۔ خواہشات کو مٹا کر ہی انسان ایک پرسکون زندگی بسر کرسکتا ہے۔ وہ اپنے اپدیشوں میں بتاتے کہ نفس کی صفائی کے بغیر نجات ممکن نہیں اور یہ بھی کہ انسان مرنے کے بعد دوسرے جانداروں کے روپ میں پیدا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جو محتاط زندگی گزارتے ہیں مرنے کے بعد اس بڑی روح میں مل جائیں گے جو سب پر حاوی ہے۔ وہ اصنام پرستی کے خلاف تھے۔ ذات پات کی بنیاد پر معاشرہ بنا ہوا تھا۔ ان کی مخالفت بھی

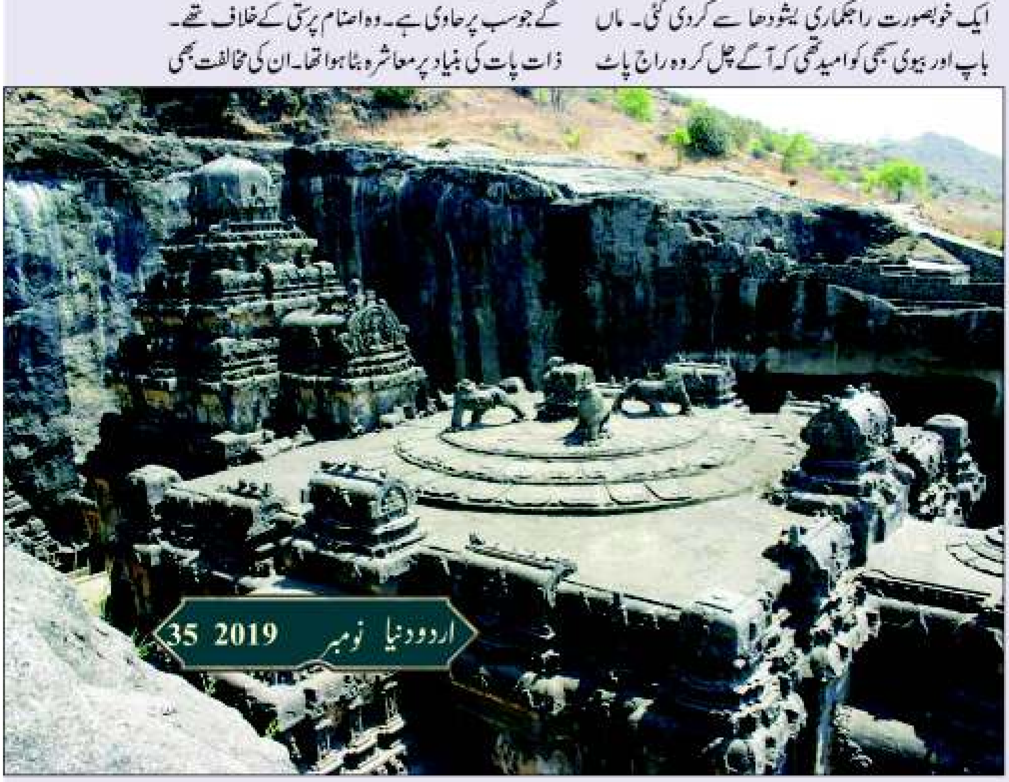

ہوتی تھی۔ جب وہ آبادی کا رخ کرتے تو اسے ان کی سنگین حالات سے شکست سمجھا جاتا۔ وہ برابر اپنے اپدیش کو لوگوں تک پہنچاتے رہے اور لوگ ان کی تعلیمات پر عمل بھی کرنے لگے۔ گوتم لوگوں کو ان ہی کی آسان زبان پالی میں اپدیش دیتے۔ لوگ انھیں بدھ اور 'مہاتما' (روشن ضمیر) کہنے لگے۔ لفظ 'بدھ' 'بدھی' یعنی عقل سے بنا ہے۔

جاتک کی ان تصویری کہانیوں میں نہ صرف مہاتما بدھ کی حیات و تعلیمات ہی کو پیش کیا گیا ہے بلکہ اس زمانے کی عام جیتی جاگتی زندگی کا عکس، مردوں اور عورتوں کا لباس، رقص کے انداز، دربار اور درباریوں کی تصاویر کے علاوہ شب و روز کے حالات، تہذیبی و معاشرتی زندگی، تہواروں کے مناظر، قدرتی مناظر، باغات، جانوروں، کیڑوں مکوڑوں کی تصاویر بھی ملتی ہیں۔ یہی نہیں اجنتا کے یہ فنکار انسانی احساسات و جذبات، شادی و غم، غصہ و انکسار، محبت اور نفرت جیسے تاثرات کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنے پر بھی قدرت رکھتے تھے جو اپنے آپ میں بڑا مشکل کام ہے۔

مونالیزا کی ہلکی سی مسکراہٹ کی داد دینے والوں کو ان تصاویر میں بہت کچھ مل سکتا ہے۔ یہ ساکت و خاموش تصویریں بات کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اسی بات کو وجدیوں کہتے ہیں۔

یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہل نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں

غار نمبر ایک، دو، سولہ اور سترہ میں خوب صورت تصاویر ہیں۔ ان میں بعض جذباتی مناظر والی اور نیم برہنہ تصاویر بھی ہیں لیکن ان کو دیکھ کر ذہن میں پراگندہ خیالات کا شائبہ بھی نہیں ابھرتا۔ غار نمبر چار، نو، دس، سولہ، سترہ، اکیس، چوبیس، چھبیس میں سنگتراشی کے نمونے بھی ہیں۔ سیاحوں کا ہجوم ان میں زیادہ ہوتا ہے۔ ان غاروں میں بنائے گئے آرٹ کے نمونوں کو دیکھ کر سیاح فنکاروں کی عظمت کا اعتراف کرنے لگتے ہیں۔ ان تصاویر میں گہرائی اور گیرائی (Three Dimension and Illusion) پیدا کرنا ہندوستان کے ان ہی فنکاروں کی ایجاد ہے۔ یہ فن پندرہویں صدی میں یوروپ میں پھیلا۔

اجنتا کے تمیں غاروں کی نمبروار تفصیل حسب ذیل ہے:

غار نمبر1:

واحد چٹان پر بیس ستونوں پر قائم یہ غار مستطیل نما ہے جسے بڑی مہارت سے بنایا گیا ہے۔ اس میں 'جاتک' کہانیوں کو تصویروں کے ذریعہ دکھایا گیا ہے۔ ان میں مہاتما بدھ کے پچھلے جنموں کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسانی روپ میں آنے سے پہلے وہ سفید ہاتھی، راج ہنس وغیرہ کے روپ میں آچکے ہیں۔

ہال کی ایک دیوار پر ایک حیران کن اور فن مصوری کا شاہکار پدماپانی کی وہ قد آدم تصویر ہے جو دیوار پر اتاری گئی ہے۔ اس کے ہاتھ میں پاکیزگی، محبت اور نیکی کی علامت کنول کا پھول ہے۔ غور سے دیکھنے پر اس کی آنکھوں کی پلکیں پیروں کے انگوٹھوں پر پڑتی نظر آتی ہیں۔ دور سے دیکھنے پر یہ تصویر سیدھی نظر آتی ہے۔ سیدھی جانب سے سیدھی طرف اور بائیں جانب سے بائیں طرف جھکی نظر آتی ہے۔ اگر ذرا دور سے 90 درجہ سے دیکھیں تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ تصویر دیوار سے آگے نکل، معلق کھڑی نظر آتی ہے۔ غور سے دیکھنے پر اس کے چہرے پر بڑا اطمینان، سکون اور روحانی مسرت نظر آتی ہے۔ اس کے جسم پر بنائے گئے موتیوں والے گہنے، کمر میں بندھا دوپٹہ، سر پر سنہرا تاج وغیرہ قابل دید ہے۔

آصفی دور کے ماہر آثار قدیمہ جناب غلام یزدانی صاحب نے اس تصویر کو اجنتا کی جان کہا ہے۔

یہاں ایک اور تصویر 'بدھی ستواپانی' کی ہے جو مہاتما بدھ کے مددگار تھے۔ اس غار میں مصوری کے دیگر اعلیٰ نمونے بھی ہیں۔

غار نمبر2:

سنگتراشی کے اس نادر نمونے والے غار میں (16) ستون ہیں۔ اس میں تصویروں کی زبانی گوتم بدھ سے متعلق حسب ذیل معلومات ملتی ہیں:

1۔ راج ہنس کے روپ میں گوتم بدھ کی پیدائش

2۔ گوتم بدھ کے بچپن کا منظر جس میں انھیں پیروں پر چلتا دکھایا گیا ہے۔

3۔ 'مایاوتی' اپنے خواب کو اپنے شوہر سے بیان کررہی ہے۔

4۔ ایک تصویر میں گوتم بدھ پر (23) راج ہنس سایہ کیے ہوئے ہیں۔

5۔ اس غار کی چھت پر بنے بیل بوٹے جو آج کے ماڈرن زمانے میں کپڑوں اور ساڑیوں پر نظر آتے ہیں۔

6۔ گوتم بدھ کی ایک دھندلی سی تصویر، اس رات کی ہے جب وہ اپنی بیوی بچے اور محل کے عیش و آرام کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لینے کے ارادے سے نکل رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر جس کشمکش کو دکھایا گیا ہے وہ فن مصوری کا کمال ہے۔ لوگ مونالیزا کی زیر لب مسکراہٹ کو تو یاد رکھتے ہیں، انھیں اس جانب بھی متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔

7۔ اس میں ایک اور کہانی تصویروں کی زبانی پیش کی گئی ہے۔ ناگ دیس کا راجہ 'دروِنا' اپنی چہیتی بیوی کو بتاتا ہے کہ 'اندرپت' کا وزیر 'ودھور پنڈت' کا طرز بیان اتنا اثر انگیز ہے کہ جو سنتا ہے وہ اس میں محو ہو جاتا ہے۔ یہ سن کر رانی ضد کرتی ہے اور عہد کرتی ہے کہ وہ اس وقت تک کھانا پانی آرام و آسائش تیاگ دے گی جب تک وہ اس کو بولتے ہوئے خود سن نہ لے۔ یہ سن کر راجہ دروِنا پریشان ہو جاتا ہے۔ اس مشکل کو اس کی نوجوان حسین بیٹی 'اروِن وتی' دور کرتی ہے۔ وہ خوب سنگھار کر کے جنگل میں جھولا ڈال کر جھولا جھولنے اور گانا گانے لگتی ہے۔ ادھر سے ودھور پنڈت اپنے اڑن کھٹولے پر سوار گزرتا ہے۔ اروِن وتی کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو کر اس سے شادی کی درخواست کرتا ہے۔ اسے اندرپت چلنے کی شرط پر وہ منظور کر لیتی ہے۔ اس طرح راجہ دروِنا کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

8۔ رقص کے ایک منظر میں رقاصاؤں کے زیورات، دوپٹے، چوڑے بارڈر والے گھیر دار لہنگے آج کے جدید لباس کی طرح نفیس اور باریک ہیں۔ آلات موسیقی، مردنگ، مجیرے، بانسری کے علاوہ طبلے کی جوڑی جس کے دونوں طرف جھلیوں کو کسنے والی ڈوریاں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔

9۔ اسی غار میں گوتم بدھ کا ایک مجسمہ بھی ہے۔

غار نمبر3: اس میں کوئی تصویر ہے اور نہ ہی کوئی مجسمہ ہے۔

غار نمبر4: تمام غاروں کے مقابلے میں نسبتاً بڑا ہے اس میں مہاتما بدھ کا مجسمہ ہے جس میں وہ اپدیش دیتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

غار نمبر5: یہ نامکمل اور خالی ہے۔

غار نمبر6: مہاتما بدھ کے مجسمے کے علاوہ دو مگرمچھوں کے مجسمے ہیں جن کے منہ میں پھولوں کے ہار ہیں۔ اس سے جانوروں کی مہاتما بدھ سے انسیت اور عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔

غار نمبر7: گوتم بدھ اور ان کے دو محافظوں کے مجسمے ہیں۔

غار نمبر9: اس بڑے غار میں '22' ستون ہیں اور ایک استوپا ہے۔

غار نمبر10: '39' ستونوں والا یہ غار جس میں لوگ جمع ہو کر تبادلہ خیالات کرتے تھے۔

غار نمبر11 تا غار نمبر15: ان غاروں میں بھی بدھ مت کی تعلیمات کا اہتمام ہوتا تھا۔

غار نمبر16: اس میں دو تصویریں 'بدھی ستواپانی' اور 'بدھی ستوا وجراپانی' کی بھی ہیں جو مہاتما بدھ کے محافظ تھے۔ ایک اور تصویر میں گوتم بدھ کے بھائی کے تیاگ کا منظر، جس میں نجومی کی بات سن کر ان کی ماں مایاوتی گھبرا کے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس کے ہاتھ سے کنول کا پھول گر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک منظر میں جن محافظوں کو دکھایا گیا ہے ان کے لباس الگ الگ دکھائے گئے ہیں جیسے پاجامہ، دھوتی، تہہ بند وغیرہ۔ ایک رقص کا

منظر بھی دکھایا گیا ہے۔ اسی غار میں 'سجاتا' نامی ایک خوبصورت خاتون کی بھی تصویر ہے جس نے بھوک پیاس سے نڈھال گوتم بدھ کو اس کیفیت سے نجات دلائی تھی۔

گوتم بدھ کا ایک بڑا مجسمہ بھی ہے جس میں وہ پیر پھیلائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غار نمبر 17: یہ ایک بڑا ہال ہے جس میں لوگ عبادت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ اس میں گوتم بدھ کا ایک بڑا مجسمہ ہے۔ اس کے علاوہ گوتم بدھ کو دوبارہ ہاتھی کے روپ میں جس کے چھ لمبے دانت ہیں' جنم لیتا دکھایا گیا ہے۔

اس غار کی تصاویر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے جیسے بیک وقت کئی فنکاروں نے اپنے اپنے طور پر مختلف مناظر بنائے ہیں۔ مثلاً:

1۔ سیتا پھل کا ایک درخت جس پر مکوڑوں کی قطار دکھائی گئی ہے۔ یہ مکوڑے بیچ بیچ کے دکھائی دیتے ہیں۔

2۔ گوتم بدھ کو انسانی روپ میں جنم لیتا دکھایا گیا ہے۔

3۔ مگر مچھ اور اڑنے والے محافظ (گندھرو) دکھائے گئے ہیں۔

4۔ وہ منظر بھی ہے جب مہاتما بدھ اپنے محل میں بھکشا لینے پہنچتے ہیں۔ ان کا بچہ بھی نظر آتا ہے۔

5۔ راجہ 'وکانکا' کے ہاتھ میں چراغ دکھایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بدھ مت کی تعلیمات کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔

6۔ ایک سنگھار کرتی عورت جس کے زیورات آج کل کے زیورات کی طرح نظر آتے ہیں۔

7۔ اس غار کی چھت پر مختلف مناظر ہیں جیسے انسان کے سر والی چڑیاں، گھوڑے کے سر والا انسان، نیلے رنگ کا سانپ، اشوک چکر، ایک چھتری جو آج کل کی چھتری جیسی ہے۔

8۔ پریاں، اڑنے والے اجسام جن کا دیومالائی کہانیوں میں اکثر ذکر ملتا ہے۔

9۔ ایک شہزادی کی تصویر جس کے گلے میں موتیوں کا ہار ہے جو لائٹ اینڈ شیڈ کی وجہ سے زیادہ چمکدار نظر آتے ہیں۔

10۔ گوتم بدھ کی بیوی یشودھرا کی دو الگ الگ تصاویر، ایک میں اسے حاملہ دکھایا گیا ہے۔ دوسری میں بچہ کی پیدائش کے بعد کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔

غار نمبر 18: اس غار میں کچھ نہیں ہے۔

غار نمبر 19: اس میں گوتم بدھ کے بہت سے مجسمے ہیں۔

اس میں ایک تصویر اس وقت کی ہے جب ایک عرصہ بعد گوتم خود اپنے گھر پر بھکشا مانگنے جاتے ہیں۔ ان کی بیوی یشودھرا انھیں بھکشا دینے دروازے پر آتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچان کر ایک دوسرے کو بڑی عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ دونوں کے چہروں پر جذبات کی کشمکش کو مصور نے جس خوبصورتی اور چابکدستی سے ظاہر کیا ہے وہ لائق داد ہے۔ اس بات کی دونوں کو مطلق خبر نہیں ہوتی کہ اناج کے دانے جھولی کے باہر زمین پر گر رہے ہیں۔ اس تصویر کا رنگ و روغن پھیکا پڑ چکا ہے۔

غار نمبر 20: اس میں گوتم بدھ کا ایک مجسمہ ہے۔

غار نمبر 21: اس میں ناگ راجہ، اس کی بیوی اور بچے کی تصویر ہے۔

غار نمبر 22: اس میں کنول کے پھول پر پیر پھیلائے گوتم بدھ کا مجسمہ ہے۔ داہنی جانب بھی ان کا ایک اور مجسمہ ہے اس کے ساتھ گوتم بدھ کے سات چھوٹے چھوٹے مجسمے ہیں۔ یہ بدھ مت کے پھیلاؤ اور اشاعت کی طرف اشارہ ہے۔

غار نمبر 23: ایک نہتا شخص مگر مچھ کو مارتا دکھایا گیا۔

غار نمبر 24 **اور** 25: ان دونوں غاروں میں بھی کچھ نہیں ہے۔

غار نمبر 26: باہر کی جانب گوتم بدھ کا مجسمہ اور دو محافظ دکھائے گئے ہیں۔ اندر کی جانب گوتم بدھ کو دو درختوں کے درمیان ابدی نیند سوتا دکھایا گیا اور آسمان سے پھول برس رہے ہیں۔

ایک اور تصویر میں گوتم بدھ کو عبادت میں محو بتایا گیا ہے جبکہ 'مایا' کو اپنی خوبصورت لڑکیوں سمیت ان کو بہکانے میں ناکام ہو کر واپس ہوتا دکھایا گیا ہے۔

غار نمبر 27: اس میں گوتم بدھ کی زندگی کے آخری زمانے کے مناظر ہیں۔ اسی کے ساتھ ایک عورت اور ایک چڑیا کی تصویر بھی ہے۔ یہ غار View Point کے سامنے کی جانب ہے۔ بعد میں اس جگہ انگریز کی یادگار بھی بنائی گئی ہے جس نے ان غاروں کو دریافت کیا تھا۔

گوتم بدھ کی وفات کے بعد بدھ دھرم خوب پھیلا۔ سمراٹ اشوک نے کلنگ کی جنگ کے بعد کشت و خون سے توبہ کر لی اور بدھ دھرم کا سچا پیرو بن گیا۔ اس نے بدھ دھرم کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنے بھائی اور بہن کو دور دور کے ملکوں میں بھیجا۔ اشوک کے بعد راجہ ہرش وردھن نے بھی اس مذہب کی ترویج و اشاعت میں کافی دلچسپی دکھائی۔ آج صورت حال یہ ہے کہ بدھ مذہب چین، جاپان، کمبوڈیا، ویتنام، کوریا، منگولیا، سری لنکا، نیپال وغیرہ ممالک میں ایک مقبول مذہب ہے اور اس کے ماننے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ کچھ ملکوں میں تو اسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہے جبکہ یہ مذہب حضرت عیسیٰؑ سے بھی پہلے کا ہے۔ ان ممالک کے لوگ اس مذہب کو غیر ملکی نہیں سمجھتے۔ ڈاکٹر اقبال نے ایک جگہ لکھا ہے۔

شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

1956 میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے اپنے بے شمار ساتھیوں کے ساتھ اس مذہب کو قبول کرلیا تھا۔ اس دن کو مہاپری ورتن دن کہا جاتا ہے۔

گوتم بدھ کا شمار دنیا کے سو بڑے لوگوں کی فہرست میں چوتھے نمبر پر درج ہے۔ جاپان وغیرہ ملکوں کی مدد سے ایلورہ اور اجنتا کے غاروں تک پہنچنے کے لیے سڑکوں کی تعمیر وغیرہ میں کافی سرمایہ لگایا گیا تھا۔ 2015 میں جاپان کے نائب صدر نے اجنتا کا دورہ کیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ اجنتا تک پہونچنے کے لیے چار لائن والی سڑک تعمیر کرنے میں مدد کی جائے گی۔

عالمی سطح پر 'اجنتا' کو ایک اہم تاریخی ورثہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ ہر سال دنیا کے کونے کونے سے بے شمار سیاح یہاں سیر کے لیے آتے ہیں۔ اجنتا کی مصوری، نقاشی اور آرٹ کے انمول نمونوں سے متاثر لوگوں میں ادیب اور شاعر بھی شامل ہیں۔ ان میں اورنگ آباد کے مایہ ناز شاعر سکندر علی وجد کا نام سرفہرست ہے۔

وجد کی نظم 'اجنتا' اردو ادب میں ایک خوبصورت اور قیمتی اضافہ ہے۔ اس کے ہر مصرعے میں شاعر کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس میں ان کے خیال کی نزاکتیں، دراصل فن سنگ تراشی اور آرٹ کی نزاکتوں کا بیان ہے۔ اس نظم کے دو بند آپ کے ملاحظہ کے لیے پیش ہیں۔

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں
جہاں گلنار ہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے
جگر کے خون سے سینچے گئے ہیں نقش لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خامۂ مانی
مشکل ہے شباب و حسن و تخیل انسانی
تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی
گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

آخر میں انھوں نے اجنتا کے تخلیق کاروں کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

محنت نہیں کی انھوں نے کسی انعام کی خاطر
جیے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

■

Ahmad Iqbal
A-18-4, Chelipura
Aurangabad - 431001 (MS)
Mob.:9890711751

محمد الیاس

دبستانِ رامپور اور حیدرآباد چند مشترک باتیں

دبستان رامپور اپنی ادبی خدمات کے لیے مشہور ہے لیکن حیدرآباد کا نام ادبی خدمات کے سلسلے میں رامپور سے بھی پہلے لیا جاتا ہے اردو کے ان عظیم مراکز کے درمیان بہت کچھ تاریخی حقائق مشترک ہیں۔ فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ کا رامپور سے حیدرآباد جانا اور وہاں ان کی قدردانی کی بہت سی روایات مشہور ہیں اور داغ کے انتقال کے بعد امیر مینائی کے شاگرد رشید جلیل القدر حافظ جلیل مانکپوری کا نظام حیدرآباد کے یہاں شرف استاذی سے سرفراز ہونا اردو ادب کا ایک اہم باب ہے۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نوابین حیدرآباد کو دو اساتذہ رامپور سے ہی حاصل ہوئے۔ حالانکہ یہ بھی درست ہے کہ رامپور ایک چھوٹی سی ریاست تھی یہاں کی چہار دیواری میں رہ کر داغ کو وہ شہرت نہیں ملی جتنی حیدرآباد جا کر ملی۔ اسی طرح جلیل مانکپوری کو بھی حیدرآباد جا کر بڑی قدر و منزلت حاصل ہوئی جو نظام حیدرآباد کی اردو نوازی اور اساتذہ کی قدرشناسی کی ایک مثال ہے۔ ان کو حیدرآباد کے دو فرمانرواؤں (میر محبوب علی خاں اور میر عثمان علی خاں) کی استاذی کا شرف حاصل ہوا۔ اردو شاعری میں امیر و داغ کا زمانہ اردو شاعری کا جزو لاینفک دور ہے ان کے بعد تلمیذ امیر، جلیل مانکپوری نے ان دونوں اساتذہ کی روایات کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا اور دکن میں اردو شاعری کے ساتھ اردو صحافت کے فروغ میں ان کا اہم ترین حصہ رہا۔

امیر و داغ کے درمیان انتہائی دوستانہ تعلقات تھے، دونوں ایک دوسرے کے بے حد قدرشناس اور مداح تھے اگر چہ رامپور میں داغ کا رنگ زیادہ پسندیدہ تھا۔ ایک طرف تو داغ کی رنگین مزاجی اور دوسری طرف ان کی فصاحت لہٰذا عوام و خواص دونوں ان کے دلدادہ تھے۔ داغ کے کلام میں لوگوں کو اپنے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی تھیں اسی وجہ سے لوگوں کی واہ واہ سمیٹنے میں وہ داغ سے آگے بڑھ گئے۔

امیر رامپور میں لکھنوی زبان کی نمائندگی کرتے تھے، جبکہ داغ کا دعویٰ تھا کہ اردو جس کا نام ہے اسے صرف ہم دلّی والے ہی جانتے ہیں لہٰذا یہ دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی بھی کوشش کرتے تھے اور اس مسابقت میں ایسے اشعار اردو کے دامن میں آ گئے جو اردو کے لیے تو عظیم سرمایہ ہیں ہی دبستان رامپور کے لیے بھی باعثِ فخر ہیں، جیسے

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اس میں 'ہمیں' سے مراد دلی والے اور 'ہماری زبان' سے مراد دلی میں استعمال ہونے والی زبان سے ہے لیکن اب شعر کے معنی و مفہوم میں بھی وسعت آ چکی ہے اور اس کو ایک آفاقی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور اس کے مصرعۂ ثانی کو لوگ اس طرح پڑھتے ہیں۔

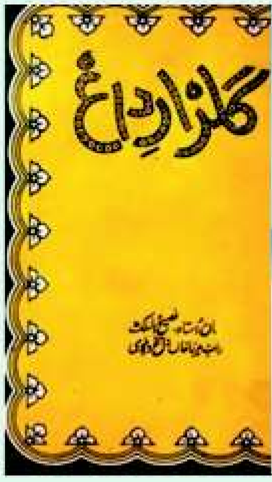

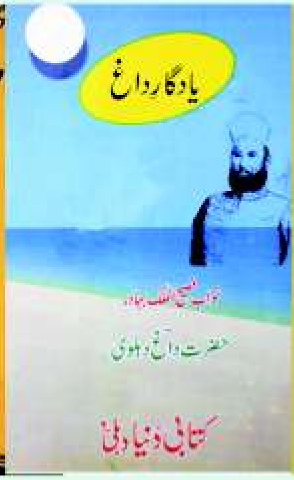

''سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے''
اس شعر کے جواب میں امیر مینائی نے کہا تھا:

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

داغ کے چار دواوین میں سے دو یعنی 'گلزارِ داغ' اور 'آفتاب داغ' رامپور کے زمانہ قیام کی تصنیف ہیں مثنوی فریاد داغ بھی رامپور کی یادگار ہے۔'ماہتاب داغ' اور 'یادگار داغ' کے کلام میں وہ چاشنی نہیں جو ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔رام بابو سکسینہ نے چار شعرا کو رامپور کے قصرِ شاعری کا ستون قرار دیا ہے۔امیر، داغ، جلال اور تسلیم۔ان چاروں کے کلام منفرد انداز کے ہیں۔داغ کو حیدرآباد میں جن خطابات سے نوازا گیا ان میں سے ایک 'جہاں استاذ' بھی تھا لیکن رامپور میں ان کی حیثیت جہاں استاد کی نہیں تھی کیونکہ جس قصر شاعری کے وہ ایک ستون تھے، امیر، جلال اور تسلیم بھی تو اس قصر شاعری کے ستون ہی تھے جبکہ حیدرآباد میں ان کے ہم پلہ کوئی شاعر نہیں تھا۔ تمام ناقدین نے لکھا ہے کہ داغ کے کلام میں حیدرآباد جانے کے بعد وہ تاثر باقی نہیں رہا جو رامپور کے زمانہ قیام کے دوران تھا۔داغ نے خود کہا تھا:

''جتنے تجربات مجھے رامپور کے زمانہ قیام میں ہوئے، کبھی نہیں ہوئے، رامپور نے میری شخصیت کو سانچے میں ڈھال دیا اور میرے سارے کس بل نکال دیے۔''1

شاید اسی وجہ سے حیدرآباد جانے کے بعد حسرت بھرے لہجہ میں داغ نے کہا تھا:

اے داغ بہت دور ہے دکن سے رامپور
ملتے امیر احمد و سید جلال سے

جبکہ دوسری طرف رامپور میں امیر بھی داغ کی جدائی سے غمزدہ تھے۔

امیر وداغ کے درمیان انتہائی دوستانہ تعلقات تھے،دونوں ایک دوسرے کے بے حد قدر شناس اور مداح تھے اگر چہ رامپور میں داغ کا رنگ زیادہ پسندیدہ تھا ایک طرف تو داغ کی رنگین مزاجی اور دوسری طرف ان کی فصاحت لہٰذا عوام و خواص دونوں ان کے دلدادہ تھے۔ داغ کے کلام میں لوگوں کو اپنے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی تھیں اسی وجہ سے لوگوں کی واہ واہ سمیٹنے میں وہ داغ سے آگے بڑھ گئے۔

کہاں ہم اے امیر اور اب کہاں داغ
وہ جلسے ہو چکے 'خلد آشیاں' تک

(خلد آشیاں سے نواب کلب علی خاں کی تاریخ وفات نکلتی ہے)

رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے:

''ان کا بہترین زمانہ ان کے قیام رامپور کا زمانہ کہا جاسکتا ہے جب سے کہ وہ حیدرآباد گئے اور وہاں ثروت و عیش ان کو نصیب ہوا شاعرانہ جگر کاوی اور محنت کے وہ عادی نہ رہے، مگر سچ یہ ہے کہ آخری فیصلہ کن چیز اس معاملہ میں نقاد کا رنگ طبیعت اور رجحان مذاق ہے۔''2

23 مارچ 1887 کو نواب رامپور کلب علی خاں کا انتقال ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی رامپور میں اردو شعر و ادب کے عہد زریں کا اختتام ہوگیا۔اس عہد میں کاملان فن جس طرح ریاست رامپور کا رخ کیا کرتے تھے اسی طرح یہاں شعر و ادب کی محفلوں کی رونقیں رفتہ رفتہ کم ہونے لگیں۔یہ عہد زریں ان کے والد نواب یوسف علی خاں کے مسند نشین ہونے یعنی 1855 سے شروع ہو کر 1887 میں ختم ہوگیا اور یہاں کے شعرا و ادبا پھر ادھر ادھر بھٹکنے لگے۔رئیس رسولپور مولوی مہدی حسن شاداب کے نام ایک خط میں 19 جولائی 1888 کو امیر مینائی نے لکھا تھا:

''نواب مرزا خاں داغ سے کارخانہ اصطبل پہلے نکل گیا تھا فراش خانے کی موجودات وہ خود سمجھا کر مستعفی ہوئے۔استعفیٰ نامنظور اور رخصت دو ماہ کی منظور ہوئی، کئی روز ہوئے کہ وہ بھی چلے گئے احتمال آنے کا ضعیف ہے، میں بھی نہایت دل برداشتہ ہوں۔معمولی وقت پر حسب حکم سرکار تسلیم گاہ میں جا کر تسلیم بجالاتا ہوں۔''3

داغ اس کے بعد رامپور نہیں آئے کچھ دنوں بعد نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں نے ان کو اپنے یہاں بلا لیا اور وہ ان کی دعوت پر حیدرآباد چلے گئے۔نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے:

''اس دور میں سلطنت آصفیہ نے اردو کی سرپرستی اس طرح بھی فرمائی کہ ہندوستان کے مشہور شعرا اور مصنفین کو اپنے ملک میں طلب کرلیا ان کو ماہوار و منصب جاری فرمادی تاکہ یہ ارباب کمال اردو کے خزانے کو مالا مال کرتے جائیں۔اس زمرے میں سب سے پہلے جہاں استاد فصیح الملک، بلبل ہندوستان مرزا داغ دہلوی ہیں جو رامپور کو خیرباد کہہ کر یہاں متوطن ہوجاتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت غفران مکان آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں کی استادی کی عزت حاصل ہوئی اور خطاب فصیح الملک، بلبل ہندوستان، جہاں استاد سے بجا طور پر مفتخر کیے گئے، دوہزار روپیہ ماہوار تنخواہ قرار پائی ہے۔''3

جلیل مانکپوری، مضافات اودھ مانکپور کے رہنے والے تھے۔امیر مینائی کے چہیتے شاگرد تھے۔امیر مینائی کی 'امیر اللغات' کی تدوین میں حتی الوسع امیر کا ساتھ دیا اور امیر نے اس سلسلے میں بیرون رامپور کے جو سفر کیے تھے ان میں بنارس اور بھوپال کے سفر میں امیر کے ساتھ رہے اور رامپور میں جو دفتر امیر اللغات کی ترتیب کے لیے قائم کیا گیا تھا اس میں بھی ادارت کا فرض انجام دیا۔اس سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ وہ نواب کلب علی خاں کے دور میں (1865 تا 1887) رامپور آئے تھے کیونکہ اسی دوران امیر نے بنارس اور بھوپال کے سفر کیے تھے اور والی بھوپال نواب شاہجہاں بیگم نے امیر اللغات کے لیے ان کی معاونت بھی کی تھی۔امیر نے داغ کو خطوط کے ذریعے اس طرف متوجہ کیا کہ وہ نظام حیدرآباد کے دربار میں ان کی رسائی کے لیے راہ ہموار کریں۔

اتفاق سے جنوری 1900 میں نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں نے کلکتہ کا سفر کیا۔داغ بھی ان کے ساتھ تھے۔راستے میں بنارس میں قیام کے دوران داغ کی وساطت سے امیر نے نواب میر محبوب علی خاں سے

ملاقات کی۔ نواب صاحب کی شان میں ایک مسدس جو انھوں نے بنارس جاتے وقت راستے میں ہی کہا تھا، ان کو سنایا۔ میر محبوب علی خاں نے امیر سے ساتھ ہی حیدرآباد چلنے کے لیے کہا تو امیر نے موسم گرما میں حیدرآباد پہنچنے کا وعدہ کرلیا لیکن وہ برسات کے موسم میں حیدرآباد جا سکے بھوپال ہوتے ہوئے 5 ستمبر 1900 کو حیدرآباد پہنچے۔ ان کے ساتھ ان کے دو بیٹے لطیف احمد اور مسعود احمد، جلیل، تین دیگر افراد خاندان اور تین خدمت گار تھے۔ ان کے بیٹے محمد احمد صریر رامپور میں ہی رہے۔ وہ نواب حامد علی خاں کے استاد اور مصاحب خاص تھے۔ لہٰذا رامپور میں ایک محلہ کوچۂ مینائیاں کے نام سے مشہور ہے جہاں امیر کے خاندان کے افراد سکونت پذیر رہے۔ حیدرآباد پہنچنے پر امیر کی توقع سے زیادہ پذیرائی ہوئی۔ حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ آہ کو ایک خط میں امیر نے لکھا تھا:

''بھائی صاحب! 5 ستمبر کو 5 بجے شام حیدرآباد پہنچے۔ یہاں پیشتر سے بذریعہ اشتہار ورود کی اطلاع ہوگئی تھی۔ تمام اسٹیشن استقبال کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس درجہ مقبولیت کا ہرگز خیال نہ تھا جو ثابت ہوئی۔ مہاراجہ بہادر (کشن پرشاد) پیشکار، وزیر، افواج کی گاڑیاں لیے ہوئے، پنڈت رتن ناتھ سرشار موجود تھے۔''5

حیدرآباد کے سفر کے دوران امیر نے کہا تھا

اب کے سفر وہ ہے کہ نہ دیکھوں گا پھر وطن
یوں تو میں لاکھ بار غریب الوطن ہوا
کیسی گھڑی تھی، گھر سے جو نکلا تھا میں غریب
پھر دیکھنا نصیب نہ مجھ کو وطن ہوا

لیکن امیر چونکہ رامپور سے ہی شدید علالت کی حالت میں روانہ ہوئے تھے بالآخر حیدرآباد پہنچنے کے 39 دن بعد 13 اکتوبر 1900 کو انتقال ہوگیا۔ امیر کی زندگی کے 43 سال رامپور میں گزرے لیکن حیدرآباد کی خاک ان کا مقدر بنی۔ زندگی کی تمام تر کوششوں کے باوجود 1886 میں مفید عام پریس آگرہ سے امیر اللغات کا نمونہ شائع ہوا تھا جس کو لے کر امیر نے بہت سے شہروں کا دورہ کیا اور اہل علم حضرات سے ملے تھے۔ اور 1891 اور 1892 میں الف مقصورہ اور الف ممدودہ پر مشتمل دو جلدیں شائع ہوسکیں باقی یہ سارا ادبی سرمایہ ضائع ہوگیا۔ جبکہ امیر نے 8 جلدوں میں امیر اللغات کو مکمل کردیا تھا۔ حیدرآباد جاکر ان کے انتقال کے بعد اس کی اشاعت کی رہی سہی امیدوں نے بھی دم توڑ دیا۔ اس کا مسودہ بھی یکجا نہیں رہ پایا وہ بھی منتشر ہوگیا۔

ان کے علاوہ حیدرآباد جانے والوں میں مولوی احسن اللہ ثاقب، ممتاز علی آہ، وسیم خیرآبادی اور مضطر خیرآبادی تھے۔ آہ حیدرآباد کے ہی رہنے والے تھے اور استاد کے بلانے پر رامپور چلے گئے تھے لیکن جب خود امیر حیدرآباد آئے تو آہ بھی حیدرآباد آگئے اور امیر کے انتقال کے بعد انھوں نے حیدرآباد میں ہی امیر مینائی کی یادگار کے طور پر ایک کتاب 'امیر مینائی' شائع کی تھی جس کے زیادہ تر صفحات میں امیر اور رامپور کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور غالب کی رامپور آمد کا بھی ذکر کیا گیا ہے یہ کتاب ادبیات رامپور کی ایک اچھی یادگار ہے۔ 1889 سے 1895 تک ممتاز علی آہ دفتر امیر اللغات کے سکریٹری رہے اور 1895 سے 1900 تک یعنی امیر کے قیام رامپور کے اختتام تک جلیل دفتر کے سکریٹری رہے۔

حیدرآباد میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد (تلمیذ داغ) مدارالمہام کی سرکار سے جلیل کے لیے سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوگیا۔ 1905 میں جب داغ کا انتقال ہوگیا تو جلیل کو نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں کی استادی کا شرف حاصل ہوا اور ماہانہ وظیفہ سو روپے سے بڑھ کر پانچ سو روپے ہوگیا۔ جلیل القدر کا خطاب عطا ہوا۔ جب میر عثمان علی خاں آصف جاہ مسند نشین ہوئے تو ان کے استاد بھی جلیل ہی رہے اور انھوں نے اپنے استاد کو 'فصاحت جنگ بہادر' کے خطاب سے نوازا اور 'امام الفن' کا لقب عطا کیا۔ ان کے علاوہ وہاں کے حکمراں خاندان کے افراد جو شاعری کا ذوق رکھتے تھے جلیل سے ہی اصلاح لیتے تھے۔ ریاض، مضطر اور وسیم، تلامذۂ امیر نے ان کو جانشین امیر قرار دیا۔

نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے۔

حیدرآباد جانے والوں میں مولوی احسن اللہ ثاقب، ممتاز علی آہ، وسیم خیرآبادی اور مضطر خیرآبادی تھے۔ آہ حیدرآباد کے ہی رہنے والے تھے اور استاد کے بلانے پر رامپور چلے گئے تھے لیکن جب خود امیر حیدرآباد آئے تو آہ بھی حیدرآباد آگئے اور امیر کے انتقال کے بعد انھوں نے حیدرآباد میں ہی امیر مینائی کی یادگار کے طور پر ایک کتاب 'امیر مینائی' شائع کی تھی جس کے زیادہ تر صفحات میں امیر اور رامپور کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور غالب کی رامپور آمد کا بھی ذکر کیا گیا ہے یہ کتاب ادبیات رامپور کی ایک اچھی یادگار ہے 1889 سے 1895 تک ممتاز علی آہ دفتر امیر اللغات کے سکریٹری رہے اور 1895 سے 1900 تک یعنی امیر کے قیام رامپور کے اختتام تک جلیل دفتر کے سکریٹری رہے۔

''جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل جانشین حضرت امیر مرحوم کو ایک زمانہ جانتا ہے۔ آپ کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ 1365ھ میں آپ کا حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ آپ کی شاعری نے دکن میں اردو کی ترقی میں جو کام کیے ہیں ان کے مدنظر آپ کے ذکر خیر کے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہوسکتا۔''6

نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں کی سرپرستی میں 'محبوب الکلام' نام سے ایک ماہانہ گلدستہ شائع ہوتا تھا اور اس کے بعد (میر عثمان علی خاں کے) دور آصفی میں 'دبدبۂ آصفی' کے نام سے ایک ماہنامہ نکلتا تھا ان دونوں کی ادارت جلیل کے ذمے رہی۔ رامپور میں نواب کلب علی خاں نے دبدبۂ سکندری کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنا شروع کیا تھا اور جب امیر اور جلیل نے رامپور سے رخت سفر باندھا جب بھی دبدبۂ سکندری نکلتا تھا ممکن ہے اسی کے نام پر حیدرآباد سے دبدبۂ آصفی نکالا گیا ہو۔ باضابطہ طور پر جلیل کو جانشین قرار دیا گیا لیکن داغ کے انتقال کے بعد اردو شاعری کے لیے جلیل کی بیش بہا خدمات رہیں اور خاندان شاہی کے علاوہ بے شمار شعرا نے ان سے اکتساب فن کیا اور اردو شاعری کو عروج کی راہ پر گامزن رکھا۔ نصیرالدین ہاشمی کے علاوہ تمام مؤرخین نے جلیل کی شعری خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ 6 جنوری 1946 کو حیدرآباد میں ہی جلیل کا انتقال ہوا۔ امیر، داغ اور جلیل مانکپوری کے علاوہ مولوی احسن اللہ ثاقب، ممتاز علی آہ، ریاض خیرآبادی اور مضطر خیرآبادی، یہ وہ جواہر تھے جو ریاست رامپور میں اپنے فن پاروں کی ضو بکھیرنے کے بعد حیدرآباد کے حصے میں آئے۔ باقی ماندہ زندگی یہیں گزاری اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔

حواشی

1. بزم داغ: رفیق مارہروی ص209، سنہ اشاعت درج نہیں
2. تاریخ ادب اردو: رام بابو سکسینہ ص376، مطبع تیج کمار لکھنؤ 1986
3. خطوط منشی امیر احمد: مولوی احسن اللہ ثاقب، ص309 اردو پریس علی گڑھ 1910
4. دکن میں اردو: نصیرالدین ہاشمی، ص547، سپر پرنٹر دہلی 1985
5. خطوط منشی امیر احمد: احسن اللہ ثاقب ص211، اردو پریس علی گڑھ 1910
6. دکن میں اردو: نصیرالدین ہاشمی ص631، سپر پرنٹر دہلی 1985

Dr. Mohd Ilyas
385, Peetal Basti
Moradabad - 244001 (UP)
Mob.:9412838085

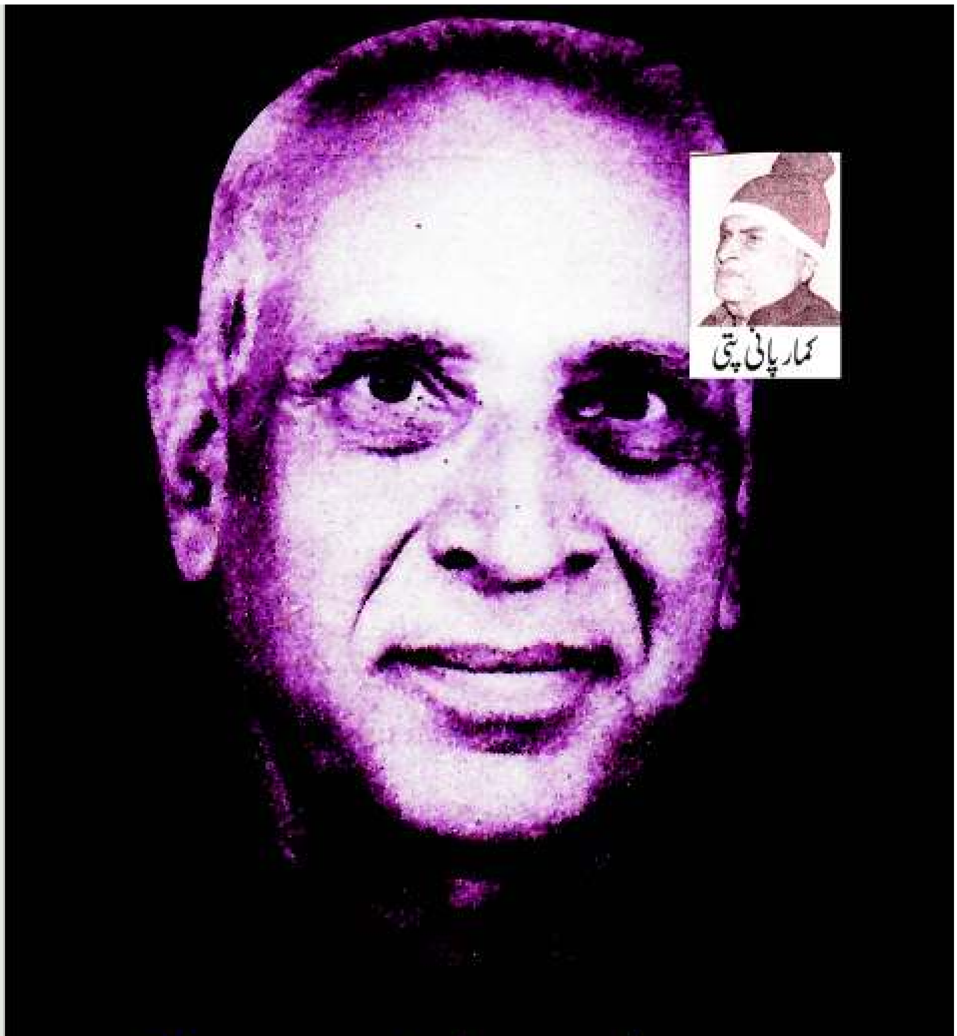

کمار پانی پتی

ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ عشرت حافظ آبادی بحیثیت غزل گو

ڈاکٹر عشرت حافظ آبادی (2 دسمبر 1906 - 21 جنوری 1994) شاگرد تو علامہ اقبال کے تھے مگر جانے انجانے میں فیض کے ان مستند الفاظ کا مفہوم بخوبی سمجھ چکے تھے:
''شعر کہنا جرم نہ سہی، لیکن بے وجہ شعر کہتے رہنا ایسی دانشمندی نہیں...'' موصوف غزل کہتے ہوئے بھی موقع اور محل ہمیشہ دھیان میں رکھتے تھے۔ کوئی نہ کوئی مقصد ان کے سامنے ضرور ہوتا تھا۔ عام مجلسی شعرا کی طرح یونہی آسمانی اڑانیں بھرنے کے عادی نہیں تھے۔ دوسروں کے بھی ایسے ہی شعروں پر داد دیتے تھے جو ان کے اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوں۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے ایک بار میرے ان اشعار پر داد کے دریا بہا دیے تھے:

کوئی مقصد بھی اس اڑان میں رکھ
یونہی خود کو نہ آسمان میں رکھ
جس پہ ہر کوئی ٹوٹ کر لپکے
کوئی ایسی بھی شے دکان میں رکھ
کچا پکا سہی یہ اپنا ہے
دل سے خود کو اسی مکان میں رکھ...

یہی وجہ ہے کہ عشرت اپنے عہد کے عام شعرا کی طرح محض ''غزلیاتی اشعار کی ہی دکان سجانے میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔'' وہ ایسی غزل کے تو حق میں ہی نہیں تھے جو محض رسمی روایتی مضامین کی گت پر ناچتی نظر آئے۔ غزل میں وہ مولانا حالی ہی کی طرح ''درس و پیام کے عظیم گھونسلے تعمیر کرنے کے حق میں تھے۔'' انھیں وہ غزل ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی جس میں درس و پیام کی گنجائش نہ ہو۔ وہ تو علامہ سیماب اکبرآبادی کی اس بات سے پوری طرح متفق تھے:

''غزل ضرور کہیے اور ضرور پڑھیے۔ میں بھی آپ کی ہمنوائی کروں گا، لیکن شعر پڑھنے سے پہلے یہ غور کر لیجیے کہ اس کا اہل فن اور اہل علم پر کیا اثر ہوگا؟ اس کے بعد نوجوانوں پر کیا ہوگا؟ اس کے بعد عام سوسائٹی پر کیا ہوگا؟ اگر آپ کے خیال میں یہ سہ گونا اثرات خوشگوار ہوں تو ضرور پڑھیے۔ ایسے ہی اشعار پڑھنے اور سننے سے تعلق رکھتے ہیں، خواہ اس سے سوسائٹی کے جذبۂ تفریح میں حرکت پیدا ہو یا نہ ہو، لیکن ان کے دل اس شعر سے متاثر ضرور ہوں گے...''

(خطبۂ صدارت: مشاعرہ جھانسی، 3/اپریل 1940)

چنانچہ عشرت کے ہاں بہت ہی کم ایسی غزلیات ملیں گی جو رسمی روایتی غزل کی طرح محض عشق و محبت، گل و بلبل، شمع و پروانہ، دیر و کعبہ تک ہی محدود رہ کر دم توڑ گئی ہوں۔ ان کے سارے کلام میں (جتنا بھی میری نظر سے گزرا ہے) ایسی غزلیات کی گنتی آدھا درجن سے بھی کم ہوگی۔ اکثر تسلسل کی پتوار تھامے غزل کی کشتی کو دھیرے دھیرے بڑے تحمل کے ساتھ نظم ہی کی اخلاقی لہروں پر بہاتے چلے جاتے ہیں اور وہ بھی اپنی بین الاقوامی بہترین تہذیب کے دائرے میں رہ کر، اس تغزل کو بری طرح دھتکارتے ہوئے جس کے متعلق شہر حالی و سلیم کے لیے تاج بادشاہ ڈاکٹر صابر پانی پتی نے (جو خود بھی ڈاکٹر عشرت ہی کے علاقے سے اجڑ اکھڑ کر پانی پت میں آکر آباد ہوئے تھے) نے کہا تھا:

تغلم کی رسوائیاں دیکھ صابر
تغزل حیا بیچ کر کھا گیا ہے!

ان کی کوئی بھی ایسی غزل نہیں جس میں عشرت انسانیت کو خیرباد کہہ کر ننگے پن کے سہارے داد بٹورنے کی کوشش کرتے دکھائی دے رہے ہوں۔ مثال کے طور پر دیکھیے ان کی ایک غزل کے یہ اشعار:

فغاں میں، نالے میں، فریاد و آہ و زاری میں
کٹے گی عمر، یہ ایک دو نفس کی بات نہیں
جو تم نہیں تو کوئی بھی سہی، یہ کیوں کر ہو
ہم اہل عشق ہیں، اہل ہوس کی بات نہیں

عشرت ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے نظر آرہے ہیں۔ رنگ علامہ ہی کا ہے اگرچہ انداز

ان کا اپنا ہے، ایک دم نیا اور انفرادی، روایات سے قدرے ہٹ کر...

عشرت طرحی غزل کہنے سے اکثر کتراتے تھے۔ وہ اسے محض سمع خراشی ہی گردانتے تھے۔ ''دن رات ایک کرکے اگر کبھی آپ نے دو اچھے شعر کہہ بھی لیے تو کیا ہوا؟'' ایک بار انھوں نے خود فرمایا تھا: ''لوگ تو ہمیشہ غالب ہی کے اشعار کا حوالہ دیں گے۔ چنانچہ کیوں مغزپچی کی جائے۔ کیوں نہ کوئی نئی زمین تیار کرکے کوئی نرالی فصل بوئی جائے۔ پڑھنے یا سننے والے یہ تو کہیں کہ کچھ کیا ہے یا کچھ نیا کرنے کی کوشش کی ہے...''

لیکن کبھی کبھی کسی اچھے مصرع طرح پر کچھ نرالے اشعار موزوں کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ شعر منہ سے بولتے تھے اور طرح مصرع پر اکثر بھاری پڑتے تھے۔

کسی بے کس کے کاسے میں جو تو مقدور ہوجائے
گدا ہوکر وہ رشکِ قیصر و مغفور ہوجائے
تری درگہ سے جذبِ عشق گر منظور ہوجائے
کوئی موسیٰ، کوئی عیسیٰ، کوئی منصور ہوجائے
ترے عزم مصمم پر فدا ہیں منزلیں لاکھوں
ہو عزم الجزم، ناممکن ہے منزل دور ہوجائے
خودی کو دیکھ، تو نے پالیا اس کو، تو دیکھے گا
تری مرضی پہ قدرت خود بخود مجبور ہوجائے
جو میں مسرور ہوتا ہوں، تجھے مغموم پاتا ہوں
جو میں مغموم ہوجاؤں تو تو مسرور ہوجائے
سکندر بھی پکارے جذب دل سے تو بنے موسیٰ
اگر ظلمات کا چشمہ ہو کوہ طور ہوجائے
مرے دل میں تصور یوں جما ہے میرے دلبر کا
یہ کہتا ہے نہیں پروا، مری ہو، حور ہوجائے

جب عشرت نے شعر کہنا شروع کیا غزل غالب کی ہفت آسمانی اڑان سے ہوتے ہوئے حالی کی نظریاتی سطح پر آ پہنچی تھی اور جوش، فراق، اور اقبال اس پر اپنے ہی انداز کی مہر ثبت کر رہے تھے۔ عشرت اکثر اقبال کے آس پاس ہی چنگیاں بھرتے نظر آتے تھے۔ ہیئتی تبدیلیاں تو ابھی کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھیں۔ 'آزاد غزل' ابھی مستقبل کی کوکھ میں ہی اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ 'غزل بیک قافیہ' کا کسی نے نام بھی نہیں سن رکھا تھا۔ ہاں، ترقی پسند شعرا ضرور اسے نظمیہ شاعری کے نزدیک لاکر ایک نئی صنف کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو تسلسل کے سہارے برق رفتار پر اڑان بھرتے ہوئے 'نظم نما غزل' یا 'غزل نما نظم' کا روپ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ چنانچہ 1947 میں ملک کے بٹوارے کے دنوں میں عشرت نے جو غزلیں کہیں وہ تسلسل کا دامن تھامے نظم ہی کی طرف بڑھتی دکھائی دیتی ہیں۔ دیکھیے ان کی یہ مشہور غزل جو انھوں نے 1948 میں قدرے لٹ پٹ کر سرحد کے اُس پار سے آکر کہی تھی:

ہمارے واسطے کیا ہے خوشی اپنی، غمی اپنی
خوش و ناخوش بسر کرتی ہے شام زندگی اپنی
بھلا یہ بھی ہے کوئی زندگی، یہ زندگی اپنی
فنا چاروں طرف ہے اور بقا ہے عارضی اپنی...

اور حالات کے زیر اثر ایک دم اپنے سرحد پار کے وطن کو یاد کرتے ہوئے مفہوم کی کڑیاں ملاتے ہوئے فرماتے ہیں:

تجھے پنجاب ہم نے اپنا خوں دے دے کے سینچا تھا
کہ پیری میں عصا بن کر کرے گا دلبری اپنی
ہزاروں انقلاب آئے، وہی تو تھا وہی ہم تھے
کبھی اس طرح پہلے تو نظر بدلی نہ تھی اپنی
مگر اب کی دفعہ کیسا نیا یہ انقلاب آیا
خدا جانے وہ دیرینہ مروت کیا ہوئی اپنی
''نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے، لیکن''
کہیں بڑھ چڑھ کے آدم سے ہوئی بے عزتی اپنی...

پھر دیکھیے سرحد پار سے لٹ پٹ کر آنے کا منظر جو عشرت نے خود اپنی جان پر بھگتا ہے:

نکالا سرزمین پاک سے یوں بے سروساماں
ہماری بے کسی میں رو رہی ہے بے بسی اپنی...

مگر پھر ایک دم تھام لیتے ہیں اپنی بے مثال پنجابیت کا دامن، جس کی ہمیشہ اپنی ہی آن بان شان رہی ہے، اور حالات کو للکارتے ہوئے فرماتے ہیں:

توکل ہے خدا پر اور اپنے زور بازو پر
کسی محفل میں بھی جاکر نہیں گردن جھکی اپنی
اگرچہ بے طرح کوہ مصائب ہم پہ ٹوٹا ہے
نہ دیکھی آج تک دنیا نے دریوزہ گری اپنی
ملے تو خاک میں لیکن اٹھیں گے خاک میں مل کر
کوئی صبر و تحمل میں کرے گا ہمسری اپنی؟

اور پھر اپنے مستقبل کی یوجناؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، کیا ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ٹھکانا گر نہیں لاہور کیا غم بے ٹھکانوں کو
وہیں کعبہ بنا دیں گے جہیں جس جا دھری اپنی
اثاثہ دوش پر لے کر سر بازار بیٹھے ہیں
نہیں سرمایہ داروں کو یہ حالت بھی جچی اپنی...

اور پھر اپنی وطن پرستی اور قربانی پر فخر و ناز کرتے ہوئے اپنے دیش واسیوں کو قدرے جھنجھوڑتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں:

مرے ہم ہیں کہ تا زندہ رہیں ہندوستاں والے
'رقیبوں کے بچانے کو لٹا دی زندگی اپنی...

وہ دِلّی یا دِلّی سرکار پر بھی بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے کیونکہ پنجابی ہی اس ملک کا ایسا پودا ہے جو کسی حال میں کہیں بھی سرسبز و شاداب ہوسکتا ہے۔ چنانچہ عشرت کے الفاظ میں:

بھلا کیوں بار دِلّی پر ہوں یا سرکار دلی پر
کسی پر بار ہونے کی نہیں عادت رہی اپنی...

پنجابیوں کی سب سے بڑی خوبی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ وہ دوسروں کے لیے ہمیشہ جان تک دینے کے لیے تیار رہتے ہیں اور بے مثال قربانی دے کر، لٹ پٹ کر وہ سرحد پار سے آئے ہیں:

کسی کے واسطے جینا ہی تو اپنا شیوہ تھا
کسی کے واسطے مرنا یہی عادت تو تھی اپنی...

پنجابی اپنی ہمت اور جرأت کے سہارے اپنی زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں۔ ''وہ جم کے واہنے اور رج کے کھانے والے لوگ ہیں'' وہ کسی حالت میں گھبرانا جانتے ہی نہیں:

کمانا اور گنوانا، پھر کمانا اپنا جوہر ہے
عمل کے راز میں مضمر ہے گویا زندگی اپنی...

اور پھر ایک اور بات بھی تو ہے۔ حالات کا گلہ شکوہ کرنا بھی تو بزدلی کے مترادف ہے۔ عشرت پنجابی ہونے کے ناطے اس کے بالکل حق میں نہیں تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ ہر برائی میں کوئی نہ کوئی اچھائی بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ مقطع میں وہ یہ بات بھی کھل کر کہہ جاتے ہیں:

نہیں زیبا کہ حالِ زار پر عشرت ہو تو گریاں
خدا جانے کچھ اس میں بھی چھپی ہو بہتری اپنی

کیا نام دینا چاہیں گے آپ عشرت کی اس تخلیق کو؟ بہ الفاظ دیگر یہ غزل ہے کہ نظم؟ کیا کہنا چاہیں گے آپ اس بارے میں؟ مگر عشرت کے قریب یہ ایک بہترین 'غزل نما نظم' یا 'نظم نما غزل' کا وہ نمونہ ہے جس کی کئی مثالیں 1947 کے دور میں منظرِ عام پر آتی رہیں اور ساحر آج بھی اس سلسلے میں اپنی ایسی ہی ایک تخلیق میں اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے بھی 1947 کی حیوانیت کی عکاسی کرتے ہوئے کہا تھا:

طرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گزری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری
زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری
ہمیں یہ فکر ان کی انجمن کس حال میں ہوگی
انھیں یہ غم کہ ان سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گزری

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا، جو اب بھی ہے
مگر اس عالم وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری

یہی تسلسل فراق کی غزلیات کا جزو اعلا رہا اور اس کی روشنی سے جگمگا رہی ہیں۔ جوش کی غزلیاتی تخلیقات، جوش جو بذات خود بھی فراق اور عشرت کے قدرے نزدیک رہے، انھی کی زندگی کے ایک واقعہ کو اکثر دہراتے رہے۔ ایک بار جوش، فانی بدایونی سے ملنے ان کے یہاں گئے۔ فانی نے جوش کا حال احوال پوچھا، تو جوش کہنے لگے: ''گرمی بہت بڑھ گئی ہے۔ میرے جوتے میں کیل نکل آیا ہے، جو بہت تنگ کر رہا ہے۔ آٹا بہت مہنگا ہوگیا ہے...'' ''کیا بکواس کر رہے ہو، جوش! فانی نے قدرے کھیج کر کہا۔ ''غزل عرض کر رہا ہوں جناب!'' جوش نے جواب دیا! عشرت اس سلسلے میں جوش کے پکے ہمنوا تھے۔ وہ بھی جوش ہی کی طرح رسمی روایتی غزل کے ہر شعر کے جداگانہ مفہوم کے حامی نہیں تھے۔ ایسی غزل کو اکثر 'ایک بیکار صنف' ہی قرار دیتے رہے۔ بیشتر غزل گو شعرا کی رائے نہ سہی مگر مذاق کی اس بات سے حظ اٹھانے میں تو کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ بات اکثر شعرا کی سمجھ میں تو آتی تھی، مگر ان کی باتوں سے حظ اٹھانے کے باوجود ان سے اتفاق کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ ان کے بیشتر ہمعصر شعرا کی غزلیات ہمیشہ کی طرح اپنے ہی رنگ میں رواں دواں رہیں...

اور عشرت نے ایک بار یہ پوچھے جانے پر کہ بہترین غزل سے متعلق آپ کا اپنا نظریہ کیا ہے، ایک لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد کچھ یوں کہنا شروع کیا: ''میں غزل یعنی بہترین غزل کو لفظوں میں تو بیان نہیں کر سکتا، ہاں، ایک اچھی غزل آج کے دور میں کیا ہو سکتی ہے، یا پھر ہونی چاہیے، اس کی مثال ضرور پیش کر سکتا ہوں۔ پر یہ ضرور دھیان میں رہے کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ آپ کی یا کسی اور کی کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔''

انھوں نے اپنی غزل پیش کر دی، جو بہت پسند کی گئی اور عشرت مشاعرہ لوٹ کر لے گئے۔

زباں میٹھی ہے، لب ہنستے ہیں، صورت بھولی بھولی ہے
سراب حسن ہے یہ ناؤ یاں ہم نے ڈبو لی ہے

اور سامعین پر ایک عجیب سا عالم طاری ہوگیا۔ وہ نوجوان ساتھی، جن کا اردو زبان سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا جھوم اٹھے۔ مشاعرہ خالص ادبی ماحول کی پہچان بن گیا اور عشرت شعر پیش کرتے گئے۔

بہا کر اشک خون، دن رات کاٹے ہیں محبت میں
شمار سجدہ کو ہم نے یہی مالا پرو لی ہے

کچھ اس انداز سے انھوں نے یہ شعر پڑھا، یقیناً ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے شاعر کی پلکیں سرخ موتیوں کی مالا پرو رہی ہوں۔ زبان اور معنی کے اعتبار سے اگلا شعر اپنے ہی انداز کا تھا۔

ستمگر کہہ دیا ہم نے تو کیوں تم اس قدر بگڑے
چلو جانے بھی دو، یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے!

'عاشقوں کی بولی ٹھولی' کے ٹکڑے کا جواب نہیں۔ پورے پانی پت میں ایک ضرب المثل کی طرح چھا گیا اور ایک ایک کی زبان پر آ گیا...

اور اگلے شعر نے تو سامعین پر عجیب طرح کا جادو سا کر دیا۔

یہ ہے اک معجزہ یا جذب الفت ہے کہ فرقت میں
تری تصویر کو ہم نے بلایا ہے، وہ بولی ہے!

ہر شعر میں کوئی نہ کوئی نئی بات سامنے آ رہی تھی۔ مضامین کی مناسبت نہ ہوتے ہوئے بھی ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ایک ہی کہانی کے مختلف پہلوؤں کی ویڈیوگرافی کی جا رہی ہے۔

الٰہی خیر ہو کیوں پوچھتے ہیں وہ پتہ میرا
قیامت راہ دکھلانے کو ان کے ساتھ ہو لی ہے!

'وہ'، 'میرا' یعنی 'میں' اور 'قیامت' ایک دلچسپ کہانی کے مختلف کردار چن کر بات آگے ہی بڑھاتے جا رہے ہیں... اور پھر اگلے شعر میں فلسفۂ موت و حیات کی بات کرتے ہوئے عشرت اور دو قدم آگے نکلتے ہیں تو کچھ اور ہی ماحول تیار ہونے لگتا ہے۔

مری ہستی کا کیا مقصد ہے اس کو کیا کوئی سمجھے
گرہ تھی یہ مگر آ کر اجل نے خوب کھولی ہے!

'مری ہستی کا مقصد' واقعی ایک ٹیڑھی پہیلی ہے۔ اسے سمجھ پانا یقیناً آسان نہیں۔ یہ ایک پیچیدہ گانٹھ ہے۔ مگر دیکھیے 'آخر اجل نے خوب کھولی ہے' کسی ذہن میں نہیں ابھر رہا تھا مخمور دہلوی کا یہ شعر۔

دم آخر بس اک ہچکی سی ساری داستاں کہہ دی
فسانہ زیست کا اس سے بھی کم کہتے تو کیا کہتے؟

اور پھر دو قدم آگے بڑھ کر انھوں نے یہ شعر پیش کیا۔

دیار عشق میں پیہم سفر آئین قدرت ہے
اجل ہے زندگی اس میں، خموشی اس کی بولی ہے

اور پھر دیکھیے ایک اور ہی انداز میں ایک اور منظر دکھاتے ہوئے کیا فرماتے ہیں۔

کھلا ہے آج صحرا میں جو کثرت سے گل لالہ
ترے کشتوں نے کیا زیر زمیں یہ کھیلی ہوئی ہے؟

اور پھر مقطع میں 'غزل کیا ہے؟' کے سوال کا جواب جس خوبصورت ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

پس از مدت تقاضائے محبت سے غزل لکھی
غزل کیا ہے چمن والو یہ تو کلیوں کی جھولی ہے!

غزل کو 'کلیوں کی جھولی' کہنا ڈاکٹر عشرت حافظ آبادی ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ یہاں وہ کئی سوالوں کا جواب دے رہے ہیں۔ وہ اکثر غزل نہیں کہتے تھے۔ اکثر نظم پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ لیکن جوش ملیح آبادی کے مستند الفاظ میں وہ کوئی ''ڈیڑھ آنے والی بیڑی نہیں تھے جو ایک دم کچھ کہنے کے بعد ترقی پسند شعرا کی طرح ایک دم ٹھُس ہو جائے۔'' وہ تو ایک شاعر تھے، بنیادی شاعر جو زندگی بھر اپنے مزاج ہی کی شاعری تخلیق فرماتے رہتے۔ ٹھیک ہے ان کی جو غزلیں آج ہمارے پاس ہیں وہ عام شعرا کی غزلوں کی طرح سیکڑوں کی تعداد میں نہیں، مگر ان کا اپنا ہی مزاج ہے۔ اپنی ہی شان نزول ہے۔ ان کا اپنا ہی رنگ ہے اور اپنا ہی نرالا پن۔ ان کے اسی انداز کی بنا پر عشرت کی غزل کو عشرت ہی کی غزل کہہ سکتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی دوسرا لفظ یا نام ڈھونڈ نکالنا یا تجویز کر پانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا۔

■

Dr. 'Kumar' Panipati
1375/ MIG-B, Sector 11-12
New Housing Board Colony
Panipat - 132103 (Haryana)
Mob.:09253193704

شاہد احمد

حسرت جے پوری اور آبشارِ غزل

جب ہم اردو شاعری و غزل کی تاریخ کے اوراق الٹتے ہیں تو ہمیں میر، غالب اور مومن کی غزلیں مسرور و ممنون کرتی نظر آتی ہیں۔ وہیں داغ اور جگر کا رنگِ سخن اردو شاعری کی جان ہے۔ حسرت جے پوری بھی اسی مزاج کے روح رواں ہیں۔ ان کی غزلیں، اور نغمے خود ان کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کی رومانی غزلوں اور نغموں نے پوری دنیا کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

حسرت ہمارے دم سے ہے یہ سرخیِ شفق
یہ چرخ خون روئے گا گر ہم نہیں رہے

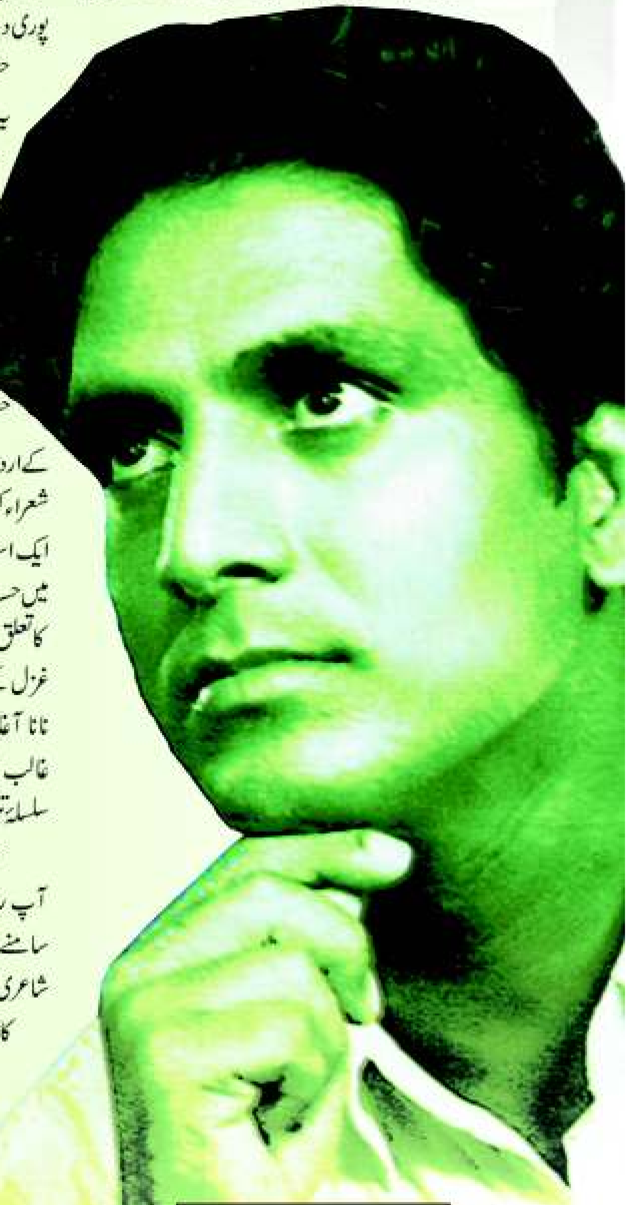

حسرت جے پوری کا اصل نام اقبال حسین تھا۔ 15/اپریل 1922 کو گلابی نگر شہر جے پور میں آنکھیں کھولی۔ اردو، فارسی، اور انگریزی میں تعلیم حاصل کی۔ آپ نے تقریباً سترہ برس کی عمر میں اپنی شاعری کی شروعات کی۔ شاعری آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ اپنے نانا فدا حسین فدا جے پوری سے اصلاح لیتے تھے جو آپ کے اردو اور فارسی کے استاد بھی تھے۔ آپ کی رہائش گاہ پر شعراء کرام کا مجمع ہمیشہ لگا رہتا تھا چونکہ آپ جے پور میں ایک استاد شاعر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی شعری ماحول میں حسرت کی شاعری پروان چڑھی۔ حسرت جے پوری کا تعلق غالب اسکول سے تھا۔ چونکہ آپ کا سلسلہ اردو غزل کے عظیم شاعر مرزا غالب تک پہنچتا ہے۔ آپ کے نانا آغا دہلوی کے شاگرد تھے اور آغا دہلوی کا شمار مرزا غالب کے شاگردوں میں ہوتا تھا۔ اسی نسبت سے آپ کا سلسلۂ تلمذ مرزا غالب تک پہنچتا ہے۔

حسرت جے پوری کی عمر جب بیس برس کی تھی تو آپ رادھا نام کی ایک لڑکی (جو کہ آپ کے گھر کے سامنے رہتی تھی) کے خاموش عشق میں ایسے مبتلا ہوئے کہ شاعری کی سیڑھیاں چڑھنے لگے اور اس کی یاد میں لفظوں کا ایسا تانا بانا بنا کہ ملک کے ہزاروں نوجوانوں کو اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لیے بہترین غزلیں اور نغمے دے دیے۔ حسرت خود رقم طراز ہیں کہ:

''شعر و شاعری کی تعلیم میں نے اپنے نانا جان سے حاصل کی لیکن عشق کا سبق رادھا نے پڑھوایا''

رادھا اکثر جھروکے پہ آیا جایا کرتی تھی جسے دیکھ کر حسرت کہہ اٹھتے تھے

تو جھروکے سے جو جھانکے تو میں اتنا پوچھوں
میرے محبوب تجھے پیار کروں یا نہ کروں

مزید یہ کہ

تم سامنے بیٹھی ہو اور جان نکل جائے
مرنا تو کسی دن ہے ارمان نکل جائے

حسرت جے پوری سہل ممتنع کے قائل ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنی شاعری میں عام فہم، پراثر اور پرکیف لب و لہجہ اختیار کیا۔ مشکل الفاظ سے پرہیز کیا اور کہا کہ مشکل الفاظ کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ وہ آسان ہو جائے اور ہر کوئی ان سے متاثر ہو سکے۔ بقول حسرت جے پوری:

''شاعری خداداد ہے۔ شاعر بنتے نہیں اللہ پیدا کرتا ہے۔''

حسرت جے پوری اردو کے عظیم شاعر مولانا حسرت موہانی سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ اسی نسبت سے آپ نے اپنا تخلص حسرت اختیار کیا۔ ان کی پہلی غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو

کس ادا سے وہ جان لیتے ہیں
مرنے والے بھی مان لیتے ہیں

حسرت جے پوری نے 1940 میں تلاش معاش کے لیے بمبئی کا رخ کیا اور تقریباً آٹھ سال بس کنڈکٹری کی۔ راہوں میں کئی تکالیف اٹھائیں لیکن کبھی ہمت نہیں ہاری۔ زندگی میں جو کچھ دیکھا محسوس کیا اسے اپنے الفاظ دے دیے۔ آپ دکھ اٹھاتے رہے، مسکراتے رہے، گنگناتے رہے، اور ان کی غزلیں اور نغمے انھیں سکون بخشتے رہے۔ فٹ پاتھ پہ ان کے ساتھ رہنے والے ان کے ساتھی ان کی محفل میں کردار نبھاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ عزم محکم ہو تو خود راہیں نکل آتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو

ظلمت شب میں بھٹکتے ہوئے راہی کے لیے
عزم محکم ہو تو راہیں بھی نکل آتی ہیں
اپنی منزل پہ وہ انسان پہنچ جاتا ہے
بجلیاں خود اسے قندیلیں سی دکھلاتی ہیں

اور اسی عزم محکم کا اثر رنگ لاتا رہا۔ دن میں بس کنڈکٹری کرتے اور رات کو بزم سخن سجاتے اور اسی مشق سخن نے انھیں ایک بس کنڈکٹر سے عظیم المرتبت شاعر اور گیت گار بنا دیا۔ جتنے ایوارڈ حسرت جے پوری کو ملے ہیں اتنے

شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوئے ہوں۔

حسرت جے پوری کی شاعری میں جو فنکارانہ حسن اور پرکاری ہے وہ دل کو چھو لینے والی ہے جس کا اعتراف ہر صاحب ذوق نے کیا ہے اور اسے احساس کی شدت کہیے یا ان کی سحر بیانی۔ ان کے اشعار کا تاثر ہر شعر میں اور ہر بار نئے انداز سے ابھر کر دل کے تاروں کو جھنجھوڑتا ہے، ان کے الفاظ خود بخود ترنم بکھیرنے اور گنگنانے لگتے ہیں، پڑھنے اور سننے والے پر ایک پرکیف نشہ طاری ہوجاتا ہے۔

مجھ سے خود ہے چمن کی زیبائی
میں گلوں کا کوئی سفیر نہیں

مزید یہ کہ۔

حسرت جہاں میں اور ہیں لاکھوں غزل سرا
وہ کیا غزل جو ہوش جہاں کے اڑا نہ دے

حسرت جے پوری غزل کی اہمیت ومقبولیت اور اس کی عظمت کے قائل ہیں جس کا اعتراف اور غزل سے اپنی محبت کا اظہار اپنی غزلوں میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

ہے سہانہ غزل کا سفر
ختم ہوگا نہ یہ عمر بھر
میر و غالب بھی شیدائی تھے
اس حسینہ پہ دونوں بشر
ذوق و مومن بھی پروانے تھے
ہے یہ شمع بڑی معتبر
چلتی آئی ہے صدیوں سے یہ
لکھتے آئے ہیں داغ و ظفر
ابتدا کرگئے ہیں ولی
انتہا کرگئے ہیں جگر

ہر زباں پر ہے چھائی ہوئی
دشمنوں کی لگے نہ نظر
اس کے حسرت بھی شیدائی ہیں
بات اتنی سی ہے مختصر

حسرت جے پوری کی غزل کا مجموعہ 'آبشار غزل' کے عنوان سے نومبر 1989 میں شائع ہوا جس میں تقریباً 128 غزلیں شامل ہیں۔ ایک ہی صفحہ پر اردو اور ناگری لپی میں غزلیں یکجا کی گئی ہیں۔ پیش لفظ فیاض رفعت نے قلم بند کیا ہے۔ حسرت جے پوری کی غزل پر فیاض رفعت نے اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کیا ہے:

''حسرت کی لفظیات قدیم و جدید کا بہترین امتزاج ہے مگر انھوں نے قدیم لفظوں کو نئی شکل عطا کی ہے۔ خوشبو، آنسو، جادو، چاند، پتھر، شبنم، آنچل، پائل، دھنک، نیند، تنہائی، سناٹا، مفلسی، مجبوری، درد والم، بے کسی، فراق، تاثر، بیلا، گلاب، چمپا، چمیلی جیسے الفاظ استعاروں کی صورت میں غیر شعوری طور پر حسرت کی شاعری میں جگہ پاتے گئے۔ ان لفظوں میں حسرت کی شاعری کی دنیا آباد ہے۔'' (آبشار غزل، ص7)

بلاشبہ حسرت کی شاعری میں پانی اور پتھر کے استعاروں کا استعمال انتہائی خوبصورتی سے ہوا ہے۔

بات سنتا نہیں وہ جان چمن پتھر کا
مجھ کو محبوب ملا شعلہ بدن پتھر کا
سانولا رنگ ہے کیا انگ ہے اللہ اللہ
صرف اتنی ہے کمی یار کا من پتھر کا
پھول کے بدلے برستے ہیں جفا کے پتھر
ہائے اس دور میں ہے اب تو چلن پتھر کا

کون بنیاد رکھے ماہ لقا پانی پر
آشیاں کون بناتا ہے بھلا پانی پر
آپ کے حسن خراماں کے تصدق جاؤں
آپ چلتے ہیں کہ چلتی ہے صبا پانی پر

خود ہی لے کر گیا طوفان کنارے اس کو
وہ سفینہ تیری یادوں میں چلا پانی پر
یار کو جھوٹی محبت تھی کچھ ایسی حسرت
جس طرح نقش بناتی ہے ہوا پانی پر

حسرت جے پوری کی غزل گوئی کو موضوعات کے لحاظ سے دیکھیں تو اس میں مختلف النوع مضامین کے درمیان ایک خاص موضوع عورت کا تصور بھی رہا ہے۔ حسرت عورت کی شان وعظمت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ ان کے نزدیک عورت اللہ کی رحمت کا وہ شاہکار ہے جس کے مراتب کو ترازو میں تولا نہیں جاسکتا۔

اوتار و پیمبر کو جنم جس نے دیا ہے
اللہ کی رحمت کا وہ شہکار ہے عورت
عورت نہیں ہوتی تو جہاں کچھ نہیں ہوتا
دل جس پہ نچھاور ہے وہ دلدار ہے عورت
عورت کے مراتب بھی کوئی کم تو نہیں
دنیائے محبت کی علمبردار ہے عورت

حسرت جے پوری کی جو بھی تخلیقات منظر عام پر آئیں اس پر اگر ناقدانہ نظر ڈالیں تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان کے فلمی گیتوں کے علاوہ ان کی اردو شاعری اور غزل کی خاموش خدمت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جو انھیں ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے روشناس کراتی ہے۔ ان کی اسی ادبی خدمات کے پیش نظر دوسری عظیم الشان عالمی اردو کانفرنس کے چوتھے اجلاس میں جو 11 فروری 1989 کو دہلی کے پرگتی میدان میں منعقد ہوئی تھی۔ حسرت جے پوری کو 'جوش ملیح آبادی عالمی ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ حسرت جے پوری 77 سال کی عمر میں 1999 میں اس دارفانی سے کوچ کرگئے۔

■

Shahid Ahmed
24, Behind Kalka Mata Temple
Ganesh Nagar Pahada
Udaipur - 313001 (Rajasthan)
Mob.:08107868785

حسرت جے پوری کی جو بھی تخلیقات منظرعام پر آئیں اس پر اگر ناقدانہ نظر ڈالیں تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان کے فلمی گیتوں کے علاوہ ان کی اردو شاعری اور غزل کی خاموش خدمت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا. جو انہیں ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے روشناس کراتی ہے. ان کی اسی ادبی خدمات کے پیش نظر دوسری عظیم الشان عالمی اردو کانفرنس کے چوتھے اجلاس میں جو 11 فروری 1989 کو دہلی کے پرگتی میدان میں منعقد ہوئی تھی. حسرت جے پوری کو 'جوش ملیح آبادی عالمی ایوارڈ' سے نوازا گیا. حسرت جے پوری 77 سال کی عمر میں 1999 میں اس دارفانی سے کوچ کرگئے.

ندیم راعی مرادآبادی

امیر تغزل قمر مرادآبادی

قمر مرادآبادی ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے نئی روایت قائم کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی اور تقریباً نصف صدی تک اُردو غزل کی زُلف سنوارنے میں پیش پیش رہے۔

پولیس انسپکٹر جناب ضیاالحق کے یہاں سراج الحق قمر مرادبادی 8 اگست 1910 کو پیدا ہوئے۔ آپ کی دو شادیاں ہوئیں پہلی سن بلوغ کو پہنچتے ہی ہوئی تھی جس سے ایک بیٹا منظر الاسلام منظر تمنائی کے نام سے مشہور ہیں اور پاکستان کے ساکن ہیں دوسری شادی محترمہ تسنیم فاطمہ سے ہوئی، جن سے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔

15 سال کی عمر میں اپنی پہلی غزل مرادآبادی نمائش کے آل انڈیا مشاعرے میں پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ قمر مرادآبادی نے اپنے بڑے بھائی شرافت حسین کی صحبت میں رہ کر اشعار کہنے شروع کیے۔ شرافت حسین فن موسیقی کے ماہر تھے موسیقی سے والہانہ لگاؤ ہی سخن فہمی کی تحریک بنی اور تیرہ سال کی عمر میں اشعار کہنے شروع کر دیے۔ کلام پر اصلاح معروف معالج و استادِ سخن حکیم اعجاز احمد قیصر نے دی بعدہٗ قاضی شہاب الدین اثر مرادآبادی سے شرف تلمذ حاصل کیا جو استاد ذوق کے تلامذہ میں سے تھے۔ قمر صاحب کے دادا ظہور الحق کے بھائی مولوی احمد حسین تمنا مصحفی امروہوی کے شاگرد تھے۔ اس طرح قمر مرادآبادی نے ذوق اور مصحفی دونوں کے فن اور اسلوب شاعری سے فیض اٹھایا۔

حضرت جگر مرادآبادی نے قمر مرادآبادی کے مجموعہ کلام 'ماہِ تمام' میں شائع ہوئے، 14 / جون 1960 کے ایک اقتباس میں اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار کیا تھا:

''حضرت قمر مرادآبادی نہ صرف میرے، بہت دیرینہ مخلص دوست ہیں بلکہ ہم عصر، ہم مذاق اور ہم طبیعت و بلند پایہ شاعر بھی ہیں ان کا مجموعہ کلام زیر طبع ہے...... وہ ایک صاحب کشف و حال شاعر ہیں ان میں اور ان کی شخصیت میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ہونے چاہئیں۔''

قمر مرادآبادی شریف النفس، منکسر المزاج وضع دار، خوددار اور غیور و حساس تھے۔ مشرقی انداز اور مشرقی روایات سے انھیں گہری عقیدت تھی، بڑوں کی عزت کرتے چھوٹوں سے شفقت سے پیش آتے۔ تصنع و بناوٹ سے انھیں سروکار نہ تھا۔ رواداری ان کا وصفِ خاص تھا ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ حضرت جگر مرادآبادی جیسی شخصیت سے ان کی رفاقت مثالی تھی جب آپ جگر صاحب سے ان کی رہائش گونڈہ ملنے جاتے تو نہایت خاموشی سے ایک طرف بیٹھے رہتے۔ جگر صاحب تمام ملنے جلنے والوں سے ملاقاتیں کرتے رہتے نہ تو قمر صاحب ان کو اپنی طرف مخاطب کرتے اور نہ ہی جگر صاحب ان سے کچھ کہتے تاہم فرصت ملتے ہی اب صرف اور صرف قمر مرادآبادی سے محوِ گفتگو ہو جاتے اب چاہے آپ کے دیرینہ دوست مجسٹریٹ عبدالحمید آئیں یا پھر آپ کے راز دار ہم نوالہ ہم پیالہ گونڈہ کے تحصیل دار جناب قیس العدائی فاروقی ہی کیوں نہ ہوں اس وقت کسی کو مداخلت کی اجازت نہ تھی جگر صاحب کا کہنا تھا کہ اب وہ اپنے گھر کی بات کر رہے ہیں اپنی سرزمین مرادآباد کا حال چال پوچھنے میں محو ہیں۔

قمر مرادآبادی اپنی غزلوں سے اُس زمانے میں داد و تحسین حاصل کر رہے تھے جب جگر مرادآبادی کا دَور دورہ تھا، جن کی غزلیں پورے ملک میں گلی گلی کوچے کوچے گنگنائی و سراہی جا رہی تھیں جن کا جادو چہار سُو سر چڑھ کر بول رہا تھا لوگ دیوانہ وار جگر اور جگر کے کلام کو سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ ملک میں نہ جانے کتنے نوجوان شعرا نے جگر کی تقلید میں مے نوشی شروع کر دی تھی اور زلفیں بڑھالی تھیں یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کوئی جگر یا جگر جیسا نہ بن سکا۔ قمر مرادآبادی بھی تو جگر کے شہر سے وابستہ تھے جس کے ذرہ ذرہ میں جگر کی غزلوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی وہیں قمر مرادآبادی کا کلام بھی لوگوں کو مسحور کر رہا تھا۔ لوگ قمر صاحب کو بھی سر آنکھوں پر بٹھا رہے تھے۔ مولانا نشور واحدی نے قمر مرادآبادی کے اُس دَور کی شاعری کو 'ٹھنڈی روشنی' سے تعبیر کیا ہے۔

''قمر دوپہر کی دھوپ کا شاعر نہیں جہاں جذبات خام اور مشتعل ہوتے ہیں وہ صبح کی پہلی کرن کی تلاش میں اندھیری راتوں کی چادر کھینچ رہا ہے اور ہوس کی گلیوں میں انتقاماً چکر لگا رہا ہے وہ اس تاریکی میں ایک قدرتی روشنی کی طرح ہمیں صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔''

قمر مرادآبادی نزاکتِ خیال اور تہذیب عاشقی کے مغنی تھے۔ ان کی شخصیت میں جو نرمی دلگدازی و اخلاص تھا وہی ان کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے آپ کے کلام میں رنگ افشاں جذبات، مجروح تمنائیں، خون کشتہ اور آرزوؤں کا جمالیاتی اظہار جگہ بہ جگہ ملتا ہے۔ ان کے یہاں ایک مخصوص انداز کا تصورِ حسن و عشق ہے جس میں ایک رنگِ عشق خوددار اور حسن مفرد رکار ہے اور دوسرا رنگ دردمندی اور سوز و گداز کا ہے۔

گر جانتے تو ان کی طرف دیکھتے نہ ہم
یہ کیا خبر تھی تاب نظر بھی نہ لائیں گے

مرنے کا اپنے اور کوئی غم نہیں قمر
یہ غم ضرور ہے کہ انھیں یاد آئیں گے

کبھی اضطراب غم میں جو نکل گئی ہیں آہیں
یہ دعا بھی مانگ لی ہے کہ اثر نہ ہو الٰہی

زندگی ہی کام آئی انتظارِ دوست میں
زندگی کو مفت کا اک دردِ سر سمجھا تھا میں

حضرت قمر مرادآبادی نے محض تغزل کی نقش گری پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس دور کے مجموعی آہنگ کو اپنی شخصیت کے حوالے سے محسوس کرانے اور پہچاننے کی کوشش کی ہے اس لیے ان کی شاعری میں آج کے انسان کی الجھی ہوئی نفسیات، پریشان نظری اور بے چارگی کی تصویر بھی ملتی ہے۔

ہم نے ہی اپنے خوں سے سینچا تھا گلستاں
محروم رنگ و بو سے رہے تو ہمیں رہے

زندگی دل کی لطافت پہ گراں تھی ورنہ
ہم ابھی اور بھی جیتے غمِ جاناں کے لیے

دل کو کیا کہیے کہ ہر وقت نیا غم مانگے
دشمنِ جاں کبھی مانگے کبھی ہم دم مانگے

ہر حادثے کے ساتھ سنواریں گے زندگی
ہر غم کو اک حیات کا عنواں کہیں گے ہم

جنت نشاں اسکول کی سالانہ میگزین کے ایک مضمون میں محترمہ توحید فاطمہ نے لکھا ہے کہ قمر مرادآبادی کے انتقال سے تقریباً ایک ماہ قبل آپ کے صاحبزادے وہاج الحق کاشف بن قمر، جوان دنوں ڈی آئی جی میرٹھ کے پی اے تھے، نے ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع دی کہ وہ شام تک اپنے گھر مرادآباد آرہے ہیں ان دنوں میرٹھ میں زبردست فساد بپا تھا گھر کے سبھی افراد کو ان کا بے صبری سے انتظار تھا لیکن اس رات وہ اپنے گھر مرادآباد نہ آسکے صبح ہونے پر قمر صاحب نے کہا کہ ''یہ رات بڑی کرب سے گزری ہے ہر آہٹ پر وہاج کے آنے کا شبہ ہوتا'' اور بڑے پُروقار انداز میں یہ شعر کہہ دیا۔

تمام رات ترا انتظار کیا معنی
تمام عمر ترا انتظار کرنا ہے

دوپہر ہوتے ہوتے وہاج الحق کی گھر واپسی ہوئی اور روٹھی ہوئی خوشیاں واپس آگئیں سب نے چین کی سانس لی اسی مضمون میں صاحبزادی توحید فاطمہ نے انکشاف کیا ہے کہ انھوں نے اُردو کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا تھا جو کچھ خشک سا تھا تاہم بیٹی نے اپنے والد محترم سے اصرار کیا کہ وہ اردو پر کوئی شعر کہہ دیں اور قمر صاحب یوں گویا ہوئے۔

خون بن کے رگ و پے میں رواں ہے اُردو
سچ تو یہ ہے مرا دل ہے مری جاں ہے اُردو

حضرت قمر کے کلام میں فکر و تخیل کی غیر معمولی گہرائی وسیع مطالعہ اور بے انتہا فنی ولسانی بصیرت دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے بے حد آسان و عام فہم زبان و بیان کا استعمال کیا ہے جو معمولی پڑھا لکھا بھی آسانی سے سمجھ سکے لیکن ہر شعر میں تغزل کا رنگ ضرور ملتا ہے۔

دولتِ غم بھی بہ اندازۂ غم دیتے ہیں
ظرف کم ہوتا ہے جس کا اُسے کم دیتے ہیں
ان کی بخشش کا ہے انداز بھی کتنا معصوم
مہرباں ہوتے ہیں جس پر اسے غم دیتے ہیں

ہر سانس میں ایک تازہ چبھن دیکھ رہا ہوں
پھر مرحلۂ دار و رسن دیکھ رہا ہوں
سب دیکھتے ہیں وقت کے رخسار کا غازہ
میں وقت کے ماتھے کی شکن دیکھ رہا ہوں

بے سبب ہوتی نہیں رسوائیاں
کچھ حقیقت تھی تو افسانے بنے

قمر مرادآبادی کی غزل گوئی کلاسیکی غزل کی روایت کی توسیع کرتی ہے وہ غزل کے مزاج داں اور مزاج شناس ہیں اور انھوں نے ایک خاص مقام بنایا ہے بقول وسیم بریلوی:

''قمر کا شمار اس دور کے چند باشعور وضع دار شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے غزل کی صدیوں پرانی روایت کا احترام بھی کیا ہے اور سرعت سے بدلتے ہوئے حالات کی شعلہ مزاجی کا ساتھ بھی دیا ہے ان کی غزلیات کہنہ مشقی اور فنی چابکدستی کی امانتدار ضرور ہیں مگر انھیں اکثر پرکار کی طرح اپنے مرکز سے نہ ہٹنے والے اساتذہ کی محض روایتی غزل گوئی سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے چونکہ ان کا مزاج شاعر کی طرح لطیف نرم اور سبک سیر ہے اور یہی وہ عناصر ہیں جن سے غزل کی داخلی فضا کا خمیر اٹھتا ہے''۔

معروف مفکر و دانشور حضرت عزیز حسن علیگ نے قمر مرادآبادی کی غزلوں کو قدیم و جدید کا سنگم قرار دیا ہے اور غزل گو شعراء میں ان کی امتیازی حیثیت کو تسلیم کیا ہے:

''قمر ملک کے ان چند ممتاز غزل گو شعراء میں سے ایک ہیں جو اپنی فکر پر بھروسہ کرتا ہے اپنے وجدان سے فتویٰ لیتا ہے قدما کی روش کا احترام کرتا ہے اپنے دور کے تقاضوں سے واقف ہے غزل کو اس نے نئے نئے لفظوں سے ضرور سنوارا ہے مگر طرز کلام میں قدما کی روش سے تجاوز نہیں کیا ہے اور کامل عزم و احتیاط سے وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو معتدل ہے موثر ہے، دل آویز اور حسین ہے''

حضرت قمر بہترین شاعر ہی نہیں بہترین صحافی اور مصنف بھی تھے۔ قمر صاحب نے کتابت و ادارت کو اپنا پیشہ بنایا آپ یکے بعد دیگرے کئی اخباروں و رسالوں سے جڑے رہے جن میں 'نیر اعظم' ماہنامہ تصویر، ہفت روزہ ریلوے گزٹ قابل ذکر ہیں علاوہ ازیں قمر صاحب نے 'القمر' کے نام سے اپنا ایک ادبی ماہنامہ بھی جاری کیا اور رسالہ ''جگر'' کے دو شمارے بھی آپ کی ادارت میں نکلے ایک روزنامہ 'آواز' کے نام سے جاری کیا۔

حضرت قمر کے معاصر شعرا میں واقف مرادآبادی، علامہ کیف مرادآبادی، سحر انصاری، درد مرادآبادی، میکش مرادآبادی، چندر مرادآبادی، مہر جلالی، پروفیسر ولی حسن پوری، شاہد احسن قابل ذکر ہیں۔

حضرت قمر نے داغ دہلوی، اصغر گونڈوی اور حضرت جگر مرادآبادی پر کتابیں لکھیں علاوہ ازیں مندرجہ ذیل پانچ مجموعہ کلام منظر عام پر آئے۔

نثری تخلیقات: معراج داغ، روح اصغر، آئینہ سکندر

شعری مجموعہ کلام: ماہِ تمام، شعورِ غم، کلیات قمر، شاخِ گل، گلستانِ غزل

فخرِ غزل اور امیرِ تغزل کے خطاب سے سرفراز ہونے والے حضرت قمر ایک عظیم شاعر، صحافی، مصنف ہی نہیں تھے بلکہ مشفق باپ، باوقار شوہر، مخلص دوست، اور بہترین انسان بھی تھے۔ انھوں نے مرادآباد کے ذرہ ذرہ اور ہر انسان سے محبت کی اور آپ کے مطابق ''میری پوری کوشش رہی کہ جگر صاحب کے بعد مرادآباد کے نام کی عظمت اُردو ادب میں قائم رہے۔ دانشوران علی گڑھ نے مجھے 'امیر تغزل' کے خطاب سے نوازا حالانکہ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مرادآباد کی لاج رکھ لی۔ سرزمین مرادآباد میں آنکھ کھولی یہاں کے ہر ذرے ہر انسان سے محبت کرتا ہوں اور یہیں کی خاک میں سما جانے کی آرزو ہے اور حضرت قمر مرادآبادی کی یہ آرزو پایۂ تکمیل تک پہنچی 30 مئی 1987 کی صبح اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے اور دنیائے اُردو ادب میں اپنے مداحوں و پسماندگان کو روتا بلکتا اور آہ و بکا کرتا چھوڑ گئے ہیں۔

یاد کریں گے مدتوں شانہ و آئینہ قمر
بزم سے اُٹھ رہے ہیں ہم زلفِ غزل سنوار کر

■

S.R. Nadeem Raee
198, Chaudhry House, Galshaheed
Moradabad - 244001 (UP)
Mob.:8188937127

محمد یسین قریشی

اردو کی تعلیم میں مدارس کا کردار

برصغیر ہند و پاک میں اردو زبان کی ترویج و ترقی اور اردو ادب کے فروغ میں جو کردار مدارس نے ادا کیا ہے اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ حالانکہ مدارس اسلامیہ کا بنیادی مقصد فروغ اردو نہ ہوکر، دین کی اشاعت ہے۔

ابتدائی دور میں اردو کو گری پڑی یا ریختہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ مہذب اور تعلیم یافتہ طبقہ اس میں درس و تدریس اور خط و کتابت کو عار محسوس کرتا تھا لیکن ولی دکنی کی دہلی آمد کے بعد اس میں ادبی تخلیقات کا باب کھلا۔ اس کے بعد یہ زبان عوام و خواص کی مقبول ترین زبان ہوگئی۔ بعد ازاں جہاں یہ شاہوں کی گود میں کھیلی وہیں ریڑھی اور ٹھیلے والوں کے دلوں پر بھی اس نے راج کیا۔ رفتہ رفتہ وقت گزرتا گیا اور اردو زبان ترقی کے منازل طے کرتی رہی لیکن 1947 میں ایک عظیم سانحہ پیش آیا جب ملک تقسیم ہوگیا جس کے نتیجے میں اردو زبان تعصب کا نشانہ بن گئی۔ اس کو ایک خاص طبقے یعنی مسلمانوں کی زبان تصور کیا جانے لگا۔

ملک تقسیم ہوا اور آہستہ آہستہ اردو کے بال و پر سرکاری اسکولوں و کالجوں سے کاٹے جانے لگے اور رفتہ رفتہ اس متعصبانہ بادِ سموم نے اردو زبان و تعلیم کو اپنی زد میں لے لیا۔ اس پرفتن دور میں صرف ایک ہی جگہ تھی جہاں اردو کی بقا و تحفظ اور فروغ کے لیے حالت نزع میں بادِ نسیم کا کام سرانجام دیا گیا۔ وہ تھے مدارس اسلامیہ اور علماءِ کرام۔

مدارس اسلامیہ کا اصل مقصد دین کا تحفظ ہے جس کے لیے وہاں قرآن و حدیث وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ چونکہ یہ تمام سرمایہ عربی زبان میں ہے اور اس کا براہِ راست سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے اس کے مطالب و مفاہیم کو سمجھنے کے لیے ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جو عام فہم ہو اور آسانی سے سمجھ میں آسکے۔ چونکہ یہ کام دو سطحوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اوّل معلومات کو حاصل کرنا اور دوسرے معلومات کو دوسروں تک پہنچانا۔ اگر ہم معلومات کو حاصل کرنے کی بات کریں تو پہلے ہمارا ذہن عربی زبان و ادب کی جانب مبذول ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی دینی معلومات حاصل کرنے کا اصل ماخذ وہی زبان تھی۔ اگر ہم اردو نثر کے اولین نمونوں کی طرف متوجہ ہوں تو ہمیں اردو کے اولین نمونے مذہبی لٹریچر کی صورت میں ہی نظر آتے ہیں۔ 'معراج العاشقین' جو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف ہے جس کی اشاعت اردو کی پہلی نثری کتاب کے طور پر کی گئی تھی اس کا بنیادی مقصد بھی مذہبی تبلیغ ہی تھا۔ اس وقت تک اردو کے مدمقابل کوئی اور دیگر زبان نہیں تھی۔ صرف اردو زبان ہی تبادلہ خیال کا ذریعہ تھی۔ اسی لیے معلومات کو حاصل کرنے کے لیے عربی زبان کے ساتھ اردو زبان ہی مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ حاصل شدہ معلومات کے ابلاغ کا ذریعہ بھی اردو زبان ہی کو بنایا جا رہا تھا۔ علمائے کرام کے وعظ و خطبات اور صوفیاء کرام کے پند و نصائح عام طور سے اردو زبان کے ذریعے سے ہی عوام تک پہنچ رہے تھے۔

اگر تصانیف کا تذکرہ کیا جائے تو اکثر عربی و فارسی زبانوں سے ہی مصنفین نے استفادہ کیا ہے لیکن تصنیف و تالیف کا سلسلہ اردو زبان ہی کو بنایا گیا۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قرآن کریم کا اردو میں ترجمہ کیا۔ شاہ اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان تصنیف کی۔ یہ تمام تصانیف اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ایسا حیرت انگیز کارنامہ ہے جن کے مطالعے سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ اردو کے اولین زمانے کی نثر ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جہاں عوام میں ادبی فن پاروں کی مقبولیت کم ہے، وہیں دینی کتابوں کا کاروبار دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ ان میں بہت سی کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے نئے ایڈیشن سال میں کم از کم ایک بار ضرور آجاتے ہیں۔ مذہبی تصانیف کی اسی افراط کی وجہ سے عام طور سے مدارس میں درس و

تدریس کا وسیلہ اردو زبان ہی کو رکھا گیا ہے۔ مدارس کے طلبہ و اساتذہ انھیں کتابوں کا مطالعہ کرکے اپنی تعلیمی لیاقت میں روزافزوں ترقی کرتے رہے ہیں۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بہت سے ایسے صوبے ہیں جن میں اردو زبان سے لوگ بہت کم واقفیت رکھتے ہیں لیکن وہاں بھی مدارس اسلامیہ اپنے طلبا کو اتنی واقفیت ضرور کرا دیتے ہیں کہ وہ اردو کتابوں کا مطالعہ آسانی سے کرسکیں اور اردو زبان میں معیاری خط و کتابت کرسکیں۔

اگر ہم بیرونی ممالک کی بات کریں تو بیرونی ممالک میں بھی مدارس اسلامیہ کی خاصی تعداد ہے۔ راقم الحروف کی گفتگو ایک مفتی صاحب سے ہوئی جن کا تعلق ہندوستان سے ہی ہے لیکن وہ بطور فجی (Fiji) کے ایک مدرسے میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں بھی اکثر مدارس میں عربی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہمارے اکابرین علماء کرام نے بہت سا بیش قیمت سرمایہ اردو زبان میں جمع کیا ہے جس کی پہچان اردو ادب سے شناسائی کے بغیر ناممکن ہے۔

بہت سے لوگ اس بات پر معترض ہیں کہ مدارس میں کوئی ادیب و ناقد یا محقق پیدا نہیں ہوتے۔ تو ان کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کیا یہ سوال کبھی انھوں نے کسی ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ اسکول سے بھی کیا ہے؟ ان کا کام صرف بنیادی ڈھانچہ تیار کرنا ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس مدارس میں ایسی شخصیتیں بھی پیدا ہوتی ہیں جو کارہائے نمایاں انجام دیتی ہیں۔ مولانا علی میاں ندویؒ کی شخصیت ہمارے سامنے ہے جنھوں نے صرف مدارس کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ کارنامہ سرانجام دیا کہ جن کے اوپر یونیورسٹی میں تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، مولوی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا ابوالکلام آزاد، بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، پروفیسر عبدالمغنی اور حیات اللہ انصاری وغیرہ ایسی نہ جانے کتنی شخصیتیں ہیں کہ جن کو اگر اردو ادب سے الگ کردیا جائے تو اردو تاریخ وادب کی مضبوط عمارت منہدم ہوسکتی ہے۔ یہ تمام ہستیوں کا مدارس سے کہیں نہ کہیں ضرور تعلق رہا ہے۔

مدارس اسلامیہ میں اردو کا کوئی مستقل شعبہ نہ ہونے کے باوجود بھی طلبا کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ مشکل مراحل کا آسانی سے مقابلہ کرسکیں۔ مدارس میں طلبا کی ایک انجمن قائم ہوتی ہے جس کے تحت اکثر جمعرات کی شام کو طلبا کا پروگرام ہوتا ہے جس میں طلبہ اپنی یاد کی ہوئی تقریر، حمد، نعت و نظم، اور مکالمے وغیرہ پیش کرتے ہیں اور اس کی نظامت بھی کوئی طالب علم ہی کرتا ہے۔ راقم الحروف کا تعلق ابتدائی تعلیم کے دوران اس انجمن سے رہا ہے جس کے ذریعے سے طلبا کو ایسی مشق کرائی جاتی ہے کہ وہ مجمع عام میں فصیح اردو زبان بول سکتے ہیں۔

خوش خطی بھی مدارس کے طلبہ کا ایک معیاری کام ہے تاکہ وہ اردو کی صحیح املا سیکھ کر بہترین کاتب بن سکیں۔ کمپیوٹر کے آنے سے قبل اردو کتابت کا سہرا انھیں مدارس کے طلبا کے سر باندھا جاتا ہے۔ بلکہ آج بھی اس میدان میں ان کی کارکردگی قابل تحسین ہے۔

اکثر مدارس میں دیواری پرچے شائع ہوتے ہیں جن میں طلبا اپنے خیالات کا اظہار مضامین کے ذریعے کرتے ہیں۔ ان پرچوں کی زبان اردو ہی ہوتی ہے۔ اس کی مثال ام المدارس دارالعلوم دیوبند میں بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔ راقم السطور نے دارالعلوم دیوبند کے صدر دروازے سے ملحق احاطہ مولسری میں اور صدر دروازے میں داخل ہونے پر دیواروں کی دونوں جانب چسپاں ان پرچوں کو بخوبی دیکھا ہے۔

اس کے علاوہ اکثر مدارس میں سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ رسائل بھی شائع ہوتے ہیں جن میں اکثر مذہبی

مدارس اسلامیہ میں اردو کا کوئی مستقل شعبہ نہ ہونے کے باوجود بھی طلبا کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ مشکل مراحل کا آسانی سے مقابلہ کرسکیں. مدارس میں طلبا کی ایک انجمن قائم ہوتی ہے جس کے تحت اکثر جمعرات کی شام کو طلبا کا پروگرام ہوتا ہے جس میں طلبہ اپنی یاد کی ہوئی تقریر, حمد, نعت و نظم, اور مکالمے وغیرہ پیش کرتے ہیں اور اس کی نظامت بھی کوئی طالب علم ہی کرتا ہے. راقم الحروف کا تعلق ابتدائی تعلیم کے دوران اس انجمن سے رہا ہے جس کے ذریعے سے طلبا کو ایسی مشق کرائی جاتی ہے کہ وہ مجمع عام میں فصیح اردو زبان بول سکتے ہیں.

مضامین ہوتے ہیں لیکن ان کی زبان اردو ہی ہوتی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی تصنیف 'بہشتی زیور' جو ایک مقبول عام کتاب ہے اور جس میں مذہبی مسائل کو بیان کیا گیا ہے جس کے مطالعے سے خواتین کی ایک بڑی تعداد مسائل کے ساتھ ساتھ اردو زبان سے واقف ہوگئی ہیں۔ اس کی زبان بھی اردو ہی ہے اور مولانا کا تعلق بھی مدرسے سے ہی ہے۔

مدارس سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد مذہبی امور کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کو اس جانب بھی متوجہ کرتے ہیں کہ آپ کا رشتہ اردو زبان سے بہت عمیق ہے۔ حالانکہ اردو کی آبیاری صرف مسلمانوں ہی نے نہیں کی ہے بلکہ دیگر مذاہب کے لوگوں نے بھی اس کی نوک و پلک کو سنوارا ہے لیکن اگر اس زبان کا خاتمہ ہوتا ہے تو اس میں سب سے زیادہ نقصان امت مسلمہ کا ہی ہوگا۔

بہرکیف اگر مدارس اپنی اس ذمے داری سے سبکدوش ہوجائیں تو پھر کیا ہوگا، سرکاری اداروں میں اردو کی صورتِ حال کیا ہے یہ سب پر عیاں ہے۔ کسی کسی ادارے میں اردو زندہ ہے وہ بھی حالت نزع میں معلوم ہوتی ہے۔ پرائیویٹ اداروں سے اردو کو بالکل ختم کردیا گیا ہے۔ اس صورت حال میں یہی مدارس ہیں جن پر ہماری نظر جاکر ٹھہرتی ہے۔ جہاں اردو کو زندگی بخشنے کے لیے آکسیجن فراہم کی جارہی ہے۔

■

Mohd Yaseen Qureishi
Research Scholar
Gujrat University
Ahmadabad - 380009 (Gujarat)

اردو زبان کے فروغ میں مدارس کی اہمیت

محمد صابر انصاری

اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ اردو محض زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب بھی ہے۔ اردو زبان جو آج بھی تقریباً چار سو سال سے عوام میں مقبول ومحبوب رہی اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا لسانی کردار ہے۔ اردو زبان کی شیرینی وحلاوت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اس کی آبیاری میں بادشاہانِ وقت، صوفیائے کرام کے علاوہ ادیبوں، فنکاروں اور شاعروں کا بھی کلیدی کردار رہا ہے۔ اس کی نشوونما میں ابتدائی عہد سے ہی دینی مدارس نے بھی نمایاں فریضہ انجام دیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، مظاہر العلوم سہارنپور، جامعہ اشرفیہ مبارکپور، جامعہ سلفیہ بنارس، جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ، جامعۃ الہدایہ جے پور اور جامعہ دارالسلام عمرآباد جیسے بڑے مدارس کی اردو زبان وادب کے حوالے سے بڑی اہم خدمات ہیں۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، شیخ المحدثین حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، شیخ التفسیر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاری، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، علامہ حمیدالدین فراہی، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا محمد علی جوہر وغیرہ ایسی شخصیات ہیں جن کا تعلق مدارس سے ہے مگر اردو زبان و ادب سے بھی ان کا گہرا رشتہ رہا ہے۔

اردو زبان کی نشرواشاعت میں مدارس اسلامیہ اور اس کے فیض یافتگان کا عظیم اور نمایاں کردار ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شکیل احمد رقم طراز ہیں کہ:

"اردو کی قبولیت اور اثر پذیری کے صدیوں طویل ارتقائی سفر میں دربار، دبستان، خانقاہ اور بازار بھی کچھ آئے لیکن جس گروہ اور جس اکائی نے اردو زبان وادب کو بہت زیادہ فیض پہنچایا اور متاثر کیا وہ علمائے دین و مدارس ومکاتیب اسلامیہ ہیں۔"

(سہ ماہی دعوت حق، ص 223، جون 2004، تا مئی 2005، خصوصی شمارہ، بہ حوالہ روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی (دینی مدارس نمبر) 31 مارچ 2007، ص 69)

اردو کے عوام کے تعاون سے عوامی زبان بنانے کا شرف علمائے دین اور مدارس ہی کو حاصل ہے۔ اردو کی تعلیم میں مدارس سرفہرست ہیں، ان کی شناخت ہی اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے ہوگئی ہے۔ غیر اردو علاقوں کے طلبا بھی علوم دینیہ کے حصول کے لیے مدارس میں آتے ہیں اور نصابی ضرورتوں کے تحت اردو سے آشنا ہوکر خود میں تحریر وتقریر کی صلاحیت پیدا کرلیتے ہیں۔ یہ طلبا واپس اپنے علاقوں میں جاکر اردو زبان کے فروغ میں معاون ہوتے ہیں۔ بنگال، آسام، گجرات، اڑیسہ، تامل ناڈو اور کرناٹک جیسے صوبوں کے دور دراز علاقوں میں اردو زبان و ادب کی آبیاری کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مدارس اسلامیہ خصوصاً دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، جامعہ اشرفیہ، جامعہ سلفیہ، جامعۃ الفلاح وغیرہ ہیں۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ مختلف ملکوں بالخصوص افریقی اور ایشیائی ممالک میں نیپال، بنگلہ دیش، برما، افغانستان، ایران، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، ملیشیا، یمن، لبنان اور افریقہ کے طلبا بڑی تعداد میں داخلہ لیتے ہیں اور یہاں ایک مدت گزار کر واپس اپنے ملکوں کو جاتے ہیں تو اپنے ساتھ عالمیت اور فضیلت کی ڈگریوں کے ساتھ اردو کے ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے اردو زبان کی شد بد پیدا کرلیتے ہیں، جب کہ بعض طلبہ اردو لکھنے پڑھنے کی اچھی استعداد اپنے اندر پیدا کرلیتے ہیں اور اپنے ملکوں میں ہندوستانی وفود کی ترجمانی اور اردو کتابوں کے ترجمہ کا کارنامہ انجام دیتے ہیں، گویا یہ فضلا اپنے ملکوں میں ہندوستان اور بالخصوص اردو زبان کے خاموش سفیر بن جاتے ہیں۔ اس طرح اردو کا دائرہ صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ مدارس اسلامیہ کے ذریعے اس کا دامن عالمی سطح پر پھیلا ہوا ہے۔ ہر جگہ اردو بولنے اور سمجھنے والے پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر محمد سعود عالمی قاسمی 'اردو کے فروغ میں ملک و بیرون ملک کے مدارس کا کردار' کے عنوان سے اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں:

"2003 میں 'عالمی نظام انصاف' کے کانفرنس، کولمبو میں راقم کی ملاقات مالدیپ کے جسٹس عبدالرشید صاحب سے ہوئی وہ اردو جانتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ جمالیہ میں ہوئی تھی۔

2010 میں ترکی کی ایک کانفرنس میں راقم کی ملاقات جناب یوسف قراچہ سے ہوئی جو دارالعلوم ندوہ العلما لکھنؤ کے قدیم فضلا میں تھے اور ترکی میں تعلیمی و تدریسی فرائض انجام دینے کے ساتھ اردو کی دینی کتابوں کا ترکی میں ترجمہ کرچکے تھے۔ انھوں نے مولانا سید

سلیمان ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی متعدد کتابوں کا ترکی میں ترجمہ کرکے شائع کیا ہے۔ اس طرح نہ صرف ہند اسلامی ثقافت بلکہ اردو زبان کی علمی خدمات انجام دی ہے۔ شہر استنبول کے اسلامی مرکز دارالحکمۃ میں بھی جانے کا اتفاق ہوا، یہاں متعدد ایسے فضلا سے ملاقات ہوئی جو ہندو پاک کے دینی مدرسوں سے فارغ تھے اور اردو زبان وادب سے واقف تھے۔''

(عالمی سہارا، نئی دہلی (خصوصی شمارہ: مدارس اسلامیہ)، 14 جولائی 2012، ص 10)

علمائے کرام نے تصنیف وتالیف کے ذریعے اردو کی نشر واشاعت میں جو حصہ لیا ہے اس حوالے سے مولانا سید محبوب صاحب رضوی رقم طراز ہیں کہ:

''اس کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے، اس کا فی الجملہ اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ صرف دارالعلوم دیوبند کے فضلا نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کی تعداد تقریباً دس ہزار ہے۔ علمائے دارالعلوم دیوبند میں مولانا اشرف علی تھانوی کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ المصنفین دہلی جیسے اداروں کے ذریعے اردو میں جس وقیع اور گراں قدر ذخیرے کا اضافہ ہوا ہے یہ سب مدارس اسلامیہ اور ان کے فضلائے کرام ہی کی دین ہے۔ سرسید مرحوم، علامہ شبلی اور خواجہ الطاف حسین حالی وغیرہ جنھیں اردو زبان کے اساطین کہا جاتا ہے، سب مدارس اسلامیہ ہی کے فیض یافتہ ہیں۔''

(عالمی سہارا، نئی دہلی (خصوصی شمارہ: مدارس اسلامیہ)، 14 جولائی 2012، ص 10، ص 15)

اردو ادب کی تاریخ میں ایسے شاعروں اور ادیبوں کی فہرست لمبی ہے جن کا تعلیمی پس منظر صرف مدرسہ ہی رہا ہے۔ مثلاً اردو تنقید کی پہلی باضابطہ کتاب 'مقدمہ شعرو شاعری' کے مصنف مولانا الطاف حسین حالی (1915-1937) انھوں نے پوری تعلیم عربی مدرسے ہی میں حاصل کی تھی۔ دہلی کے قدیم مدرسہ حسین بخش کو ان کی مادر علمی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ گویا وہ بنیادی طور پر صرف مولوی تھے اور مولویت ہی ان کی شناخت تھی۔

علامہ شبلی نعمانی (1857-1914) جو بہ یک وقت شاعر وادیب بھی ہیں اور ناقد، محقق، مؤرخ اور انشاپرداز بھی۔ انھوں نے 'شعرالعجم' اور 'موازنۂ انیس و دبیر' کے ذریعے تفہیم شعر کے جو اصول وضع کیے اور فنی سطح پر جو نظریات پیش کیے ہیں انھیں شعرونقد کی دنیا میں بڑا اعتبار حاصل ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کسی کالج یا یونیورسٹی کے نہیں بلکہ مدرسے ہی کے پروردہ وپرداختہ تھے۔ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کا نام ان کے اہم اساتذہ میں آتا ہے۔ ان کے تمام کارناموں کو مدرسوں ہی کے کھاتے میں ڈالا جائے گا۔

علامہ نیاز فتح پوری (1884-1968) اردو زبان و ادب کے ان علمائے ارباب قلم میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اردو زبان وادب کی آبیاری میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کو بنانے اور سنوارنے میں وہ اپنے عہد کے شعرا وادبا میں سب سے آگے رہے ہیں اور اس سلسلے کی تمام ناہمواریوں کو ختم کیا ہے۔ انھوں نے 1921 میں 'نگار' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ جاری کیا تھا۔ اس کے ذریعے سے انھوں نے اردو کی بنیادوں کو اجاگر کیا اور فنی ولسانی سطح پر اس کی نوک و پلک درست کی اور اردو زبان و ادب کے خلاف رچی جانے والی سازشوں کو بے نقاب کرکے اس کی صحیح قدر و قیمت کو واضح کیا ہے۔ اپنے ان کارناموں کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں انھیں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے اردو کے متعدد قدآور شعرا وادبا کی رہ نمائی کی ہے۔ انھیں صحیح سمت سفر دکھائی ہے۔ نیاز فتح پوری نے فتح پور کے قدیم مدرسہ اسلامیہ محلہ سید واڑہ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے فن، شخصیت اور فنی ولسانی خدمات پر مقالے لکھے گئے ہیں۔ متعدد لوگوں نے ان پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

جناب رشید حسن خان (1930-2006) شاہجہاں پور کے رہنے والے تھے اور وہیں کے مقامی مدرسہ بحرالعلوم سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اردو زبان کو بنانے اور سنوارنے میں ان کا اہم رول رہا ہے۔ اردو کی املا پر کتابیں لکھیں، رموز اوقاف پر مقالے لکھے، محاورات اور روزمرہ پر مباحث شائع کیے۔ صحیح زبان کیسے لکھی جاتی ہے اور اس کے کیا اصول وضوابط ہیں اس سلسلے میں ان کی متعدد کتابیں موجود ہیں اور بڑے بڑے سمیناروں میں اپنی فنی ولسانی معلومات کے جوہر دکھائے۔ ملک کی متعدد یونیورسٹیوں میں انھوں نے اردو زبان وادب کی املا اور الفاظ کے صحیح و غلط استعمال پر لکچر دیے۔ بے شمار تحقیقی مقالوں کے ممتحن رہے اور خود ان پر بھی تحقیقات ہوئیں اور ڈگریاں حاصل کی گئیں۔ رشید حسن خاں نے اردو زبان کی آرائش وزیبائش اور اس کے فروغ وارتقا کے لیے جو کچھ کیا ہے اسے اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ ان کے سارے کارنامے علمی ولسانی فتوحات کا سہرا مدرسوں کے سر بندھے گا۔

ان کے علاوہ بہت سے ایسے نام ہیں جن کا تعلیمی پس منظر مدرسہ ہی ہے، جن کی فہرست کافی طویل ہے۔ مثلاً فخر مشرق علامہ شفیق جونپوری، فیض احمد فیض، جناب اسرار حسن خان مجروح سلطان پوری، عامر عثمانی، فضا ابن فیضی وغیرہ ہیں۔ اردو کے اخبارات، رسائل اور کتابوں کو خریدنے اور پڑھنے والوں میں مدارس کے طلبا، اساتذہ اور متعلقین پیش پیش رہتے ہیں۔ ان اخبارات و رسائل کے قلم کاروں میں بھی مدرسوں کے فیض یافتہ حضرات اچھی تعداد میں ہوتے ہیں۔ ملک کے مختلف اطراف و اکناف کے مدارس سے جو ماہنامہ، دو ماہی اور سہ ماہی رسالے اور جرائد ومجلّات شائع ہورہے ہیں وہ اپنے مشمولات اور پیش کش کے اعتبار سے معاصر ادبی علمی رسالوں سے کم تر نہیں ہیں۔ ان میں قلم کاروں کی بیش تر تعداد مدارس کے اساتذہ اور فضلا کی ہوتی ہے، جو اردو زبان وادب کے فروغ میں ایک واضح تعاون ہے۔ بقول حقانی القاسمی:

''مدارس اشتعال انگیز صحافت پر نہیں بلکہ اعتدال پسند صحافت پر یقین رکھتے ہیں۔ اخوت ومحبت کے جذبات کو بیدار کرنا اور مثالی معاشرے کی تشکیل کرنا ہی مدارس کے مجلّات کا مقصد ہے اور اپنے اس مقصد میں یہ رسائل بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ ضرورت ہے کہ مدارس کے مجلّات کو بھی تحقیق کا موضوع بنایا جائے اور اس کے مشمولات کے حوالے سے گفتگو کرکے ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے جو آج کے ہندوستانی معاشرے میں عام ہیں۔'' (عالمی سہارا، نئی دہلی 14 جولائی 2012، ص 65)

خلاصہ کلام یہ کہ مدارس کے فیض یافتگان نے گیسوئے اردو کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے کارناموں کا ہر طبقے میں اعتراف کیا گیا ہے اور انھوں نے جو کچھ کیا ہے اسے درجۂ استناد حاصل ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے جو کچھ بھی پڑھا یا سیکھا ہے وہ عربی مدرسوں ہی میں پڑھا یا سیکھا ہے اور ان کا سارا علم مدارس عربیہ کی چہاردیواریوں ہی کا مرہون منت ہے۔ اگر ہم ان شعرا و ادبا کے نام گنوانے لگ جائیں جو شہرت تو کالج اور یونیورسٹیوں کے حوالے سے رکھتے ہیں لیکن ان کی بنیادی تعلیم مدارس عربیہ میں ہی ہوئی تو فہرست بہت لمبی ہوجائے گی۔ ان سب پر گفتگو کے لیے دفتر درکار ہے۔ نہ پوچھیے کیسے کیسے آفتاب وماہتاب مدرسوں میں پروان چڑھے ہیں۔

■

Mohd Sabir Ansari
S R F, Dept of Urdu
Ranchi University- 834008 (Jharkhand)
Mob: 7979735612

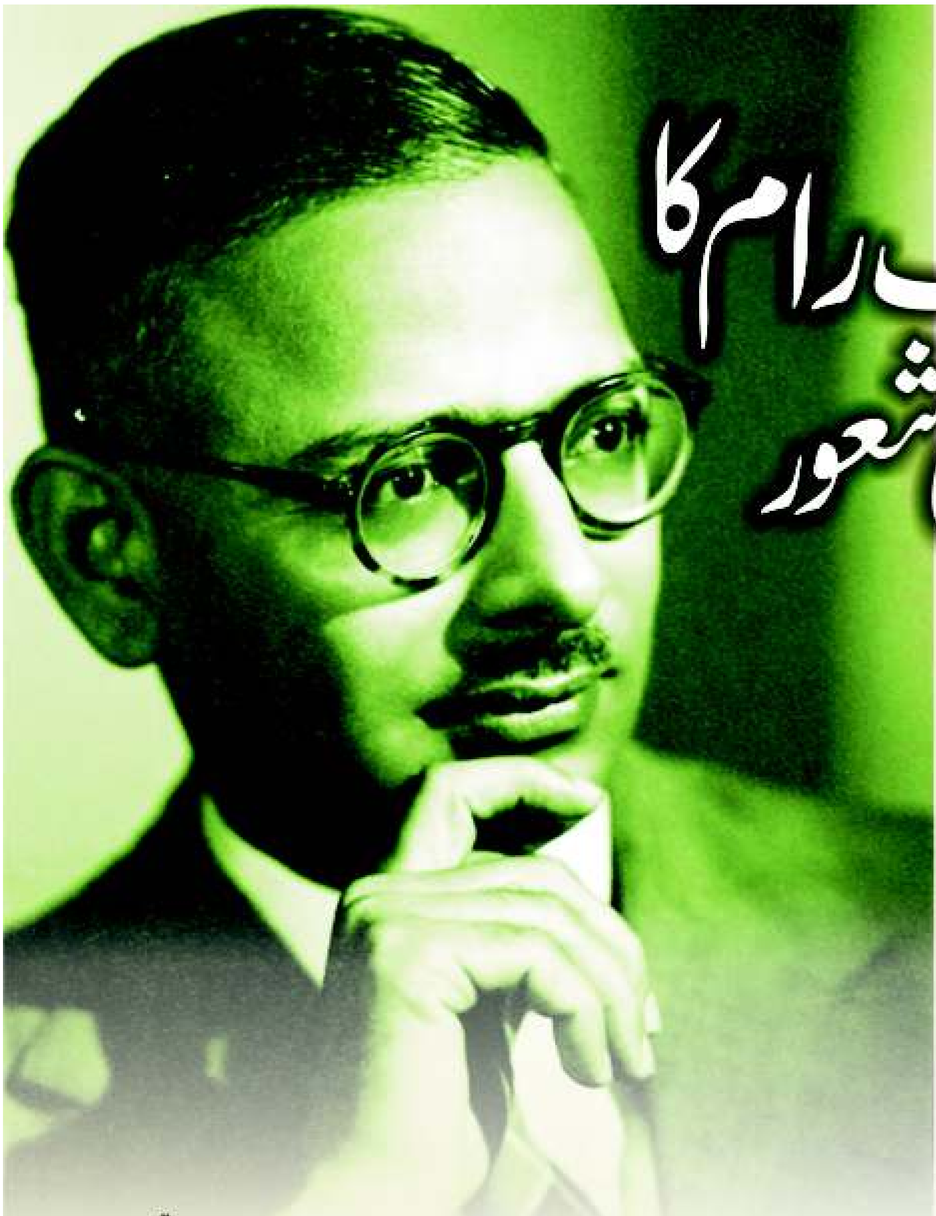

مالک رام کا اسلامی شعور

ندرانہ شفیع

مالک رام اردو دنیا میں بنیادی طور پر محقق کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کے بعض پہلو بھی بہت اہم اور قابل ذکر ہیں جن کی حیثیت مسلم ہے۔ وہ ایک محقق ہونے کے علاوہ تاریخ کے بھی اسکالر ہیں لہٰذا واقعات کی چھان بین اور صحت کا خیال انھوں نے اپنی تحریروں میں حد درجہ پیش نظر رکھا ہے۔ انھوں نے 'سبد چین' اور 'ذکر غالب' میں غالب کے حالات مستند روایت کے ساتھ قلم بند کیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'تلامذہ غالب' میں غالب کے ڈیڑھ سو شاگردوں کے حالات درج کیے ہیں۔ حقیقتاً اس نوع کے تحقیقی کام بے حد دشوار ہوتے ہیں مگر مالک رام اس سے بہتر طور پر عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ 'بابلی تہذیب و تمدن' (دو جلدیں) بھی ان کا بہترین تحقیقی کارنامہ ہے۔ تحقیقی کاموں کو جاری رکھتے ہوئے انھوں نے مولوی مہیش پرشاد کے مرتب کردہ خطوط کی از سر نو تدوین کے ساتھ غالب کے دور اور ان کے معاصرین پر بے شمار مضامین تحریر کیے اس کے علاوہ 'گل رعنا' کے عنوان سے خود غالب کا انتخاب کردہ فارسی کلام بھی شائع کیا۔ فضلی کی 'کربل کتھا' جو پروفیسر مختار الدین احمد کی تلاش تھی مالک رام نے مختار الدین احمد کے ساتھ مل کر اس کے حواشی لکھے اور اس کی نئے سرے سے تدوین کی۔ مالک رام کا ایک قابل ذکر تحقیقی کارنامہ 'تذکرہ معاصرین' کی اشاعت بھی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرہ، غبار خاطر اور خطبات کی بھی تدوین کی۔

مالک رام کی دلچسپی اور شغف کا میدان اسلامیات بھی ہے۔ وہ قرآن اور حدیث میں کافی مہارت رکھتے تھے اس میں ان کا ایمان اور عقیدہ کسی بھی صاحب ایمان سے کم نہیں تھا۔ اسلامی علما کی طرح مالک رام بھی پہلے تو نص صریح سے استناد کرتے ہیں اور ثانیاً ان احادیث سے جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

انھوں نے بیٹی، بیوی، ماں، مطلقہ اور وارثہ کے عنوان سے اسلام میں عورت کے مقام اور مرتبے کا تعین کیا ہے۔ قرآن اور احادیث کی روشنی میں انھوں نے مختلف انداز سے عورت کے حقوق کی وضاحت کی ہے۔ ان کا انداز بیان استدلالی اور قطعیت سے پر ہے۔ بے جا گفتگو سے پرہیز کرتے ہوئے بے لاگ انداز میں انھوں نے تمام امور کو بیان کیا ہے۔ یہاں ان کا موقف بالکل واضح اور صاف ہے۔ ان کا طریقہ کار ایک محقق کا ہے۔ آیات قرآنی کا برمحل استعمال کیا گیا ہے احادیث کی صحت اور ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے تاریخی شواہد سے بہت سے امور کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کسی معاملے پر بحث کے دوران احادیث کی شمولیت بطور دلیل موجود ہے ایسے موقع پر وہ عہد نبوی و عہد خلفائے راشدین میں موجود واقعات کو بھی پیش کرتے ہیں جن میں سے بعض احادیث کی صورت میں بطور متن موجود ہیں اور بعض کی حیثیت مستند واقعات کی ہے جو محققین اور فقہا کی کتب اور مخطوطات میں درج ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے مالک رام

مالک رام نے عورت کی سماجی حیثیت کا خیال رکھتے ہوئے اس کے الگ الگ مقامات طے کیے ہیں یعنی ایک عورت سماج میں ایک بیٹی ہوتی ہے، بیوی ہوتی ہے، ماں ہوتی ہے اور جب وہ ان تینوں میں سے کسی حیثیت سے سماج میں نہیں رہ پاتی تو اس کی حیثیت ایک مطلقہ یا بیوہ کی ہوتی ہے۔ اسلام نے ان تمام حالتوں یا صورتوں میں باقاعدگی سے عورت کو باوقار زندگی گزارنے کے اختیارات عطا کیے ہیں جن کے حصول کے بعد وہ سماج میں اپنی عزت اور ناموس کے ساتھ پاکیزہ سماج میں اپنے مقام کو قائم رکھتی ہے۔ یہاں پر اسلوب احمد انصاری کا یہ قول درج کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

کی تصنیف 'عورت اور اسلامی تعلیم' میں عورت کے نظریہ حیات کے حوالے سے رقم شدہ بحث اور بھی استناد کا درجہ حاصل کرلیتی ہے۔

مالک رام نے عورت کی سماجی حیثیت کا خیال رکھتے ہوئے اس کے الگ الگ مقامات طے کیے ہیں یعنی ایک عورت سماج میں ایک بیٹی ہوتی ہے، بیوی ہوتی ہے، ماں ہوتی ہے اور جب وہ ان تینوں میں سے کسی حیثیت سے سماج میں نہیں رہ پاتی تو اس کی حیثیت ایک مطلقہ یا بیوہ کی ہوتی ہے۔ اسلام نے ان تمام حالتوں یا صورتوں میں باقاعدگی سے عورت کو باوقار زندگی گزارنے کے اختیارات عطا کیے ہیں جن کے حصول کے بعد وہ سماج میں اپنی عزت اور ناموس کے ساتھ پاکیزہ سماج میں اپنے مقام کو قائم رکھتی ہے۔ یہاں پر اسلوب احمد انصاری کا یہ قول درج کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

''معاشرتی زندگی میں عورت کے حقوق کے ضمن میں مالک رام نے چار شقیں قائم کی ہیں تعدد ازدواج، طلاق وخلع، نکاح بیوگان اور وراثت، اور ان چاروں کے ضمن میں انھوں نے ہندو دھرم، شریعت موسوی، عیسائیت اور اسلامی قوانین کے باہمی موازنے سے تشفی بخش طریقے پر یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی احکام نہ صرف سب سے زیادہ مبنی برانصاف ہیں۔''

مالک رام نے پہلے باب میں 'بیٹی' کا عنوان قائم کرتے ہوئے سماج میں اسلامی قوانین کے اعتبار سے اس کے حقوق کی وضاحت کی ہے یہاں انھوں نے دور اسلام سے قبل ایام جاہلیت میں بیٹیوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر کیا ہے اور مختلف تاریخی حوالوں سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح بچیوں کو زندہ درگور کردیا جاتا تھا یا قتل کردیا جاتا تھا نہ تو ان کی تعلیم وتربیت کا بندوبست تھا، نہ کھانے پینے کا اور نہ ہی جسمانی اور ذہنی تربیت کا کوئی انتظام تھا۔ اس کے بعض اسباب کی جانب بھی انھوں نے اشارے کیے ہیں جو بے حد مناسب اور درست معلوم ہوتے ہیں۔

زمانۂ قدیم میں قبائل کی جنگیں کثرت سے ہوتی تھیں لہٰذا ہارنے والے قبیلے یا قوم کی عورتوں کو جیتنے والے ملکیت بنا لیتے تھے۔ یا دوسری صورت یہ کہ خود سسر بننا اور بچیوں کا نکاح کرنا باعث ذلت تصور کیا جاتا تھا۔ مالک رام نے اس کی اور بھی توجیہیں پیش کی ہیں:

''اسی طرح ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے راجپوتوں کے دل میں بھی یہ جھوٹا خیال بیٹھا ہوا تھا کہ ہم اور کسی کو بیٹی دے کر سسر کہلائیں! اس سے مرجانا بہتر ہے۔''

''کاہنوں اور دینی بزرگوں نے کہہ رکھا تھا کہ لڑکیوں کو زندہ نہ رکھو کیوں کہ یہ ذلت کا موجب ہیں۔''

''جزیرۃ العرب جیسا صحرا آج ہے۔ ویسا ہی جب بھی تھا۔ سامان خوراک کے مہیا کرنے کے لیے ان لوگوں کو جیسی کچھ محنت کرنا پڑتی ہوگی، اس کا اندازہ ہم موجودہ حالات سے کرسکتے ہیں۔''

اس صورت حال کی اسلام نے کھل کر مخالفت کی اور قرآن میں اس کی مخالفت میں باقاعدہ آیتوں کا نزول ہوا۔ ان آیات کو مالک رام نے بڑی ہنرمندی سے پیش کرتے ہوئے بچیوں کے زندہ رکھنے اور ان کے وجود کی بقا کا جواز بھی دیا ہے کہ عورت نسل انسانی کی بقا کے لیے کس حد تک ضروری ہے۔ اور لڑکا یا لڑکی اللہ کے پیدا کردہ ہیں تو ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ تعلیم وتربیت کے سلسلے میں بھی اسلام نے بچیوں کی تعلیم کو فرض قرار دیا ہے۔ حتی کہ اگر وہ لونڈی بھی ہے تو اس کی تربیت کو بھی ضروری خیال کیا گیا ہے۔ مالک رام نے قرآن اور احادیث کی روشنی میں اسلام کے اندر عورت کے لیے تعلیم وتربیت کو لازم جزو قرار دیا۔ وہ ابن ماجہ کی معروف ومقبول حدیث 'طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمہ' کو بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ مالک رام نے تربیت کے حوالے سے اندرون خانہ زندگی کے ذیلی عنوان کے تحت ایک اہم بحث کو بھی اٹھایا ہے کہ اسلام نے عورت کے تحفظ اور اس کی ناموس کی بقا کے لیے کیا کیا قدم اٹھائے ہیں انھوں نے سورہ نور کی آیت نمبر 23 اور 24 کے حوالے سے کس طرح اس مسئلے کی وضاحت کی ہے قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''یہ آئے دن کا تجربہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں معمولی علم حاصل کرکے پندار وعجب کا شکار ہوجاتی ہیں اور نمائش ان کا شیوہ بن جاتا ہے۔ یہ یقیناً نامناسب اور غلط طریقہ ہے اور قرآن اس کا سخت مخالف ہے۔ چنانچہ اس کا حکم ہے کہ جب لڑکی سن بلوغ کو پہنچے تو اپنی آرائش اور خوبصورتی کو نمایاں نہ کرے، بلکہ شرم وحیا کو ملحوظ رکھے۔ باہر نکلے تو بھی احتیاط سے، چلے تو ایسی روش اختیار کرے جس سے حیا ٹپکے۔''

درحقیقت یہ بندش نہیں بلکہ احتیاط ہے کہ عورتیں اپنی پاکیزگی کو قائم رکھ سکیں۔ ورنہ اسلام میں کسی کے ملنے جلنے والے گھروں میں آنے جانے کی پابندی نہیں۔ یہ تصور کہ عورتیں قید ہوکر گھٹ کر جیتی ہیں نہایت غلط ہے۔

مالک رام نے اس جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''گھر کے مردوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کی احتیاط رکھیں کہ جو غیر عورتیں ان کے گھر میں آرہی ہیں، ان کے اخلاق کیسے ہیں اور کیا وہ اس قابل ہیں کہ ان کے گھر کی عورتوں سے ملیں جلیں، اس طرح کیا غلام اور تابعین ایسے ہیں کہ واقعی ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔''

مالک رام نے 'استیذان' کے ذیلی عنوان کے تحت استیذان کے لغوی اور شرعی معنی کی وضاحت کرتے ہوئے استیذان کے حکم پر قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں بحث کی ہے۔ یہاں مالک رام کی یہ رائے درج کرنا مناسب معلوم ہوتی ہے۔

''غرض یہ ہے کہ عموماً آدمی تکلیف سے نہیں بیٹھتا اور غیر محرم کے سامنے آنے میں جس تکلف کی ضرورت ہے۔ اگر اس کے بغیر پردے کے پیچھے ہی سے کام نکل جائے، تو کیا ضرورت ہے کہ عورت مرد کے سامنے آئے۔ چونکہ بلاضرورت مرد اور عورت ایک دوسرے کے سامنے آنے جانے سے معاشرتی خرابیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لیے فرمایا کہ جہاں آمنے سامنے ہوئے بغیر مطلب حل ہوسکتا ہے۔ وہاں بے شک پردے کی اوٹ سے بات کرلو۔ یہاں پیرایۂ بیان نہایت بلیغ اختیار کیا ہے۔ اے مرد، عورت دونوں کے کیے پاکیزگی کا موجب بتایا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ عورت کو غیر محرم سے بات چیت کرنے کی ممانعت نہیں۔''

انھوں نے آگے پردہ پر بھی ذیلی عنوان کے تحت بحث کی ہے اور مختلف واقعات اور قرآن میں درج اس کے لیے مخصوص الفاظ کے مخصوص تصور کو بیان کیا ہے۔ مالک رام نے پردہ کی اہمیت اور اس کی پابندی کا مثبت انداز میں تذکرہ کرتے ہوئے مختلف احادیث اور قرآن کی روشنی میں پردہ کے تصور کی وضاحت کی ہے جس میں

باہر نکلنے کے وقت، جسم اور چہرے کا ڈھکا ہونا، خوشبوؤں کا یا بجنے والے زیورات کے استعمال نہ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ مالک رام اس حکم کے جواز اور اثبات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عورتوں کو باہر نکلنے کی ممانعت نہیں کیوں کہ کام کاج کی ضرورت سے ایسا کرنے کی اجازت ہے، لیکن آنکھ نیچی رکھیں، آرائش اور بناو سنگار کو ظاہر نہ کریں اور حیا سے چلیں۔''

''یہ احکام ان تمام لڑکیوں کے لیے ہیں جو سنِ رُشد کو پہنچ جائیں اور جن پر لڑکی سے زیادہ لفظ عورت کا اطلاق ہوتا ہے اور جب تک وہ خود نکاح کی خواہش مند ہیں، یا ان کے نکاح کر لینے کا امکان ہے، ان پر احکام کی پابندی لازم ہے۔''

مالک رام نے 'بیوی' کے عنوان سے اپنی کتاب میں ایک اہم باب قائم کرتے ہوئے مختلف آیات قرآنی اور احادیث کی روشنی میں مرد کے مقابلے عورت کی حیثیت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ جوڑے کا لفظ یا حدیث میں عورت کی تخلیق مرد کی پسلی سے بتائی گئی ہے۔ جس کی مالک رام نے بہترین تشریح و توجیہہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مرد کے وجود کی طرح نسل انسانی کا اہم حصہ ہے مزید آگے انھوں نے عورت کی سماجی حیثیت بھی متعین کی ہے۔ مالک رام کی یہ وضاحت اور دلیل قابل ذکر ہے وہ رقم طراز ہیں کہ:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت ہر حیثیت میں باعث سکون ہے۔ خواہ اس کی حیثیت ماں کی ہو، خواہ بیٹی کی یا بہن کی، وہ اپنے بیٹے یا باپ یا بھائی کے لیے سامان راحت پیدا کرتی ہے۔ اللہ تعالی نے اس کی سرشت میں نرمی اور ہمدردی بہت زیادہ رکھی ہے۔ جس کے سبب وہ دوسروں کی تکلیف زیادہ محسوس کرتی اور ان کے لیے سامان سکون و راحت مہیا کرتی ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ سکون و راحت کا مظہر اتم اس وقت بنتی ہے جب اس کی حیثیت بیوی کی ہوتی ہے اس صورت میں جس خلوص و محبت کا اظہار اس کی ذات سے ہوتا ہے وہ واقعی اللہ تعالی کے نشانات میں سے ایک نشان ہے۔''

دوسرا مقصد نکاح 'بقائے نسل' کے ذیلی عنوان کے تحت بھی انھوں نے بیوی کے وجود کی ضرورت اور اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس موقع پر بھی قرآن کی آیات اور حدیث کو پیش نظر رکھتے ہیں جس میں درج 'نساؤ کم حرث لکم' میں لفظ حرث کی بے حد مدلل اور منطقی تعریف و تشریح کی ہے۔ یہاں ان کی یہ عبارت اہم ہو جاتی ہے۔

''قرآن پہلی قسم کے تعلق کے خلاف ہے چنانچہ اس نے عورت کو حرث یعنی کھیتی سے تشبیہ دے کر اپنا مقصد واضح کر دیا ہے۔ اس کے نزدیک مرد اور عورت کو رشتۂ نکاح سے وابستہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کا یہ تعلق مستقل حیثیت کا ہو۔ کسان یہ نہیں کرتا کہ آج کھیتی لے لی اور کل اسے چھوڑ دیا، بلکہ وہ اس سے نفع کرنے کی خاطر اسے دائمی طور پر اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔ دوسرے وہ اس سے غلہ اور اناج حاصل کرتا ہے۔ وہ اسے یوں ہی بنجر نہیں چھوڑتا، تیسرے جب وہ اس میں بیج ڈالتا ہے تو جب تک فصل تیار نہیں ہو لیتی۔ وہ ہر طرح اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ گھر آ کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ گئے۔

عورت کی سماجی حیثیت متعین کرنے کے لیے اسلام نے باقاعدہ قوانین وضع کیے اور اس کا دائرۂ عمل مرد کے دائرۂ عمل کی طرح طے کیا۔ اس کے لیے باقاعدہ اور علی الاعلان نکاح کا تصور پیش کیا تاکہ عزت و احترام سماج میں قائم ہو سکے اس کے علاوہ کسی بھی صورت کو اسلام نے جرم کے زمرے میں رکھا ہے۔ مالک رام نے اس نکتے کی جانب بھی بحث میں اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ دونوں آزادی سے صرف دو حالتوں میں یکجا ہو سکتے ہیں یعنی یا ان دونوں کا نکاح شریعت کی رو سے حرام ہو یا پھر وہ شرعی بیوی ہوں۔ یہ رشتہ قانونی طور پر اختیار کیا جائے۔ سماج اسے منظور کرے اور اسے اس کا علم ہو اور اس میں کوئی بات خفیہ نہ ہو، بلکہ وہ دونوں علی الاعلان میاں بیوی کی طرح رہیں۔''

اسی سے متعلق غیر شرعی طور پر عورت اور مرد کے جسمانی رشتے کو قائم کرنے پر جس طرح اسلام نے حد نافذ کرنے کا شرعی حکم صادر کیا ہے اس کے تحت مالک رام نے آگے زنا، سنگساری، چار گواہ، لعان کے عناوین قائم

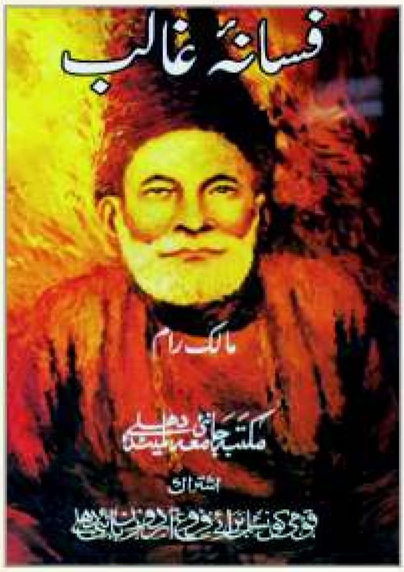

کرتے ہوئے بحث کی ہے اور ان جملہ امور کی وضاحت کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے محرمات نکاح کے تحت اس بحث کو قائم کیا ہے جس میں مخصوص رشتوں کے سبب عورتیں مرد کے نکاح میں جائز نہیں ٹھرتیں۔

تعداد ازدواج پر بھی الگ عنوان کے تحت بحث کی ہے اور اس کی شرائط طے کی ہیں۔ یہاں سارا معاملہ عدل باہم کا ہے جس کا نفاذ از حد ضروری ہے۔ جس کے تعلق سے وہ سورۃ نساء کی آیات کی توضیح پیش کرتے ہوئے اپنی بحث کو مستند بنا دیتے ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں:

''بیویوں کے درمیان عدل کرو یعنی ان کی ضروریات کے مہیا کرنے میں، کھانے کپڑے میں، ان سے تعلقات میں، عدل کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ایک کے گھر میں جشن ہو، تو دوسری کے گھر فاقہ۔ ایک جگہ شب عید ہو، تو دوسری کے دیے میں تیل بھی نہ ہو۔ عورت کی فطرت میں خدا نے رشک و حسد کا مادّہ بہت زیادہ رکھا ہے۔ عام حالات میں وہ دوسری عورت تو درکنار، بیچ کی مکھی کو بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ پس جہاں سوتن کا معاملہ ہو، وہاں مرد کو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنی تمام بیویوں کو ہر ایک چیز ایک سی دے۔ مکان، سامان، کپڑے، زیورات، خوراک اور دیگر ضروریات کی اشیاء سب ایک سی ہوں۔ ان کے یہاں اپنے آنے جانے کا بھی ایک اصول بنا لے۔ رسول کریم کا اسوۂ حسنہ تو اس باب میں اتنا وسیع تھا کہ وہ بیویوں کے جذبات تک کا خیال رکھتے تھے اور حتی الوسع انھیں کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے۔ (بخاری، کتاب المظالم)''

یہاں انھوں نے رسولؐ کے کردار احسن کو پیش کرتے ہوئے مثال دی اور حجت تمام کر دی۔ ان کا یہ طریقہ کار ان کے منطقیانہ درک اور استدلالی انداز کی بہترین مثال ہے۔

مالک رام نے الگ الگ ذیلی عنوان کے تحت بیوی کے حقوق بھی بیان کیے ہیں یہاں بھی ان کا طریقہ استدلال قرآن و حدیث کے حوالہ جات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے حسن سلوک، نان ونفقہ، اعتماد، حقوق زوجیت اور عدم تشدد کے تحت عورتوں کے اختیارات اور ان کی سماجی حیثیت نیز احترام اور قدر کو واضح کیا ہے یعنی جس طرح مرد کا فرض ہے کہ وہ عورتوں کے لیے اچھا سلوک روا رکھے، ان کے نان ونفقہ کا خیال رکھے اور حق زوجیت ممکنہ حد تک ادا کرے حتیٰ کہ کثرت سے عبادت بھی نہ کرے کہ اگر اس سے بیوی کے حق میں خلل پڑتا ہو اور اس پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔ مالک رام نے بڑی ہنرمندی

سے ان تمام امور کی وضاحت کی ہے کہ اسلام واحد مذہب ہے جس میں عورت کے لیے اتنے حقوق وضع کیے گئے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے بیوی کی ذمہ داریوں کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ عورتوں میں اپنے شوہر کے لیے اطاعت شعاری ہونی چاہیے اور شوہر کی غیر حاضری میں اس کے حقوق کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اولاد کی ترتیب میں بھی اس کا بے حد اہم رول ہے اور شوہر اگر نیکی کرے تو وہ اس کو نہ روکے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرے۔

مالک رام نے 'ماں' کے عنوان سے عورت کی تیسری بے حد اہم سماجی حیثیت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ یعنی جب عورت ماں ہوتی ہے تو وہ دنیا کی سب سے عظیم ہستی ہوتی ہے۔ ماں کا اسلام میں بے حد بلند درجہ ہے حتیٰ کہ اسے باپ سے بھی زیادہ احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ انھوں نے سورۂ بقرہ آیت 215، سورۂ بنی اسرائیل آیت 23 تا 25، سورہ، لقمان آیت 14، 15 اور مختلف احادیث کی روشنی میں والدین اور بالخصوص ماں کی اہمیت اور اس کے مرتبہ پر روشنی ڈالی ہے جس کے نتیجے میں وہ کہتے ہیں:

''والدین کی خدمت کا حکم اور نصیحت تمام مذہبوں میں ہے لیکن قرآن نے حسب معمول اس مسئلے پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ حکم دیا کہ والدین سے نیکی اور احسان سے پیش آؤ اور ان پر اپنے اموال خرچ کرو، گویا صرف ماں باپ کی ضروریات کی کفالت ہی کا نہیں، بلکہ ہر حال میں ان پر خرچ کرنے کا حکم دیا۔''

اسلام میں والدین کے حقوق کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے مشرک ہونے کے باوجود ان سے رفاقت قائم کرنے اور حسن سلوک قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کی خدمت کو جہاد سے بھی افضل ترین عمل قرار دیا گیا ہے۔ مالک رام نے اپنی بحث میں ان جملہ امور کی بہتر طور پر وضاحت کی۔ مالک رام نے خلع کی تعریف اور تصور کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن اور احادیث نبوی کا حوالہ دیا ہے کہ جس طرح قرآن نے طلاق سے اجتناب برتا ہے اسی طرح خلع کے سلسلے میں بھی حتیٰ الامکان پرہیز کرنے پر زور دیا ہے۔ مالک رام نے ثابت اور ان کی بیوی جمیلہ اور حبیبہ کے دو واقعات کو اس ضمن میں بطور دلیل بیان کیا ہے جہاں مہر کی واپسی کے بعد نبیؐ نے دونوں کی علاحدگی کی اجازت مرحمت فرمائی اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح مرد کو طلاق دینے کا اختیار ہے اسی طرح علیحدگی کے لیے عورت کو بھی بعینہٖ خلع کے ذریعے علیحدگی کا اختیار حاصل ہے۔ اسلام نے یہ خصوصی حق عورت کو عطا کیا ہے۔ مالک رام نے اس امر کی طرف نشاندہی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''اسلام نے عورت کو خلع کا حق دے کر اس پر بہت بڑی ذمہ داری عائد کر دی ہے۔ اس لیے چاہیے کہ وہ اس کے استعمال میں نہایت درجہ احتیاط سے کام لے۔''

'عدّت کے اغراض' کے تحت انھوں نے استدلالی اور منطقی انداز میں ان مصلحتوں کی جانب توجہ دلانی چاہی ہے جس کی وجہ سے اسلام نے باقاعدگی سے عدّت کو لے کر مختلف قوانین یا اصول شریعت میں وضع کیے اور ان کو عورت کے لیے لازم قرار دیا۔ وہ ان مصلحتوں کی نشاندہی کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

''دراصل تین ماہ کی عدّت کا اوّلین مقصد ہی یہی ہے کہ میاں بیوی میں صلح ہو جائے۔ چوں کہ عورت، مرد کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتی ہے، اس لیے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کے دل میں خیال نہ آئے۔ نیز اگر طلاق کسی فوری اشتعال یا ہنگامے کے دوران میں دی گئی ہے تو بھی مرد کو حالات پر ٹھنڈے دل سے سوچنے کا کافی موقع مل جاتا ہے۔ عدّت کا دوسرا مقصد نسب کی حفاظت ہے ممکن ہے کہ طلاق کے وقت عورت کو صرف چند دن کا حمل ہو۔ تیسری مصلحت جو دراصل مندرجۂ صدر وجہ ہی سے پیدا ہوتی ہے، ورثہ کی صحیح تقسیم ہے یعنی یہ معلوم ہو جائے کہ بچہ کون سے خاوند کا وارث ہوگا۔ عدّت کی ایک اور غرض یہ بھی ہے کہ مطلقہ عورت کو بیجا تکلیف نہ ہو۔ اگر طلاق کے ساتھ ہی خاوند اس کو گھر سے نکال دینے کا مجاز ہوتا تو وہ بیچاری ایک مصیبت میں مبتلا ہو جاتی۔ نہ صرف وہ بے گھر ہوتی بلکہ اسے دوسری جگہ نکاح کرنے میں بھی دقت پیش آتی کیوں کہ اس طرح اس کے اخلاق سے متعلق شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔''

مالک رام نے 'وارثہ' کے عنوان کے تحت ایک باب قائم کیا ہے۔ یہ ایک اہم باب ہے جس کا تعلق خالصتاً معاش کے لیے اور سماجی حیثیت کا تعین کرنے میں اہم ثابت ہوتا ہے۔ دنیا میں مال واسباب انسان کی اہم ضرورت، جینے کا ذریعہ اور سماجی مقام اور وقار کے حصول میں اہم سبب خیال کیا جاتا ہے۔ اسلام نے اسی وجہ سے دولت کی تقسیم میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنے کے لیے بنیادی اصول اور قوانین بنائے ہیں۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام میں زکوٰۃ اور صدقہ کا باقاعدہ ایک نظام موجود ہے۔ جس کے لیے بیت المال کا تصوّر بھی موجود ہے۔ سود کی حرمت بھی اسی وجہ سے ہے کہ اس کے بہت سے نقصانات ہیں۔ اسی طرح وصیت اور میّت کے ترکے

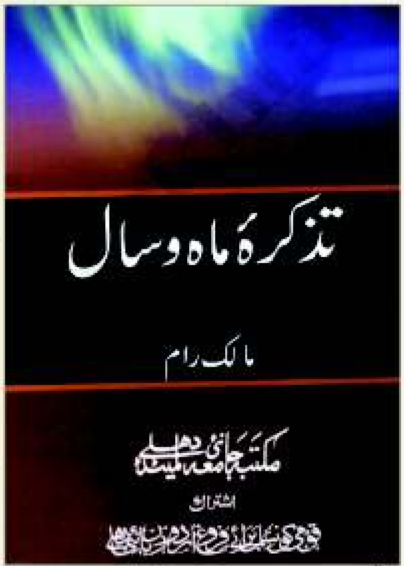

کی تقسیم کے بھی خاص اصول وقوانین ہیں۔ سورۃ بقرہ اور سورۃ نساء میں باقاعدگی سے ان اصولوں کو ربّ کائنات نے بیان کر دیا ہے۔ مالک رام نے الگ الگ عناوین کے تحت قرآن اور احادیث کی روشنی میں وصیت کے اصول، وصیت کی مستقل اہمیت، وصیت کو معتبر اور مضبوط بنانے کے لیے شہادت کے طریقوں اور قرائن سے شہادت مرتب کرنے کا جواز، میت کے قرض کی اس کے مال سے ادائیگی، وراثت کی تقسیم اور اس کے اصول پر ٹھہر کر گفتگو کی ہے۔ جس سے ان کی محققانہ دقت نظری کا ثبوت ملتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مالک رام کا محبوب میدان اسلامیات ہے۔ وہ قرآن اور حدیث کی بہترین فہم رکھتے ہیں۔ ان کا انداز بے حد دوٹوک، بے لاگ اور منصفانہ ہے۔ وہ دلیلوں کی روشنی میں گفتگو کرتے اور بحث کو آگے بڑھاتے ہیں۔ انھوں نے محقق اور معروضیت کے ساتھ مواد کی چھان پھٹک کی ہے۔ اسلامی قوانین کی روشنی میں عورت کا مقام طے کیا ہے اور اس کے حقوق کی وضاحت کی ہے۔ ان کے نزدیک متن بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ تاریخی شواہد کو بھی وہ پیش نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے تنگ نظری سے کہیں بھی کام نہیں لیا ہے اور نہ ہی غیر معتبر حوالوں کو شامل کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ماخذ کے حصول میں حد درجہ احتیاط برتا ہے اور اس مواد کو ترتیب اور سلیقے سے پیش کیا ہے۔ ان کی زبان سنجیدہ اور متین ہے اور طرز استدلالی اور منطقیانہ ہے۔ ایک محقق کی زبان اور طرز جس طرح کا ہونا چاہیے مالک رام اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔

■

Nazrana Shafi
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 201001 (UP)

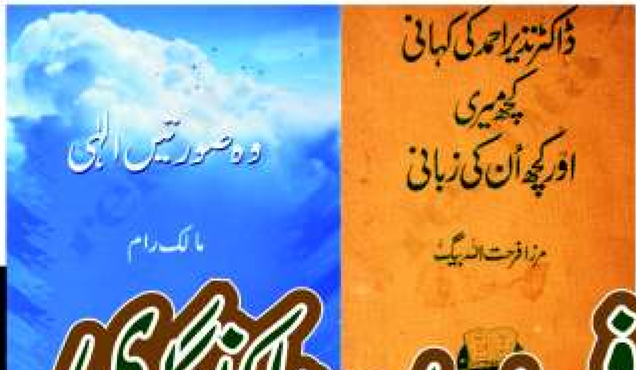

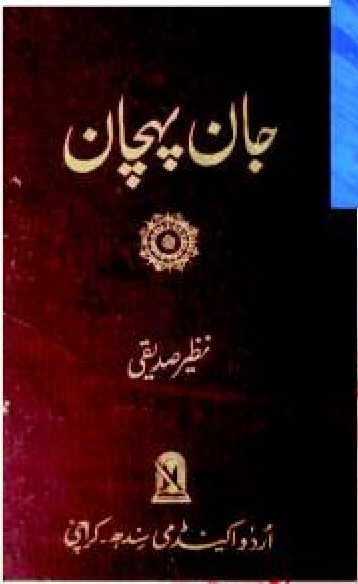

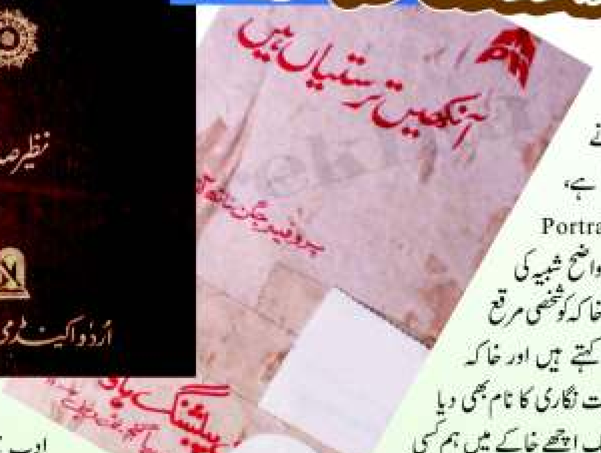

گلشن آرا

خاکہ کا فن اور اردو خاکہ نگاری

خاکہ نگاری کی ایک عظیم روایت ہمارے سامنے ہے۔ خاکہ نگاری جسے شخصیت نگاری کے نام سے بھی ہم جانتے اور سمجھتے ہیں ہر عہد، ہر ملک اور ہر زبان میں اس کے نمونے اور نقوش ملتے ہیں۔ انسانی تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں کہ کسی شخصیت سے متاثر ہونا، اس سے عقیدت و قربت، محبت اور محبوبیت ایک فطری امر ہے، جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ وہ شخصیت کوئی بھی ہوسکتی ہے۔ زندگی اور زمانے کے بدلتے ہوئے مزاج و میلان، نشیب و فراز ڈوبتی ابھرتی انسانی زندگی کے تمام رنگ و روپ خاکہ نگاری میں دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے ہیں معاملہ مذہبی ہو یا پھر معاشرتی و سماجی، علمی و ادبی ہو یا سیاسی، بڑی شخصیت ہو یا معمولی، عالم ہو یا جاہل، حکمراں ہو یا سماج کا ایک ادنیٰ انسان، مصنف کسی سے بھی متاثر ہوسکتا ہے اور کسی شخصیت کو موضوع و محور بنا سکتا ہے۔ خاکہ ایک بے حد نازک فن ہے۔ یہاں قلم پر بے پناہ گرفت کے ساتھ ساتھ جرأت اور سلیقہ مندی بھی درکار ہے۔ تھوڑی سی لاپرواہی اور کوتاہی خاکہ کو مجروح کردیتی ہے۔ اس لیے مصنف کو بہت ہی احتیاط اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ ایک ایک قدم بہت سوچ سمجھ کر بڑھانا ہوتا ہے۔ ایک ایک پہلو اور گوشے کو مصنف کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ اس لیے دنیا کی مختلف زبانوں میں بے شمار خاکے لکھے گئے مگر شاہکار کا درجہ کم ہی کے حصے میں آیا۔

فرانسیسی، عربی، روسی، جرمنی، چینی، انگریزی وغیرہ ترقی یافتہ زبانوں میں اس صنف کے کئی شاہکار اور اعلیٰ نمونے ہم آسانی سے تلاش کرسکتے ہیں۔ اردو میں خاکہ و شخصیت نگاری کے لیے ایک اور انگریزی لفظ (Pen Portrait) کا بھی استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ انگریزی زبان و ادب میں دونوں الفاظ Pen Portrait اور Sketch الگ الگ معنی و مفہوم میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ خاکہ و شخصیت نگاری کے معروف ناقد پروفیسر داؤد احمد رقم طراز ہیں:

"Sketch مختلف خطوط کی مدد سے کسی شخصیت کے خد و خال ابھارنے کو کہا جاتا ہے، جب کہ Portrait سے مراد کسی واضح شبیہ کی عکاسی ہے۔ خاکہ کو شخصی مرقع یا شخصیہ بھی کہتے ہیں اور خاکہ نویسی کو شخصیت نگاری کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ایک اچھے خاکے میں ہم کسی شخص کے بنیادی مزاج، اس کی افتادِ طبع، اندازِ فکر و عمل اور اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے روشناس ہوتے ہیں۔ خاکہ نگاری کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے، جس کے لیے خاکہ نگاری قوت مشاہدہ، فہم و ادراک اور غیر جانبداری کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اور پُر اثر اندازِ بیان کا حامل ہونا ضروری ہے۔ خاکہ کسی فرد یا شخص کی مکمل زندگی کا عکاس نہیں ہوتا بلکہ اس کی نمایاں خصوصیات کا اظہار لیے ہوتا ہے۔ خاکہ نگار عموماً شخصیت کی زندگی کے ان گوشوں کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے، جو نظر سے اوجھل رہتے ہیں اور بسا اوقات کئی شخصیت انھیں خود بھی چھپا کر رکھتی ہیں لیکن ایک اچھے خاکے کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ شخصیت کے محاسن و معائب کو ناقدانہ رویے کے بجائے ہمدردانہ رویے کے طفیل ہر طرح سے سامنے لے آئے، کیوں کہ خاکہ میں بنائی جانے والی تصویر کی اصل شخصیت سے مطابقت ضروری ہوتی ہے، اگر تصویر اصل شخصیت سے ذرا سی بھی مختلف ہوگی تو خاکہ ناقص قرار پائے گا۔ خاکہ صرف اس شخصیت کا لکھا جاسکتا ہے، جس کی شخصیت سے خاکہ نگار کو کسی طرح کی دلچسپی ہو۔ خاکہ کسی پر بھی لکھا جاسکتا ہے۔ بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب، تاجر ہو یا آمر، استاد ہو یا شاگرد، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، پروفیسر ہو یا چپراسی، ولی ہو یا ظالم وغیرہ۔ پوری علمی و ادبی دنیا جانتی ہے کہ اردو ادب میں باضابطہ خاکہ نگاری کی ابتدا مرزا فرحت اللہ بیگ کی مشہور و معروف کتاب 'نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی' (1927) سے ہوتی ہے، مگر کچھ محققوں اور ناقدوں نے اس سے بھی قبل اس صنف کے نمونے اور نقوش تلاش کرنے کی کوشش کی ہے ان میں محمد حسین آزاد، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، شمیم کرہانی، صابرہ سعید، حسن احمد وغیرہ کے نام نامی قابلِ ذکر ہیں۔ بہرکیف اردو زبان میں خاکہ و شخصیت نگاری کا باضابطہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ کو ہی تسلیم کیا جاتا ہے اور اس صنف خاکہ کو آگے بڑھانے اور پروان چڑھانے والوں میں خواجہ حسن نظامی، شاہد احمد دہلوی، رشید احمد صدیقی، اشرف صبوحی، مولوی عبد الحق، جوش ملیح آبادی، دیوان سنگھ مفتون، خواجہ محمد شفیع، مرزا محمد بیگ، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں، کنھیا لال کپور، شورش کاشمیری، فرحت کاکوروی، مالک رام، جگن ناتھ آزاد، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، شوکت تھانوی، فکر تونسوی، بیگم انیس قدوائی، منظر علی خاں منظر، قرۃ العین حیدر، کشمیری لال ذاکر، باقر مہدی، انور عظیم، سردار جعفری، مہندر ناتھ، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، انتظار حسین، چراغ حسن حسرت، سید صباح الدین، لطیف کاشمیری، منصور آفاقی، اے حمید، صادق الخیری، حافظ لدھیانوی، صالحہ عابد حسین، مجید لاہوری، علی جواد زیدی، کرشن چندر، مشفق

خواجہ، اقبال متین، ابراہیم جلیس، نظیر صدیقی، غضنفر وغیرہ جیسے لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ اردو خاکہ و شخصیت نگاری کی جدید تاریخ میں ایک اہم نام محمد طفیل کا ہے۔ محمد طفیل جسے اردو دنیا محمد نقوش کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ 'رسالہ نقوش' کے درجنوں شاہکار نمبر دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ نقوش کا رسول نمبر نہ صرف اردو بلکہ پوری ادبی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی دوسری کوئی نظیر دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ عربی زبان میں بھی نہیں۔ اس تاریخی، روحانی اور عالمی شاہکار رسول نمبر نے محمد طفیل کو پوری ادبی وعلمی دنیا میں زندہ و جاوید بنادیا۔ محمد طفیل نے اپنی پوری علمی، ادبی اور صحافتی زندگی میں صرف اور صرف دو ہی ادبی وصحافتی کام کیے، ایک رسالہ نقوش کی ادارت اور اس سلسلے میں ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں اور لکھنے پڑھنے اور علمی وادبی ذوق وشوق رکھنے والوں سے خط وکتابت کی اور خاکے لکھے۔ ان کے خاکوں کے مجموعوں میں 'آپ'، 'آداب'، 'محترم'، 'مکرم'، 'معظم'، 'مجی'، 'مخدومی' وغیرہ پوری ادبی وعلمی دنیا میں اپنی ایک خاص دلکشی، اہمیت، عظمت، جاذبیت، ادبیت، معنویت اور تہہ داری رکھتے ہیں۔ محمد طفیل نے خود ہی لکھا ہے کہ جو کام ہم نے الف سے شروع کیا تھا، 'ی' پر ختم کیا۔ محمد طفیل نے جدید اردو خاکہ و شخصیت نگاری کو ایک نئی تازگی وتوانائی، وقار و وزن، بلند مقام ومرتبہ عطا کرکے دنیا کی معتبر ومستند زبانوں کے مد مقابل اردو خاکہ نگاری کو کھڑا کردیا۔ جسے ہم کسی طور فراموش یا نظر انداز نہیں کرسکتے۔ محمد طفیل نے خاکہ نگاری کے فن کو چاول پر 'قل ھو اللہ' لکھنے کا عمل قرار دیا ہے۔ محمد طفیل کے خاکے جدید اردو ادب میں ایک نئے باب کا آغاز اور اضافہ ہیں۔

یہاں یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ جہاں ایک طرف اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں مردوں کی ایک لمبی فہرست ہے، وہیں اس صنف خاکہ کو چند خواتین خاکہ نگار کو ایک نئی سمت اور رفتار، وقار وبلندی سے روشناس کرانے اور پرچم لہرانے کا کام کیا ہے۔ ان میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، صغرا مہدی، جیلانی بانو، بیگم انیس قدوائی، صالحہ عابد حسین، عفت آراء، پروفیسر شمیم نکہت، ادا جعفری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ عصمت چغتائی نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ 'دوزخی' کے نام سے لکھا اور اس کی ادبی وعلمی اہمیت وعظمت آج بھی دیر اور دور تک محسوس کی جاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے چند ہی خاکے لکھے مگر ان کے خاکوں میں ان کی عالمانہ ودانشورانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ ملتا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے کئی شاہکار اور دلچسپ خاکے لکھے۔ جو آج بھی ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ہند و پاک کی کئی نامور خواتین نے نہایت ہی خوبصورت اور دلکش خاکے لکھے ہیں۔ میں یہاں بطور خاص ایک ایسی خاتون خاکہ نگار کا تذکرہ کرنا ضروری تصور کرتی ہوں جن کا نام عفت آرا ہے۔ آپ عالمی شہرت یافتہ اردو وانگریزی کے ادیب و ناقد پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی صاحبزادی ہیں اور آپ کا تعلق بھی شعبۂ انگریزی سے رہا ہے اور اب سبکدوش ہوچکی ہیں۔

عفت آرا کی کتاب 'نشیب وفراز' میں جہاں سفر نامے، مضامین، ترجمے اور کہانیاں ہیں، وہیں تیرہ نہایت دلچسپ اور خوبصورت خاکے ہیں۔ ان خاکوں میں 'حضرت بی بی فاطمہ زہرہؓ، ایک تاثر'، 'پروفیسر اسلوب احمد انصاری - پیکر فکر وفن'، 'ڈاکٹر سید امین اشرف - ایک تاثر'، 'الوداع اے شمع بزم سخن'، 'ز-خ-ش - صدف بے مثال'، 'خاموش سفر (پروفیسر تقی حسین جعفری کی یاد میں)'، 'مدر ٹریسا - ایک فرشتۂ رحمت'، 'رسکن بونڈ - ذرۂ تابناک'، 'ڈاکٹر شائستہ محسن - ایک شمع فروزاں'، 'سعیدہ آپا کی یاد میں'، 'چراغ سحر تمام ہوا'، 'جہاں آرا - پیکر یاس وحسرت' یہ تمام خاکے مصنفہ کی لیاقت وذہانت، عرق ریزی وعمیق مطالعہ اور عالمانہ ودانشورانہ صلاحیتوں کی بھرپور غمازی کرتے ہیں۔ خود مصنفہ کے لفظوں میں:

"خاکے لکھنے کا وصف بھی یورپ کے مصنفین کی دین ہے کیوں کہ Addison and Steele نے جس مہارت سے خاکہ نگاری کی ہے ان کی تقلید سے دوسرے لکھنے والوں کو بھی تقویت ملی اور انھوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور پھر ہم نے بھی اسے اپنے انداز میں لکھنے کا شوق پورا کیا۔ لکھنے والوں کو لکھنے کے دوران بڑا ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ کیسے مرقع نگاری بھی بھرپور ہو اور اچھی اور معیاری زبان کا استعمال ہو، قاری کو اپنے مطالعہ میں بھی شریک کیا جاسکے اور انداز بیان دلچسپ ہوتا کہ خاکہ نگاری میں کمال حاصل ہوسکے۔ لکھنے کے میدان میں قدم رکھنا گویا تنقید کو دعوت دینا ہے اور اس لیے یہ عمل جوئے شیر لانے کے مقابل ہے۔ اگر کسی بھی لحاظ سے کچھ کمی محسوس ہوگی تو قارئین آپ کی تحریر کو دور ڈال دیں گے اور آپ سر دھنتے رہ جائیں گے۔ ہم خود بھی تو اچھی چیز کا انتخاب کرتے ہیں اور بیکار شے کو رد کردیتے ہیں"۔ (نشیب و فراز، ص 10-11)

شاعری میں جس طرح رباعی کا فن تسلیم کیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح اصناف نثر میں خاکہ نگاری کی صنف بھی تسلیم کی گئی ہے۔ مصنف کو اپنی تیسری آنکھ کا بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اردو میں مرزا فرحت اللہ بیگ سے لے کر غضنفر تک بے شمار خاکے لکھے گئے ہیں۔ سیکڑوں کی تعداد میں خاکوں کے مجموعے منظرِ عام پر آچکے اور آرہے ہیں مگر ان میں چند خاکہ نگار ہی ہیں جو اپنی منفرد و مخصوص پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ غالب پر مالک رام کا لکھا ہوا خاکہ، پروفیسر رشید احمد صدیقی کا اپنے شعبۂ اردو کے چپراسی کندن کا خاکہ اور خود مستند ومعتبر ادیب وناقد پروفیسر نظیر صدیقی کا مرحوم نظیر صدیقی کے نام کا خاکہ آج بھی پڑھنے والے بھول نہیں سکتے۔

اردو زبان وادب میں بھی ادھر کئی برسوں میں کئی شاہکار اور نہایت دلچسپ خاکوں کے مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ ان میں مالک رام کا 'وہ صورت الٰہی' پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا 'آنکھیں ترستیاں ہیں'، پروفیسر رشید احمد صدیقی کا 'گنج ہائے گراں مایہ'، پروفیسر نظیر صدیقی کا 'جان پہچان'، منظر علی خاں منظر کا 'خاکہ نما' مولوی عبد الحق، 'چند ہم عصر'، خواجہ غلام السیدین 'آندھی میں چراغ' کے علاوہ کئی مشہور ومعروف ادیبوں اور دانشوروں کے خاکوں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری وساری ہے۔

اردو خاکہ نگاری آج ترقی کی کئی منزلیں طے کرچکی ہے۔ جس صنفِ خاکہ نگاری کی ابتدا مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوئی ہو اور دیکھتے دیکھتے اردو خاکہ نگاری کی جدید تاریخ میں کئی ایسے اہم خاکہ نگار ابھر کر سامنے آئے جن کی خاکہ نگاری نے اس صنف کو ایک نئی تازگی و توانائی، دلکشی وشگفتگی اور ادبی وقار ومعیار بخشنے کا کام انجام دیا، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو خاکہ نگاری کی اس تابندہ و درخشندہ روایت کو فرحت اللہ بیگ کے بعد کی آنے والی نسلوں نے نہ صرف پروان چڑھایا بلکہ دنیا کی معتبر ومستند زبانوں کے مدِ مقابل کھڑا کرنے کا کام بھی انجام دیا۔ 1970 کے بعد صنف خاکہ کی طرح دوسری اصناف سے تعلق رکھنے والے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے بھی خاکہ نگاری کے باب میں کئی اضافے بھی کیے۔ آج اردو کے رسائل وجرائد میں بھی کثرت سے خاکے شائع ہورہے ہیں اور دلچسپی سے پڑھے جارہے ہیں۔

■

Gulshan Ara
W/o Dr. Khaliqur Rahman
Madrasa Road, Maripur
Muzaffarpur - 842001 (Bihar)
Mob.:7070223675, 9934635175

سعد بن ضیاء

نظامِ شمسی: ایک اجمالی تعارف

نظامِ شمسی سے مراد اجرامِ فلکی کا وہ مجموعہ ہے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ سورج کی ثقلی گرفت میں ہے۔ ان اَجرامِ فلکی میں شامل ہیں آٹھ سیارے مع 162 چاندوں کے، تین بونے سیارے مع چار چاند اور بے شمار دیگر صغیر اَجرامِ فلکی۔ آخرالذکر سیارچے، کوئپر پٹی کے اَجسام، دُم دار سیارے، شہاب ثاقب اور بین سیاروی گرد پر مشتمل ہے۔ عام اصطلاح میں نظامِ شمسی میں جن اَجرامِ فلکی کا شمار کیا جاتا ہے وہ ہیں سورج، چار اندرونی سیارے، سیارچے، چار بیرونی سیارے اور کوئپر پٹی۔ کوئپر پٹی کے آگے خاصی تعداد میں موجود اَجرامِ فلکی کو بھی نظامِ شمسی کا ہی حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ سورج سے فاصلے کے لحاظ سے نظامِ شمسی میں موجود سیاروں کی ترتیب اس طرح ہے: عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورینس اور نیپچون۔ 1930 میں پلوٹو سیارہ دریافت ہوا اور جب ہی سے وہ نظامِ شمسی کا نواں سیارہ تسلیم کیا جاتا رہا مگر 2006 میں بعض وجوہ کی بنا پر پلوٹو کا نظامِ شمسی سے اِخراج کر دیا گیا۔

سورج کے اطراف جو اجرامِ فلکی اپنی مدار پر محوِ گردش ہیں وہ تین گروہوں پر منقسم ہیں: (1) سیارے (2) بونے سیارے (3) صغیر اجسامِ فلکی۔ سیارہ اس کو کہتے ہیں جو کہ اول یہ کہ اپنی ثقلی کشش کی بنا پر ایک کُرّہ کی شکل اِختیار کر لے اور دوّم یہ کہ اپنی ثقلی کشش کے زور پر اپنے آس پاس کے علاقہ کی صفائی کر چکا ہو۔ بونا سیارہ وہ ہوتا ہے جس میں اول الذکر خصوصیت تو پائی جاتی ہے مگر چونکہ اُس کی ثقلی کشش ضعیف ہوتی ہے لہٰذا وہ اپنے مدار کے آس پاس صفائی نہیں کر پاتا۔ آرکس، سیڈنا اور کواوغیرہ کا بونے سیاروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی اَجرامِ فلکی جو سورج کے گرد مدار میں چکر لگاتے ہیں وہ تمام کے تمام صغیر اجسامِ فلکی کے زمرے میں آتے ہیں۔ قدرتی سیارچوں کو چاند کہا جاتا ہے۔ چاند وہ جرمِ فلکی ہے جو بجائے سورج کے سیاروں یا بونے سیاروں یا صغیر اجسامِ فلکی کے گرد اپنے مدار میں گردش کرتا ہے۔

سورج کے اطراف جو سیارے گردش کرتے ہیں ان کے مدار کا زاویہ زمین کے مدار کے زاویے کے یا تو تقریباً بالکل متوازی ہے یا پھر اس سے بہت کم ہے۔ برخلاف اس کے دُم دار سیاروں اور کوئپر پٹی کے اجسام کے مدار کا زاویہ زمین کے مدار کے زاویے سے کافی زیادہ ہے۔ سیاروں کی اپنے اپنے مدار میں سورج کے اطراف گردش کیپلر قانون کی پابند ہوتی ہے۔ اَجرامِ فلکی کے مدار کی شکل عام طور پر بیضوی ہوتی ہے۔ اس لیے دورانِ گردش اجرامِ فلکی کا سورج سے فاصلہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ سورج سے کم سے کم فاصلہ کو حضیض کہتے ہیں جبکہ زیادہ سے زیادہ فاصلہ کو اوج کہا جاتا ہے۔ سورج کے گرد اَمدار میں گھومنے کے ساتھ ساتھ سیارے اپنے اپنے محور پر بھی گھوم رہے ہیں۔ جہاں تک سیاروں کے مداروں کے باہمی فاصلے کا تعلق ہے تو یہاں اس حقیقت کو واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ قطعاً یکساں نہیں ہیں بلکہ ان میں کافی تغیر پایا جاتا ہے۔ جو سیارہ سورج سے جتنی دوری پر واقع ہے اُس کے مدار کا فاصلہ بھی اپنے سے پہلے والے سیارے کے مدار سے اُتنا ہی دور ہوتا ہے۔ مگر ان کے فاصلوں میں کوئی باہمی ربط نہیں پایا جاتا ہے۔ گو کہ ماہرِ فلکیات اس پر کافی تحقیق کر رہے ہیں مگر اب تک کوئی فیصلہ کُن نتیجہ سامنے نہیں آیا ہے۔

اگر غیر رسمی طور پر نظامِ شمسی کو تقسیم کیا جائے تو اس کی تین مناطق ہیں: (1) داخلی نظامِ شمسی (2) وسطی نظامِ شمسی اور (3) خارجی نظامِ شمسی۔ داخلی منطق میں اولین چار سیارے یعنی عطارد، زہرہ، زمین، مریخ اور سیارچوں کی پٹی شامل ہیں۔ مشتری، زحل، یورینس اور نیپچون کا وسطی منطق میں شمار ہوتا ہے جبکہ نیپچون سے پرے تمام اجرامِ فلکی خارجی منطق کا حصہ ہیں۔ عطارد، زہرہ، زمین اور مریخ کی کیمیاوی ساخت میں کافی حد تک مماثلت ہے۔ اِن کی سطح پر عموماً چٹانیں اور ایسی معدنیات پائی جاتی ہیں جن کا نقطۂ اِنجماد کافی بلند ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر ان سب پر سلیکیٹ معدنیات اور دیگر دھات پائی جاتی ہیں۔

داخلی نظامِ شمسی کے سیاروں کی رداس کی قدر زحل اور مشتری کے درمیان فاصلہ سے بھی کم ہے۔ ان سیاروں کی ہئیتی ساخت دو سطحوں پر مشتمل ہے: ٹھوس سطح اور اس کے نیچے نیم مائع سطح جسے مینٹل کہتے ہیں۔ اس میں بھی سیلیکیٹ معدنیات بکثرت پائی جاتی ہیں۔ زہرہ، زمین اور مریخ پر تو ہوا بھی پائی جاتی ہے۔ وسطی نظامِ شمسی

کے لیے کوئی مخصوص نام نہیں ہے۔ اس خطے پر عام طور پر دیو ہیکل گیسی سیارے مع اپنے اپنے چاندوں کے اور قلیل المدت دم دار سیارے موجود ہیں۔ بسا اوقات اسے خارجی نظامِ شمسی کا ہی حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ خارجی نظامِ شمسی میں ماورا نیپچون کا علاقہ شمار کیا جاتا ہے۔ ابھی تک اس خطے کے بارے میں خاطر خواہ معلومات نہیں ہو سکی ہیں۔ اب تک کی معلومات کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں پر صرف برف اور چٹانی مادے پر مشتمل صغیر اجسام موجود ہیں۔

کوئپر پٹی خارجی نظامِ شمسی کا شروعاتی حصہ ہے۔ اس پر زیادہ تر برف پائی جاتی ہے۔ دراصل یہ گرد و غبار اور اور ملبے سے بنا ایک بہت وسیع حلقہ ہے۔ سورج سے اس حلقے کی وسعت 30-50 فلکیاتی اکائی ہے۔ کوئپر پٹی پر موجود بیشتر اجرام کا شمار صغیر اجسامِ فلکی میں ہوتا ہے۔ ورونا، کوا اور آرکس کو مستقبل کے بونے سیارے قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ماہرین فلکیات کے محتاط اندازے کے مطابق کوئپر پٹی پر ایک لاکھ سے بھی زائد ایسے اجسام موجود ہیں جن کا قطر 50 کلومیٹر یا اُس سے زیادہ ہے۔ اس پٹی پر پائے جانے والے اکثر اجسام کے ایک سے زائد چاند ہیں اور اکثر کے مدار زمین کے مدار سے کافی زاویہ پر ہیں۔ کوئپر پٹی کو دو علاحدہ علاحدہ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: روایتی پٹی اور گمکی پٹی۔

روایتی پٹی میں موجود اجسام میں سب سے پہلے QB1 کی دریافت 1992 میں ہوئی۔ اسی نسبت سے اس پٹی میں پائے جانے والے اجسام کو کیوبانوز کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس پٹی کی وسعت تقریباً 39.4 سے 47.47 فلکیاتی اکائی ہے۔ گمکی پٹی کا اجسام نیپچون کے ساتھ ایک گمکی رشتہ قائم ہے۔ یعنی نیپچون کی ثقلی کشش گمکی پٹی پر پائے جانے اجسام کے سورج کے گرد چکر لگانے کے دورانیہ پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ نیپچون جتنی دیر میں سورج کے تین چکر لگاتا ہے اُتنی دیر میں گمکی پٹی کے اجسام دو ہی چکر لگا پاتے ہیں۔

گو کہ منتشر طشتری کوئپر پٹی کے اوپر چڑھی ہوئی ہے مگر اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ منتشر پٹی کے بیشتر اجسام کا حضیض کوئپر پٹی کے اندر ہی پایا جاتا ہے۔ ان کا اوج سورج سے 150 فلکیاتی اکائی کی دوری پر ہے۔ ان کے مدار میں اور زمین کے مدار میں کافی زاویہ ہے۔ اکثر کے مدار زمین کے مدار سے عمودی 90 ڈگری کا زاویہ بناتے ہیں۔ بعض ماہرین فلکیات منتشر طشتری کو کوئپر پٹی کا حصہ ہی تصور کرتے ہیں اور انھیں کوئپر پٹی کے منتشر اجسام کہتے ہیں۔ نیپچون اپنی تخلیق کے اوائلی دور میں سورج سے دور ہو رہا تھا تو نتیجتاً اس کی ثقلی کشش کے زیرِ اثر یہ اجسام بے ترتیب مداروں میں داخل ہو گئے۔ منتشر طشتری پر موجود اجسام میں سب سے بڑا ارِس ہے، جس کا سورج سے فاصلہ 68 فلکیاتی اکائی ہے۔ اس کا قطر 2400 کلو میٹر یعنی 1500 میل ہے۔ ارِس کا حجم پلوٹو سے تقریباً پانچ فی صد زیادہ ہے۔ ارِس کا ایک چاند جس کا نام ڈسنومیا ہے پلوٹو سے خاصی مماثلت رکھتا ہے۔ دونوں کے مداروں کی شکل بیضوی ہے۔ ڈسنومیا کے حضیض کا فاصلہ سورج سے تقریباً 38.2 فلکی اکائی ہے۔ اور پلوٹو اور سورج کے درمیان اوسط فاصلہ بھی اتنا ہی ہے۔

نظامِ شمسی مرغولے کی شکل نما جادہ شیر کہکشاں میں واقع ہے۔ کائنات میں پائی جانے والی اربوں کہکشاؤں میں سے ایک کہکشاں جادہ شیر ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس میں دو کھرب ستارے موجود ہیں۔ جادہ شیر کہکشاں کا قطر ایک لاکھ نوری سال ہے۔ جبکہ اس کی موٹائی ایک ہزار نوری سال ہے۔ اس کہکشاں میں چار پیچ دار بازو پائے جاتے ہیں۔ سورج جادہ شیر کے مرکز کے گرد 220 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے محوِ گردش ہے۔ اس رفتار سے سورج 24 کروڑ سال میں ایک چکر مکمل کر پاتا ہے۔ اس دورانیہ کو کہکشانی سال سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سورج اس کہکشاں کے ایک داخلی بازو اورائن پر موجود ہے۔ سورج کی اس خاص پوزیشن کا زمین کے ارتقا میں بہت اہم کردار ہے۔

نظامِ شمسی کی تخلیق کے متعلق کئی نظریات اور تصورات ہیں۔ عمانویل کینٹ نے 1755 میں نیبولائی نظریہ پیش کیا۔ کینٹ کے مطابق آج سے تقریباً چار ارب چھ کروڑ برس قبل اس کائنات میں ماسوا سالمی بادل، جسے نیبولا کہا گیا، کے کچھ اور نہیں پایا جاتا تھا۔ اُس میں اتنی شدید ثقلی کشش پیدا ہوئی کہ وہ اُس کی تاب نہ لا سکا اور بکھر گیا۔ اس نیبولا کے بکھرنے کے باعث نظامِ شمسی وجود میں آیا۔ بلجیم کے ریاضی داں اور ماہر فلکیات پروفیسر جارجز لے مائٹرے کا نظریہ انفجارِ عظیم کافی مقبول ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انفجارِ عظیم کا واقعہ آج سے تقریباً 13 ارب 70 کروڑ برس قبل پیش آیا۔ اس کا تعلق بنیادی طور پر دور بعید کی کہکشاؤں میں ہونے والے سُرخ تغیر سے ہے اور یہ ہبل قانون کا پابند ہے۔

پلوٹو کی دریافت 1930 میں کلائڈ ٹامباغ نے کی تھی۔ اور جب ہی سے پلوٹو نظامِ شمسی کا ہی حصہ تصور کیا جا تا رہا۔ مگر 90 کے عشرے میں بعض ایسے اجرامِ فلکی دریافت ہوئے جو کہ پلوٹو سے بڑے تھے۔ ماہرین فلکیات اس پر غور کرنے لگے کہ آیا پلوٹو سیارہ ہے کہ نہیں۔ بالآخر کافی غور و خوض اور بحث و مباحثے کے بعد سائنس دانوں نے 2006 میں متفقہ طور پر فیصلہ لیتے ہوئے پلوٹو کو نظامِ شمسی سے خارج کر دیا۔ یہ ایک غیر معمولی فیصلہ تھا جس کے دور رس نتائج ہوں گے۔ فی الحال پلوٹو کو بونے سیارے کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔

نظامِ شمسی میں سورج مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ فلکی تمام تر حساب کتاب سورج کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ ان کی اکائی ہے فلکی اکائی۔ ایک فلکی اکائی کا قدر سورج سے زمین کا فاصلے کے برابر یعنی 149598000 کلومیٹر یا 93000000 میل ہے۔ جبکہ ستاروں کے درمیان فاصلوں کی پیمائش نوری سال میں کی جاتی ہے۔ ایک نوری سال کا قدر تقریباً 63,240 فلکی اکائی کے برابر ہوتا ہے۔

نظامِ شمسی میں سورج سے سیاروں کا فاصلہ جدول

شمار	سیارہ	فاصلہ (فلکی اکائی میں)
1	عطارد	0.4
2	زہرہ	0.7
3	زمین	1.0
4	مریخ	1.5
5	مشتری	5.0
6	زحل	10.0
7	یورینس	19.0
8	نیپچون	30.0

■

Dr. Saad Bin Zia
H. No. 4/770-G, Mahek Street
Hamdard Nagar 'B', Jamalpur
Aligarh - 202001 (UP)
Mob.:8860612267
Email: drsaadbinzia@gmail.com

فوارہ آبپاشی

سے پانی کی بچت اور بہتر کاشت کاری

محمد اویس

زراعت اور گلہ بانی (Animal Husbandry) کے لیے پانی ایک اہم پیداواری عنصر ہے اور ان کی ترقی کے لیے پانی بہت معاون ہے۔ ملک میں موجود کل پانی کا تقریباً 78 فیصد حصہ زراعت میں آبپاشی کی شکل میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن پانی کی کم ہوتی دستیابی، ماحولیاتی تبدیلی اور معیشت کے دیگر شعبہ جات کی بڑھتی مانگ، مستقبل میں پانی کی گھٹتی دستیابی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ایک تخمینے کے مطابق سال 2050 تک زراعت میں پانی کی موجودگی گھٹ کر 68 فیصد تک آنے کے امکان ہیں۔ نیتی آیوگ کی تازہ رپورٹ میں ملک میں پانی کے بحران سے آگاہ کیا گیا ہے اور سائنسی حقائق کی بنا پر زراعت میں پانی کی کھپت کو 50 فیصد سے کم کرنے پر زور دیا جارہا ہے۔ زراعت میں آبپاشی کے لیے زمینی پانی کا تقریباً ایک تہائی حصہ استعمال کیا جاتا ہے اور زمینی پانی کے اندھادھند استعمال کی وجہ سے اس کی سطح میں گراوٹ ہورہی ہے۔ آبپاشی کے روایتی طریقے میں زیادہ پانی کے استعمال اور نقصان کی وجہ سے بھی پانی کی کمی محسوس کی جارہی ہے کیونکہ اس سے کم رقبہ میں آبپاشی ہو پاتی ہے۔ اس کے علاوہ آبپاشی کے شعبے میں سبھی معیاروں (سرکاری اور ذاتی) پر مسلسل کوششوں کے باوجود ابھی ملک کے کل مزروعہ رقبہ کے آدھے سے کم (49 فیصد) حصے میں آبپاشی کی سہولیات مہیا کی جاسکی ہیں اور باقی زیر کاشت رقبے کی قسمت مانسونی بارش پر منحصر ہے۔ تبدیلی موسم کا بارانی علاقوں پر سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے اور ایک مطالعے کے مطابق بارانی فصلوں سے حاصل سالانہ آمدنی آبپاشی والے علاقوں کے بہ نسبت 30 - 25 فیصد کم ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں آبپاشی کے بہتر طریقوں (فوارہ اور قطرہ قطرہ) کے تحت زیادہ سے زیادہ زرعی رقبہ شامل کرنے کی ضرورت ہے جس سے کہ موجودہ پانی کا مناسب اور منافع بخش استعمال ہو سکے اور فی قطرہ زیادہ پیداوار اور آمدنی حاصل کی جاسکے۔

ان حالات میں پانی کی دستیابی بنائے رکھنے، زیادہ رقبہ میں آبپاشی کرنے اور لاگت میں کمی لانے کے لیے فوارہ آبپاشی طریقہ اناج فصلوں کے لیے ایک اچھا متبادل ہے۔ اس آبپاشی میں پانی کو چھڑکاؤ کی شکل میں فصلوں کو دیا جاتا ہے جس سے پانی پودوں پر بارش کی بوندوں کی طرح پڑتا ہے اور کھیت میں پانی کا بھراؤ بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس طریقے سے آبپاشی زمین کے ڈھلان کے مطابق کی جاسکتی ہے اور مٹی کا کٹاؤ بھی نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ پودوں کو برابر مقدار میں پانی ملتا ہے جس سے ان کی نشوونما یکساں ہونے سے زیادہ پیداوار ملتی ہے۔ اناج فصلوں کے علاوہ دلہن اور تلہن فصلوں کے لیے بھی یہ طریقہ بہت فائدہ مند ہے کیونکہ ان فصلوں میں کم پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

خرد آبپاشی کی ترقی اور سرکاری اقدام

نظام خرد آبپاشی (Microirrigation) پانی کا مناسب استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ رقبے میں آبپاشی کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ اس نظام میں دو طریقے فوارہ (Sprinkler) اور قطرہ قطرہ (Drip) رائج ہیں۔ پانی کی کم ہوتی موجودگی اور دیگر شعبہ جات کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے خرد آبپاشی کو حکمت عملی کے طور پر سال 2005-06 میں مرکزی حکومت کے ذریعے اسکیم کی شکل میں شروع کیا گیا تھا۔ اس اسکیم کا جائزہ کرنے والی کمیٹیوں نے وقتاً فوقتاً اس میں بدلاؤ کیا۔ سال 2010 میں اس اسکیم کو National Mission on Microirrigation اور سال 2014 میں پھر اسے National Mission on Sustainable Agriculture کے تحت ''کھیت میں پانی کا نظام'' کی شکل میں شروع کیا گیا۔ موجودہ وقت میں خرد آبپاشی اور آبپاشی کی دیگر اسکیموں کو وزیراعظم زرعی آبپاشی اسکیم (2015) کے تحت شامل کردیا گیا ہے جس کا خاص مقصد 'ہر کھیت کو پانی' اور 'فی قطرہ مزید فصل' حاصل کرنا ہے۔ وزیراعظم زرعی آبپاشی اسکیم کے شروع ہونے کے بعد کے سالوں میں خرد آبپاشی کے رقبے میں پرکشش توسیع ہوئی ہے اور اس کے تحت کل رقبہ بڑھ کر 11.58 لاکھ ہیکٹیئر ہوگیا ہے۔ جس میں قطرہ قطرہ 5.75 لاکھ ہیکٹیئر اور فوارہ کا 5.83 لاکھ ہیکٹیئر رقبہ شامل ہے۔

خرد آبپاشی کی صوبہ وارانہ پیش رفت

خرد آبپاشی خاص طور سے حکومت کے ذریعے اضافی امداد کے ساتھ اپنائی جارہی ہے۔ اس نظام آبپاشی کے تحت سب سے بڑا حصہ راجستھان میں (19.4%) تیار کیا گیا ہے اس کے بعد مہاراشٹرا (15.3%)، آندھرا پردیش (15.2%)، گجرات (12.4%) اور کرناٹک (11.4%) آتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر ریاستوں ہریانہ (6.3%)، مدھیہ پردیش (5.2%)، تملناڈو (4.3%) اور چھتیس گڑھ (3.10%) نے بھی خرد آبپاشی کے تحت رقبہ پوشی کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ مندرجہ بالا ریاستوں میں خرد آبپاشی کے تحت کل رقبہ کا تقریباً 93 فیصد حصہ محیط ہے۔ ان ریاستوں میں راجستھان کو خرد آبپاشی کے شعبے میں قیادت کرنے کا فخر حاصل ہے، جہاں نظام فوارہ کے تحت تقریباً ایک تہائی حصہ (33%)

موجود ہے۔ تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہریانہ، گجرات اور کرناٹک وغیرہ ریاستوں میں فوارہ طریقہ کو اپنانے میں زیادہ دلچسپی ہے جبکہ آندھرا پردیش، مہاراشٹرا اور تملناڈو قطرہ قطرہ طریقے کو اپنانے کی جانب زیادہ متوجہ ہیں۔

فوارہ آبپاشی کے فوائد

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ اس طریقہ کار میں پانی کو فوارہ کی مدد سے فصل یا مخصوص پودوں پر بارش کی شکل میں برسایا جاتا ہے۔ فصل کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف قسم کے فوارے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس نظام کو چلانے کے لیے بڑے پمپ کی ضرورت پڑتی ہے تا کہ پانی کا دباؤ بنایا جا سکے۔ یہ نظام زیادہ تر روایتی فصلوں میں استعمال کیا جاتا ہے جس میں پانی کے پائپ زمین پر بچھانا مشکل یا ناممکن ہوتا ہے۔ اس طریقے میں زمین میں نمی بنی رہتی ہے اور پودوں کو برابر پانی ملتا رہتا ہے۔ اس میں آبپاشی کے ساتھ کیمیاوی کھاد، حشرات کش ادویات وغیرہ کا چھڑکاؤ بھی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ ایسا کرنے پر پانی کی بربادی نہیں ہوتی ہے۔ فصلوں کے علاوہ گھاس کے میدانوں، پارکوں وسجاوٹی پودوں میں بھی فوارہ آبپاشی کی جاسکتی ہے۔ شروعاتی دور میں عمومی طور پر فوارہ کا استعمال صرف چائے، کافی، سونف اور ڈھالدار کھیتوں میں اگائی گئی فصلوں میں کیا جاتا تھا۔

جدول 1: فوارہ آبپاشی کے تحت پانی کی بچت اور پیداوار میں اضافہ

	فصل کا نام	پانی کی بچت (%)	پیداوار میں اضافہ (%)
1	گندم	35	24
2	جو	56	16
3	باجرا	56	19
4	کپاس	36	50
5	چنا	69	57
6	جوار	55	34
7	سورج مکھی	33	20

پانی کی کمی والے علاقوں میں یہ طریقہ آبپاشی بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہو رہا ہے جس کے ذریعے پانی کی تقریباً 50-30 فیصد تک بچت کی جاسکتی ہے۔ موجودہ وقت میں تقریباً 3 ملین ہیکٹیئر زمین میں فوارہ کا استعمال ہو رہا ہے۔

حدود و قیود

ان سب فوائد کے علاوہ اس کے کچھ حدود و قیود بھی ہیں جن کا ذکر حسب ذیل ہے:

1- یہ نظام تمام اقسام کی فصلوں کے لیے ایک جیسے نتائج نہیں دیتے ہیں۔

2- فصلوں کے حساب سے ان کی استعداد کار میں تبدیلی آتی ہے۔

3- اس نظام کی سب سے اہم ضرورت توانائی ہے اور اس کی تنصیب سے پہلے کاشتکار کے پاس بجلی کا کنکشن، جنریٹر یا شمسی توانائی کا ہونا ضروری ہے۔

4- ہوا کی رفتار تیز ہونے کی وجہ سے پانی صحیح طریقے سے تقسیم نہیں ہو پاتا ہے۔ چکنی مٹی اور گرم ہوا والے علاقوں میں اس نظام سے آبپاشی نہیں کی جاسکتی ہے۔

5- پانی کھارا نہ ہو، صاف ہو اور اس میں ریت، کنکر اور کوڑا کرکٹ نہیں ہونا چاہیے۔

وزیر اعظم زرعی آبپاشی اسکیم

(PMKSY)

اس اسکیم کے اہم مقاصد میں کھیتوں کی سطح پر آبپاشی کے سلسلے میں سرمایہ کاریوں کا انضمام حاصل کرنا ہے یعنی آبپاشی (ہر کھیت کو پانی) کے تحت قابل کاشت رقبہ میں اضافہ کرنا، پانی کے ضیاع کو کم کرنے کے لیے کھیتوں میں پانی کے استعمال کی اثر پزیری کو بہتر بنانا، مناسب آبپاشی اور پانی کی بچت کی دیگر ٹیکنالوجیاں اپنانے میں اضافہ کرنا اور آبی ذخائر کی دوبارہ بھرائی میں اضافہ کرنا۔ اس کے علاوہ مخیلی شہری کاشت کاری کے لیے میونسپل پر مبنی صاف کردہ پانی کا دوبارہ استعمال کرنے کے قابل عمل ہونے کا پتہ لگا کر پانی کی بچت کے پائدار طریقے شروع کرنا اور آبپاشی کے نظام میں زیادہ سے زیادہ نجی سرمایہ کاری کو راغب کرنا ہے۔ اس طریقے کو اپنانے سے 50-40 فیصد پانی کی بچت کے ساتھ 40-35 فیصد پیداوار میں اضافہ اور فصل کے معیار میں بہتری ممکن ہے۔ اس اسکیم کا فائدہ سبھی زمرہ کے کسان اٹھا سکتے ہیں۔ اس اسکیم کو حاصل کرنے کے لیے کسان کے پاس اپنی زمین اور پانی کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ ایک کسان کو اسی زمین پر دوبارہ سات سال بعد اسکیم کا فائدہ لینے کی اجازت ہے۔ فطری طور سے یہ اسکیم پانی کی بچت اور آبپاشی کے لیے ایک پائدار ماڈل کا باعث بن سکتی ہے۔ تیز آگے چل کر یہی اور زرعی ترقی یقینی موجب ہوسکتی ہے۔

وزیر اعظم زرعی آبپاشی اسکیم کے تحت گرانٹ

خواہش مند کسان اپنا رجسٹریشن اپنے صوبہ کے شعبہ زراعت اور باغبانی پر آن لائن درخواست جمع کر سکتے ہیں اور اس اسکیم کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ رجسٹریشن کے لیے کسان کے پاس شناخت کے لیے آدھار کارڈ، زمین کے لیے کھتونی اور گرانٹ کی رقم منتقل کے لیے بینک پاس بک کے صفحہ اول کی نقل ہونا لازمی ہے۔

قطرہ قطرہ اور فوارہ آبپاشی تنصیب کرنے والی رجسٹرڈ کمپنیوں میں سے کسی بھی فرم سے کسان اپنے مطلوبہ طور پر فراہمی رتنصیب کاری کرانے کے لیے آزاد ہے۔ کمپنی یا اس کے ڈیلر کو BIS معیار کے مطابق سسٹم کے اجزاء کی فراہمی کرنا لازمی ہے اور فروخت کے بعد کم از کم 3 سال تک مفت سروس کی سہولت مہیا کرنا بھی کمپنی کی ذمہ داری ہے۔

قطرہ قطرہ اور فوارہ آبپاشی کے لیے چھوٹے وحاشیہ دار کسان کو یونٹ لاگت کی 90 فیصد گرانٹ سرکار کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اس میں 50 فیصد مرکزی حکومت و 40 فیصد ریاستی حکومت کا حصہ شامل ہے۔ 10 فیصد لاگت کسانوں کو لگانی ہوتی ہے۔ دیگر زمرہ کے کسانوں کو یونٹ لاگت پر 80 فیصد گرانٹ دی جاتی ہے۔ باغبانی، زرعی اور گنا فصلوں میں قطرہ قطرہ وفوارہ آبپاشی کو فروغ دینے اور زیادہ معیاری فصل پیدا کرنے کے لیے کسانوں کو حکومت اتر پردیش نے 35 فیصد اضافی امداد دینے کا نظم کیا ہے۔ حکومت اتر پردیش نے سال 19 - 2018 میں 198.74 کروڑ روپیہ کی اسکیم میں درج فہرست اقوام رقبائل کسانوں کے لیے 42.74 کروڑ روپیہ کا خصوصی بندوبست کیا ہے۔ تنصیب کار کمپنیوں رفرموں کی مجوزہ قیمت کی بنا پر حکومت ہند کے ذریعے تعین شدہ یونٹ لاگت کے مطابق ضلع کمیٹی کے تصدیق کرنے کے بعد گرانٹ کی رقم ڈائرکٹ بینیفٹ ٹرانسفر (DBT) سے براہ راست کسان کے کھاتے میں منتقل کی جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام

زرعی فصلوں کی پیداوار بڑھانے میں پانی ایک کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ پانی کی عدم موجودگی اور زراعت میں پانی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے فوارہ آبپاشی ایک مناسب نظام ہے۔ اس نظام کے تحت آبپاشی کرنے سے زیادہ رقبے میں آبپاشی کی جاسکتی ہے۔ ماحولیاتی تبدیلی اور صنعت کاری کی وجہ سے زراعت میں پانی کی دستیابی مستقبل میں ایک سنگین چیلنج ہوسکتا ہے۔ اس لیے فوارہ نظام کو جامع سطح پر اپنانے کی ضرورت ہے۔

■

Dr. Mohd Awais
ICAR-National Insititute of Agricultural Economics & Policy Research,
DPS Marg, Pusa, New Delhi - 110012
E-mail: drmohdawais@gmail.com
Mob.:9319324585

دستاویز کا ڈیزائن بنانا
(Designing the Document)

کوئی بھی دستاویز تیار کرنا شروع کرنے سے پہلے اس کا ڈیزائن بنالینا ہمیشہ اچھا رہتا ہے۔ ایم ایس-ورڈ کے ربن میں پیج لے آؤٹ (Page Layout) ٹیب کے ذریعے آپ دستاویز کا ضرورت کے مطابق ڈیزائن بنا سکتے ہیں۔ دیگر ٹیبوں کی طرح Page Lyaout ٹیب (تصویر WD-7.1) میں بھی متعدد حصے اور بٹن ہوتے ہیں، جن کے ذریعے آپ دستاویز کا ڈیزائن سیٹ کر سکتے ہیں۔

تصویر WD-7.1: پیج لے آؤٹ ٹیب

تھیم سیکشن (Themes Section)

کسی دستاویز کا تھیم (Theme)، رنگ (Colors)، فونٹ (Fonts) اور خاص اثر (Effects) کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ Page Layout ٹیب کے Themes حصہ

تصویر WD-7.2: تھیم گیلری

میں دیکھیں گے۔ Themes آپشن کے بغل میں تین دیگر آپشن ہیں: Fonts، Colors اور Effects۔ آپ ان تینوں میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ آبجیکٹ کی نچ گیلری (تصویر WD-7.2) میں سے من چاہا آپشن چن کر اپنی دستاویز کی Theme سیٹ کر سکتے ہیں۔

Themes آپشن کے ذریعے یہ تینوں آبجیکٹ ایک ساتھ سیٹ ہو سکتے ہیں۔

Theme کا مطلب ایک دستاویز میں فونٹ، رنگوں وغیرہ کا بدلنا، اسٹائل میں کوئی تبدیلی کیے بغیر ممکن ہے۔

پیج سیٹ اَپ حصہ (Page Setup Section)

پیج سیٹ اَپ حصہ کے ذریعے آپ دستاویز کا خاکہ (Layout) بنا سکتے ہیں۔ اس حصہ کے بٹنوں کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(i) حاشیے سیٹ کرنا (Setting Margins): دستاویز میں حاشیے سیٹ کرنے کے لیے Page Layout ٹیب کے پیج سیٹ اَپ حصہ میں Margins بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔ اس سے ایک پل-ڈاؤن مینو (تصویر WD-7.3) کھلے گا، جس میں حاشیے کے الگ الگ اسٹائل ہوں گے۔ آپ ضرورت کے مطابق اپنی دستاویز میں عام (Normal)؛ چھوٹے (Narrow)، متوسط (Moderate)، چوڑے (Wide) یا منعکس (Mirrored) حاشیے سیٹ کر سکتے ہیں۔ صرف پل-ڈاؤن مینو میں مناسب آپشن پر کلک کیجیے۔

Margins کے پل-ڈاؤن مینو میں 'Custom Margins...' ہدایت دینے پر پیج سیٹ اَپ ڈائیلاگ باکس کھلتا ہے، جس کے بارے میں ہم آپ کو آگے بتائیں گے۔

(ii) سمت بندی بدلنا (Changing Orientation): پیج سیٹ اَپ حصہ میں دیے گئے Orientation بٹن کے ذریعے آپ دستاویز کی سمت بندی بدل سکتے ہیں، یعنی اس کے خاکہ کو لمبائی میں (Portrait Size) یا چوڑائی میں (Landscape Size) سیٹ کر سکتے ہیں۔ اس بٹن میں تیر کے نشان پر کلک کرنے سے آپ کے سامنے دو آپشن نمودار ہوتے ہیں- Portrait اور Landscape۔ ان میں سے کسی پر بھی کلک کرکے آپ دستاویز کی سمت بندی فوراً بدل سکتے ہیں۔

(iii) صفحات کا سائز سیٹ کرنا (Setting Paper Size): ایم ایس-ورڈ میں عموماً صفحہ کو لیٹر کے سائز میں ($8_{1/2}$"x11") سیٹ کیا ہوتا ہے۔ اس بٹن کے ذریعے آپ کاغذ کا مناسب سائز چن سکتے ہیں۔ Orientation کے ٹھیک نیچے دیے گئے اس بٹن

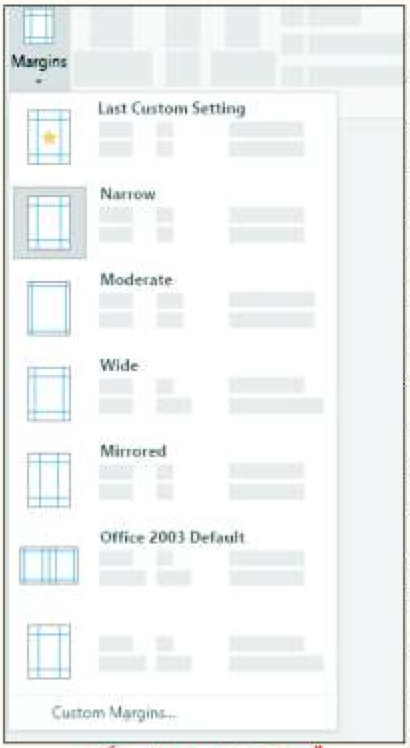

تصویر WD-7.3: ورڈ حاشیے سیٹ کرنا

کے تیر کے نشان کو کلک کرنے پر ایک مینو کھلتا ہے، جس میں کاغذ کے سائز سے متعلق کچھ آپشن ہوتے ہیں۔ آپ مناسب آپشن پر کلک کرکے صفحہ کو لیٹر کے سائز میں ("8½"x11)، A 4 سائز میں (21cmx29.7cm)، قانونی دستاویز سائز میں ("8½"x11)، A3 سائز میں (29.7cmx42cm)، B 4 سائز میں (25cmx35.4cm) یا B5 سائز میں (18.2cmx25.7cm) سیٹ کرسکتے ہیں۔ مینو میں 'More Paper Size...' ہدایت دینے پر پیج سیٹ اَپ ڈائیلاگ باکس کھلتا ہے، جس کے بارے میں ہم آپ کو آگے بتائیں گے۔

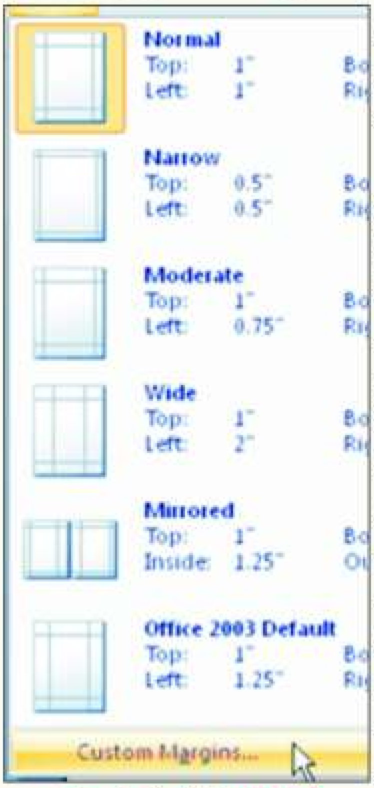

تصویر WD-7.4: صفحات کا سائز سیٹ کرنا

(iv) کالم بنانا (Making Columns): آپ اپنی دستاویز کو اخباروں کی طرح کئی کالموں میں بھی بانٹ سکتے ہیں۔ اس کے لیے Page Layout ٹیب کے پیج سیٹ اَپ حصہ کا 'Colmns' بٹن کلک کیجیے۔ ایسا کرنے پر اس بٹن کے پاس تصویر WD-7.5 کی طرح ایک ڈراپ-ڈاؤن مینو کھلے گا، جس میں مناسب آپشن پر کلک کرکے آپ ایک جیسے کالم بنا سکتے ہیں۔ جیسے ہی آپ ماؤس بٹن کلک کریں گے، آپ کی دستاویز برابر چوڑائی کے اتنے ہی کالموں میں بانٹ دی جائے گی اور ان کے درمیان کی خالی جگہ صفحہ کے سائز کے مطابق ایم ایس-ورڈ کے ذریعے خود ہی طے کرلی جائے گی۔

اگر آپ نے یہ کام کوئی ٹیکسٹ چن کر کیا ہوگا، تو صرف چنے ہوئے ٹیکسٹ کو ہی کالموں میں بانٹا جائے گا، ورنہ پوری دستاویز کو اس طرح لگایا جائے گا۔ بنائے گئے کالموں کی غیر مربوط چوڑائی اور ان کے درمیان الگ الگ فرق سے بچنے کے لیے آپ کو کالم بنانے سے پہلے ہی صفحہ کا سائز، قسم اور حاشیہ سیٹ کرلینا چاہیے۔

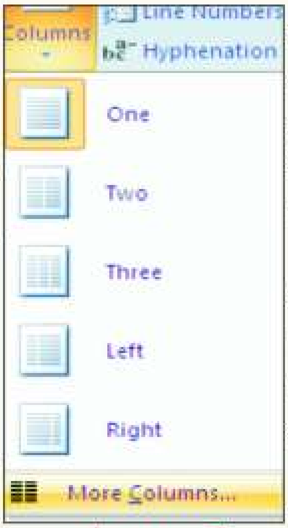

تصویر WD-7.5: کالم بنانا

اس کے لیے کالم ڈائیلاگ باکس استعمال کرنا چاہیے، جو کہ تصویر WD-7.6 میں دکھایا گیا ہے۔ پل- ڈاؤن مینو میں 'More Columns...' ہدایت دینے پر یہ ڈائیلاگ باکس حاصل ہوتا ہے۔

اس ڈائیلاگ باکس کے 'Number of Columns' اسپن باکس میں آپ کالموں کی تعداد طے کرسکتے ہیں یا اوپر دیے گئے کارآمد آپشنز میں سے کسی کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ اگر آپ نے 'Width and spacing' حصہ میں 'Equal column width' چیک باکس کو سیٹ کیا ہے، تو سبھی کالم برابر سائز کے ہوں گے، ورنہ آپ ان کی چوڑائی اور ان کے درمیان کا فرق طے کرسکتے ہیں۔ 'Line between' چیک باکس کو سیٹ کرکے آپ کالموں کے بیچ میں لائن بھی کھینچ سکتے ہیں۔

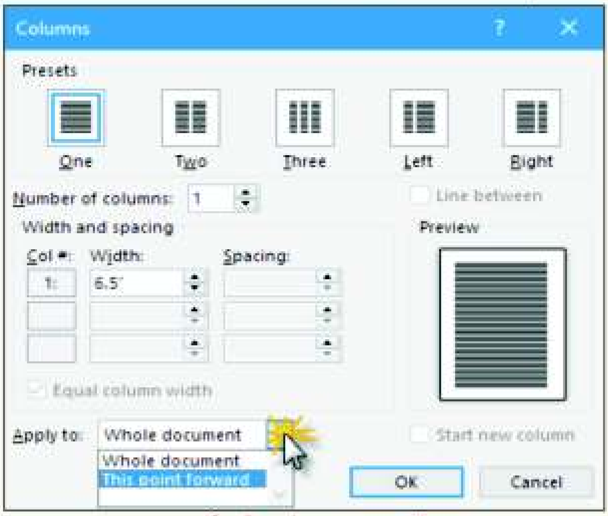

تصویر WD-7.6: کالم ڈائیلاگ باکس

آپ کے ذریعے کی گئی سیٹنگ کا اثر دائیں نچلے کونے پر دیے گئے 'Preview' باکس میں دکھایا جاتا ہے۔ مطمئن ہونے پر 'OK' بٹن کلک کیجیے۔ اگر آپ بنے ہوئے کالموں کو ہٹا دینا چاہتے ہیں، تو کالم بٹن کے ڈراپ- ڈاؤن باکس میں کالم ڈائیلاگ باکس میں صرف ایک کالم چنیے اور اس کو 'Whole document' پر لاگو کیجیے۔ اس سے بنے ہوئے کالم ختم ہوکر ان کا ٹیکسٹ ایک کالم کے صفحات میں سیٹ کردیا جائے گا۔

(v) پیج یا سیکشن بریک (Page or Section Break): یہ بٹن پیج سیٹ اَپ حصہ کے Orientation بٹن کے بغل میں دیا گیا ہے۔ اس کا کام Insert ٹیب کے Pages حصہ کے Page Break بٹن سے ملتا جلتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس بٹن کے ذریعے آپ صفحہ کی ہی نہیں، مختلف حصوں کی بھی تقسیم کرسکتے ہیں۔

تصویر WD-7.7: صفحہ یا حصہ کی تقسیم

اس بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کرنے سے ایک پل- ڈاؤن مینو کھلتا ہے (تصویر WD-7.7)، جو دو افقی حصوں- صفحہ کی تقسیم (Page breaks) اور حصہ کی تقسیم (Section Breaks) میں بٹا ہوا ہوتا ہے۔

Page Breaks حصہ کے Page آپشن کو چننے سے آپ نقطہ شمول کی جگہ سے نیا صفحہ شروع کر سکتے ہیں۔ Column آپشن نقطہ شمول کی جگہ سے نیا کالم شروع کرنا ممکن کرتا ہے۔ Text Wrapping آپشن کے ذریعے آپ تصویر، ٹیبل یا دیگر کسی آبجیکٹ کے آس پاس کا ٹیکسٹ، جیسے ذیلی سرخی، نمبر شمار وغیرہ کو بنیادی ٹیکسٹ سے الگ کر سکتے ہیں۔

Section Breaks حصہ کے Next Page اور Continuous آپشن چننے سے آپ ایک حصہ کو دو حصوں میں توڑ کر اسے بالترتیب نئے صفحہ سے یا اسی صفحہ میں شروع کر سکتے ہیں۔ اسی طرح Even Pae اور Odd Page آپشن چن کر آپ نئے حصہ کو بالترتیب اگلے جفت صفحہ نمبر والے پیج یا اگلے طاق نمبر والے پیج سے شروع کر سکتے ہیں۔

(vi) لائنوں میں نمبر لگانا (Numbering Lines): یہ بٹن Page and Section Breaks بٹن کے ٹھیک نیچے دیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے آپ دستاویز میں ٹائپ کی گئی لائنوں کے آگے نمبر لگا سکتے ہیں۔ یہ نمبر عموماً ہر لائن کے سامنے حاشیہ میں جوڑے جاتے ہیں۔

Line Numbers کے پل- ڈاؤن مینو میں لائنوں میں نمبر لگانے کے لیے متعدد آپشن موجود ہیں۔ Continuous پر کلک کرنے سے آپ کی پوری دستاویز کی سبھی لائنوں کے آگے نمبر جڑ جاتے ہیں۔ Restart Each Page چننے پر ہر پیج کی پہلی لائن سے نمبر دوبارہ شروع ہوتے ہیں۔ اسی طرح Restart Each Section Suppress For Current Paragraph پر کلک کرنے سے چنے ہوئے پیراگراف کی لائنوں سے نمبر مٹ جاتے ہیں۔

'Line Numbering Options...' ہدایت دینے پر پیج سیٹ اَپ ڈائیلاگ بکس کھلتا ہے، جس کے بارے میں ہم آپ کو آگے بتائیں گے۔

(vii) نشانِ الحاق لگانا (Hyphenation): آپ نے دیکھا ہوگا کہ عموماً اخبار و رسائل کی سطروں میں زیادہ سے زیادہ الفاظ جوڑنے کے لیے آخری لفظ کو نشانِ الحاق کے ذریعے توڑ دیا جاتا ہے۔ اس سے سبھی الفاظ کے درمیان خالی جگہ بھی برابر رہتی ہے اور زیادہ الفاظ بھی جڑ جاتے ہیں۔ یہ اثر آپ اپنے ایم ایس- ورڈ کی دستاویز میں بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے Line Numbers بٹن کے نیچے دیے گئے بٹن پر کلک کریں۔ کھلنے والے مینو میں Automatic آپشن پر کلک کرنے سے پوری دستاویز میں اپنے آپ نشان الحاق لگ جائیں گے۔ Manual آپشن چننے پر ورڈ (ڈھونڈو/ بدلو ڈائیلاگ باکس کی طرح) کہیں بھی نشان الحاق لگانے سے پہلے آپ کی اجازت لے گا۔

Siddhartha was greatly a gifted child. It is told that he received excellent education befitting to become a successful king in future. He was outstanding in sports, highly skilful in archery and different physical games that required extraordinary courage and strength. He was amazingly handsome and possessed a very attractive physique . He had a swift and intensified intellect implicit with reflective thinking and compassionate nature. At the age of sixteen he was married to Yasodhara, a beautiful princess from one of the neighbouring states. Siddhartha was a lucky person who possessed everything from his childhood. He had a noble descent and an attractive personality.

تصویر WD-7.9: پیج سیٹ اَپ ڈائیلاگ باکس

پیج سیٹ اَپ ڈائیلاگ باکس (Page Setup Dialog Box)

Page Layout ٹیب کے پیج سیٹ اَپ ڈائیلاگ باکس لانچر پر کلک کرنے سے

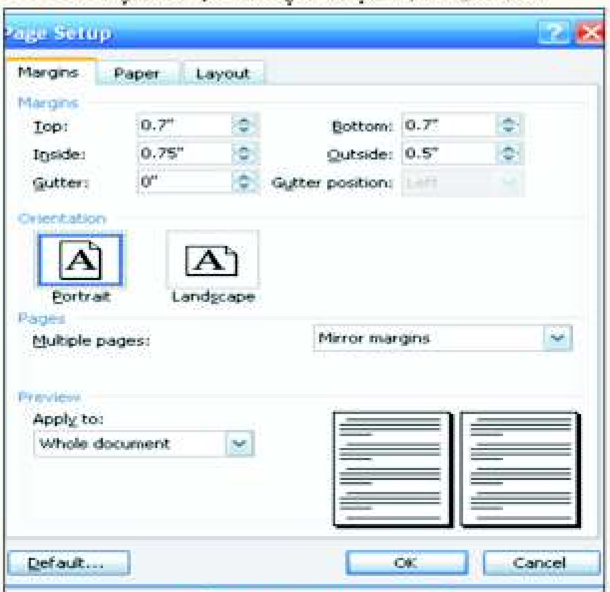

تصویر WD-7.8: نشان الحاق لگایا ہوا ٹیکسٹ

تصویر WD-7.9 کی طرح Page Setup ڈائیلاگ باکس کھلتا ہے۔

اس ڈائیلاگ باکس میں تین ٹیب شیٹ (Tab Sheets) ہیں جن میں سے دو Margins اور Paper – زیادہ اہم ہیں۔تصویر WD-7.9 میں Margins ٹیب شیٹ دکھائی گئی ہے۔اس ٹیب شیٹ میں دستاویز کے حاشیوں کو سیٹ کیا جاتا ہے۔کسی پیج پر آپ جتنا زیادہ حاشیہ چھوڑیں گے،ٹیکسٹ مواد کو لگانے کے لیے اتنی ہی کم جگہ بچے گی۔اس لیے حاشیہ کم ہی سیٹ کرنا چاہیے۔ضروری ہونے پر آپ حاشیہ کو کم یا زیادہ کر سکتے ہیں۔ آپ اس کے ساتھ 'Orientation' حصہ کے 'Portrait' اور 'Landscape' میں سے کسی آپشن بٹن کو کلک کرکے سیٹ کر سکتے ہیں۔

'Paper Size' ڈراپ– ڈاؤن لسٹ باکس کو کھول کر اس میں سے کاغذ کا مناسب سائز چن سکتے ہیں۔

'Paper Source' میں یہ بتایا جاتا ہے کہ دستاویز کو چھاپتے وقت کاغذ الگ الگ ٹکڑوں میں کٹا (Cut Sheet) ہوگا یا لگاتار (Continuous) اسٹیشنری کے روپ میں ہوگا۔اسی طرح 'Layout' کی ٹیب شیٹ میں دستاویز کا خاکہ طے کیا جاتا ہے۔

پیج سیٹ اَپ کے ڈائیلاگ باکس میں آپ اپنی خواہش کے مطابق سبھی ضروری سیٹنگ کرکے 'OK' بٹن کو کلک کر دیجیے۔اس سے آپ کے ذریعے کی گئی سیٹنگ کے مطابق ایم ایس–ورڈ کے ذریعے اسکرین پر نظر آنے والا خاکہ بہتر کرلیا جائے گا،ساتھ ہی ڈائیلاگ باکس بند بھی ہو جائے گا۔

پس منظر حصہ (Page Background Section)

پس منظر (Page Background) کے ذریعے آپ اپنی دستاویز کے بیک گراؤنڈ میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔اس حصہ کے بٹنوں کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(i) واٹر مارک جوڑنا (Inserting Watermark): آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ دستاویزوں کے پس منظر (بیک گراؤنڈ) میں ہلکے رنگ میں 'Confidential'، 'Urgent'، 'Do Not Copy' جیسے الفاظ چھپے ہوتے ہیں۔ایسے الفاظ کو واٹر مارک کہا

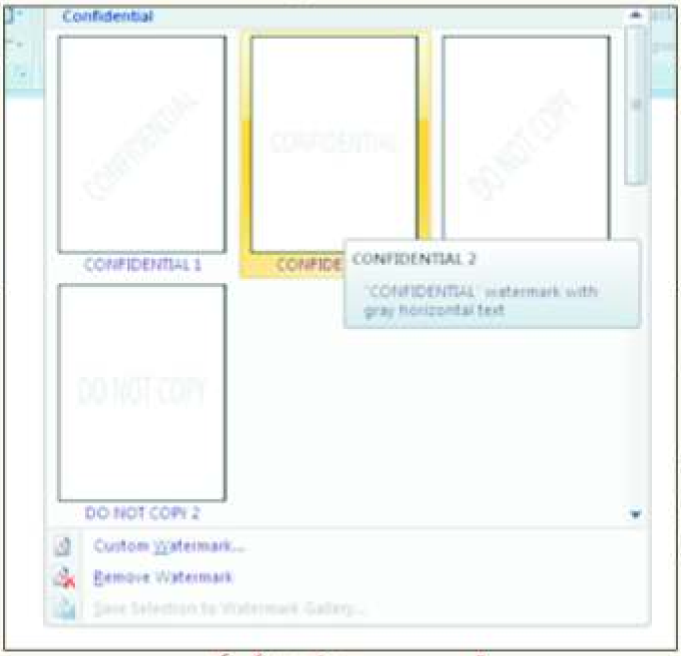

تصویر WD-7.11: واٹر مارک ڈائیلاگ باکس

جاتا ہے۔ایم ایس–ورڈ کے ربن میں دیے گئے Page Layout ٹیب کی مدد سے آپ اپنی دستاویز میں آسانی سے واٹر مارک جوڑ سکتے ہیں۔

اس کے لیے Page Layout ٹیب کے پیج بیک گراؤنڈ میں سب سے اوپر دیے گئے واٹر مارک (Watermark) بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔

اس سے ایک واٹر مارک گیلری، جس میں کچھ مشہور واٹر مارک، جیسے 'Confidential'، 'Do Not Copy'، 'Draft'، 'Sample'، 'ASAP'، 'Urgent' وغیرہ کے آپشن دیے گئے ہیں۔مطلوبہ آپشن پر کلک کرنے سے وہ فوراً دستاویز کے پس منظر میں جڑ جاتا ہے۔

اگر مطلوبہ واٹر مارک ان آپشنز میں موجود نہیں ہے،تو آپ خود بھی واٹر مارک بنا سکتے ہیں۔ اس کے لیے واٹر مارک گیلری میں 'Custom Printed Watermark...' ہدایت دیجیے۔ ایسا کرنے پر Watermark ڈائیلاگ باکس تصویر WD-7.11 کی طرح کھلے گا۔ آپ ریڈیو بٹن کے ذریعے سب سے پہلے یہ طے کریں کہ آپ بیک گراؤنڈ کی تصویر کا یا ٹیکسٹ کا واٹر مارک دینا چاہتے ہیں۔اگر آپ بیک گراؤنڈ میں تصویر کا واٹر مارک جوڑنا چاہتے ہیں،تو Picture Watermark آپشن چنیے۔اس کے بعد ...Select Picture بٹن پر کلک کیجیے۔اس سے Insert Picture ڈائیلاگ باکس کھلے گا،جس کے بارے میں ہم آپ کو باب– 5 میں بتا چکے ہیں۔ دستاویز میں

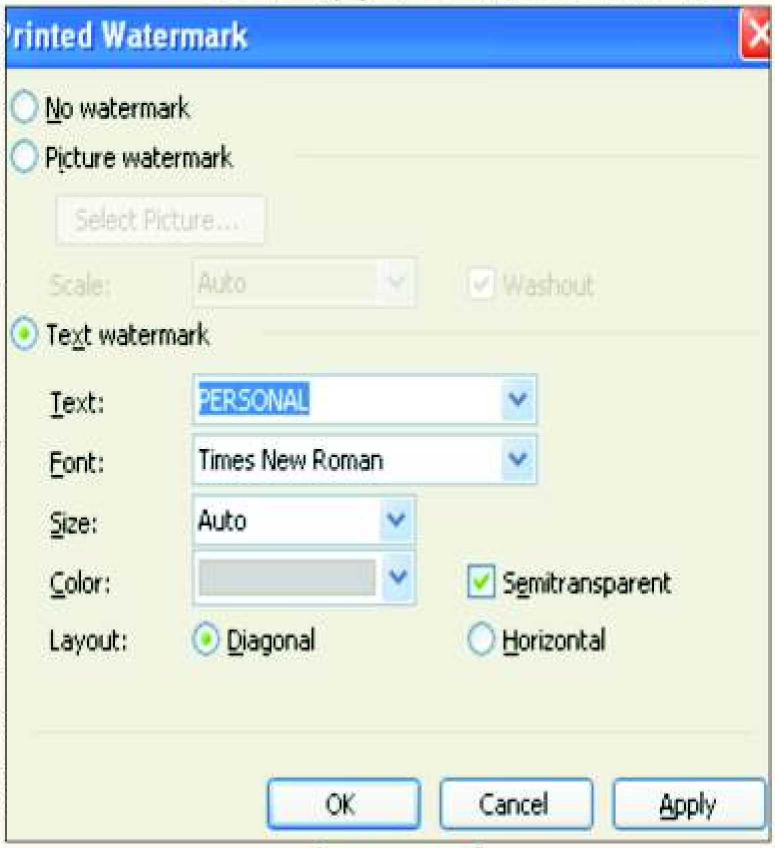

تصویر WD-7.10: واٹر مارک

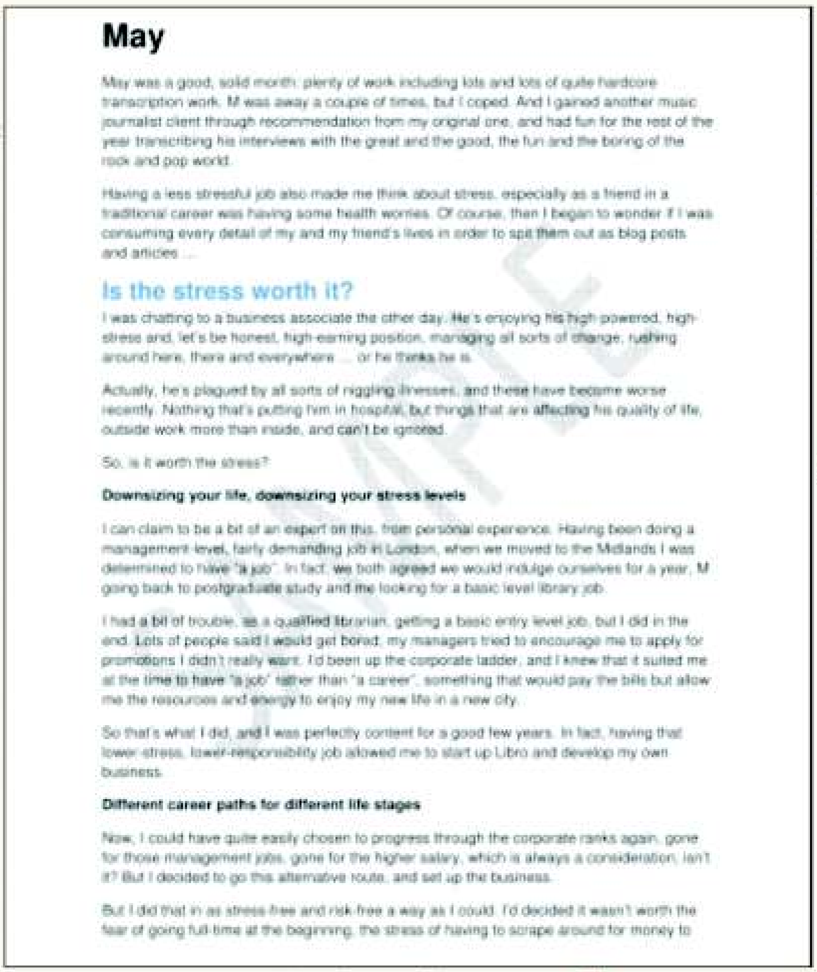

May

May was a good, solid month: plenty of work including lots and lots of quite hardcore transcription work. M was away a couple of times, but I coped. And I gained another music journalist client through recommendation from my original one, and had fun for the rest of the year transcribing his interviews with the great and the good, the fun and the boring of the rock and pop world.

Having a less stressful job also made me think about stress, especially as a friend in a traditional career was having some health worries. Of course, then I began to wonder if I was consuming every detail of my and my friend's lives in order to spit them out as blog posts and articles ...

Is the stress worth it?

I was chatting to a business associate the other day. He's enjoying his high-powered, high-stress and, let's be honest, high-earning position, managing all sorts of change, rushing around here, there and everywhere ... or he thinks he is.

Actually, he's plagued by all sorts of niggling illnesses, and these have become worse recently. Nothing that's putting him in hospital, but things that are affecting his quality of life, outside work more than inside, and can't be ignored.

So, is it worth the stress?

Downsizing your life, downsizing your stress levels

I can claim to be a bit of an expert on this, from personal experience. Having been doing a management-level, fairly demanding job in London, when we moved to the Midlands I was determined to have "a job". In fact, we both agreed we would indulge ourselves for a year, M going back to postgraduate study and me looking for a basic level library job.

I had a bit of trouble, as a qualified librarian, getting a basic entry level job, but I did in the end. Lots of people said I would get bored; my managers tried to encourage me to apply for promotions I didn't really want. I'd been up the corporate ladder, and I knew that it suited me at the time to have "a job" rather than "a career", something that would pay the bills but allow me the resources and energy to enjoy my new life in a new city.

So that's what I did, and I was perfectly content for a good few years. In fact, having that lower-stress, lower-responsibility job allowed me to start up Libro and develop my own business.

Different career paths for different life stages

Now, I could have quite easily chosen to progress through the corporate ranks again, gone for those management jobs, gone for the higher salary, which is always a consideration, isn't it? But I decided to go this alternative route, and set up the business.

But I did that in as stress-free and risk-free a way as I could. I'd decided it wasn't worth the fear of going full-time at the beginning, the stress of having to scrape around for money to

تصویر WD-7.12: واٹر مارک جوڑنے کے بعد صفحہ

تصویر کا واٹر مارک جوڑنا کمپیوٹر میں فائل کی شکل میں دستاویز تصویر کو دستاویز میں جوڑ سکتے ہیں۔ Printed Watermark ڈائیلاگ باکس میں Scale لسٹ باکس کی مدد سے آپ تصویر واٹر مارک کا سائز طے کرسکتے ہیں۔ Apply بٹن پر کلک کرکے دیکھیں کہ واٹر مارک کیسا لگتا ہے۔ اگر آپ واٹر مارک سے مطمئن نہیں ہیں، تو دوبارہ ضرورت کے مطابق تبدیلی کریں۔ مطمئن ہوجانے پر OK بٹن پر کلک کیجیے۔

ٹیکسٹ واٹر مارک دینے کے لیے Printed Watermark ڈائیلاگ باکس میں Text Watermark آپشن چنیں۔ Language، Text، Fount، Size اور Color ٹیکسٹ باکسوں کے ذریعے مطلوبہ واٹر مارک کی بالترتیب زبان، ٹیکسٹ، فونٹ، فونٹ کا سائز اور رنگ طے کیجیے۔ Layout آپشن میں Diagonal یا Horizontal پر کلک کرکے واٹر مارک کا ترچھا یا افقی ہونا طے کیجیے۔ مطمئن ہوجانے پر OK بٹن پر کلک کیجیے۔ تصویر WD-7.12 میں آپ واٹر مارک دستاویز پر دیکھ سکتے ہیں۔

(ii) رنگ بھرنا (Colouring the Background of Page): Watermark بٹن کے ٹھیک نیچے Page Color بٹن کے ذریعے آپ اپنی دستاویز کے بیک گراؤنڈ میں دلکش رنگ بھر سکتے ہیں۔ اس بٹن کو کلک کرنے پر کلر پیلیٹ کھلتی ہے، جس کے بارے میں ہم آپ کو باب-5 میں بتا چکے ہیں۔ صفحہ میں رنگ بھرنے کا عمل بھی ویسا ہی ہے۔

(iii) پیج میں بارڈر جوڑنا (Adding Borders arount the Page): Page Color بٹن کے نیچے دیے گئے Page Borders بٹن کے ذریعے آپ اپنے مکمل پیج میں بارڈر جوڑ سکتے ہیں۔ اس بٹن پر کلک کرنے سے Border and Shading ڈائیلاگ باکس کھلتا ہے، جس کے بارے میں ہم باب-4 میں تفصیل سے بتا چکے ہیں۔

پیراگراف حصہ (Paragraph Section)

Page Layout ٹیب کے پیراگراف حصہ کا کام Home ٹیب کے پیراگراف حصہ سے ملتا جلتا ہے۔ اس حصے کو دو دیگر حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ Indent اور Spacing۔ Indent حصہ میں اوپر اور نیچے دیے گئے ٹیکسٹ باکسوں کی مدد سے آپ دستاویز میں بالترتیب بایاں اور دایاں انڈینٹ سیٹ کرسکتے ہیں۔ اسی طرح Spacing حصہ میں اوپر اور نیچے دیے گئے ٹیکسٹ باکسوں کی مدد سے آپ چنے ہوئے پیراگراف کے بالترتیب پہلے اور بعد میں خالی جگہ چھوڑ چکے ہیں۔

ارینج حصہ (Arrange Section)

آپ دیکھیں گے کہ Page Layout ٹیب کا ارینج حصہ ہلکے رنگ میں دکھائی دیتا ہے، جس کا مطلب ہے کہ یہ ناکارہ ہے۔ یہ حصہ دستاویز میں تصویر یا شکل جوڑنے پر ایکٹو ہوتا ہے اور Drawing Tools اور Picture Tools کے فارمیٹ ٹیب میں ارینج حصہ کی طرح ہوتا ہے۔ باب- 5 میں ہم اس کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرچکے ہیں۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

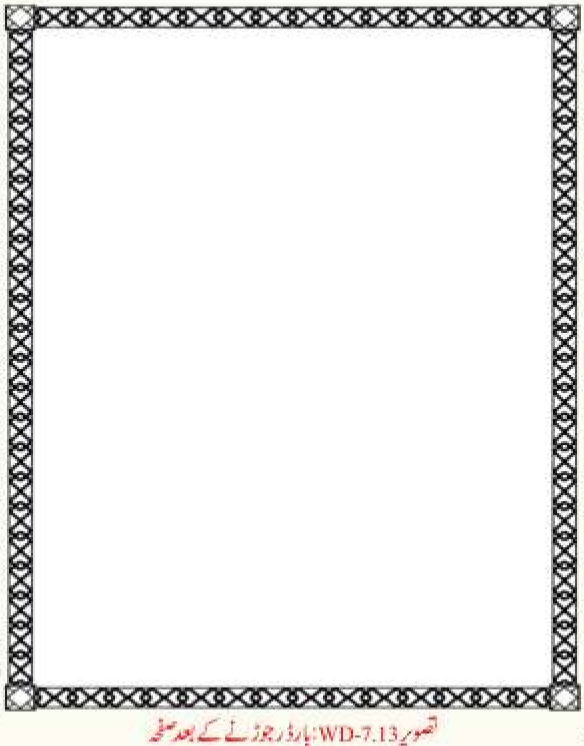

تصویر WD-7.13: بارڈر جوڑنے کے بعد صفحہ

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

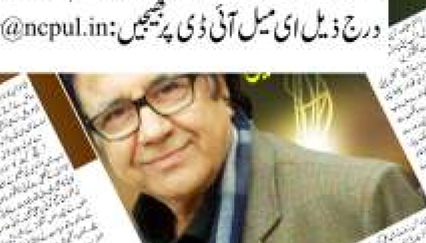

تبصرہ وتعارف

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

مصنف: سید احتشام حسین
صفحات: 341 ، قیمت: 105 روپے، سنہ اشاعت: 2019
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی
مبصر: مظہر حسنین، T-39، سیکٹر 7، جسولہ وہار، نئی دہلی 25

ترقی پسند ناقدین میں سید احتشام حسین کا شمار صف اول کے ادبا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے سائنٹفک تنقید کو اردو میں متعارف کرایا۔ احتشام حسین کے بغیر ترقی پسند تنقید کا ذکر نامکمل ہے۔ لیکن وہ صرف نقاد ہی نہیں تھے، بلکہ استاد، افسانہ نگار، سفرنامہ نگار، ڈراما نگار اور شاعر بھی تھے۔ انھوں نے ایک درجن سے زائد کتابوں کی تصنیف، ترتیب اور تدوین کی۔ ان کی تنقیدی کتابیں تنقیدی جائزے، روایت اور بغاوت، ادب اور سماج، تنقید اور عملی تنقید اور ذوق ادب، شعور اور اعتبار نظر کے نام سے شائع ہوئیں۔ زبان کی عہد بہ عہد ترقی کو چھوڑ کر اردو ادب میں نصف 19 ویں صدی تک ایک طرح کی یکسانیت ملتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ادب کا درباری زندگی سے تعلق، امرا کی سرپرستی، جاگیردارانہ نظام میں اونچے طبقے کی زندگی اور خواہشات کا اظہار اس وقت تک یکسانیت اور یک رنگی پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ان کی کتاب 'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' 2019 کا ایڈیشن ہے جس کا پہلا ایڈیشن 1983 میں شائع ہوا تھا۔ اردو ادب کی تاریخ کے تعلق سے یہ کتاب بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔ عنوانات کی فہرست سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتاب کس قدر اہم ہے اور تشنگان ادب کو سیراب کرتی ہے۔ کتاب کے موضوعات تاریخی اشاروں کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں جس سے نہ صرف اردو ادب کے نقوش ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ تاریخ کی کڑیوں کو جوڑ کر ادب کو پرکھا جاسکتا ہے۔ عام فہم اور بامقصد ڈھنگ سے بات کہنے کا سلیقہ بھی سید احتشام حسین کا خاصہ ہے۔ کتاب میں اردو زبان اور ادب کی ابتدا سے لے کر موجودہ تناظر میں اردو ادب کو پیش کرنے کی کوشش سید احتشام حسین نے کی ہے۔ ادب کی تاریخ کے کچھ اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً اردو دکن میں، اودھ کی دنیائے شاعری، قدیم دلّی کی آخری بہار، اردو نثر فورٹ ولیم کالج اور اس کے بعد، نئے دور سے پہلے نظم اور نثر، نثر کے نئے روپ، نظم میں نئی سمتیں اور نیا شعور اور نیا نثری ادب جیسے موضوعات کی روشنی میں اردو ادب کا مختلف جہتوں سے جامع جائزہ لیا ہے۔

سید احتشام حسین نے جب اردو تنقید کی طرف رُخ کیا تو اعلیٰ درجے کی تنقید کے نمونے موجود نہ تھے۔ ترقی پسند تحریک بھی اس وقت وجود میں آچکی تھی۔ لیکن ضرورت تھی ایک ایسے نقاد کی جو ادب اور سماج کے رشتے پر گہرائی اور تسلسل کے ساتھ غور کرے۔ یہ کام آخرکار احتشام حسین نے انجام دیا۔ ایک طرف سرمایہ دار ہیں دوسری طرف غریب مزدور اور کسان۔ ان میں پہلا طبقہ ظالم ہے اور دوسرا مظلوم۔ ایسے میں ادب چپ نہیں رہ سکتا اور شاعر و ادیب غیر جانبدار نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے کہا:

اسی طرح اگر انداز بیان پر سارا زور صرف کردیا جائے۔ گویا ہیئت کا پلہ بھاری ہو تو یہ بھی عیب ہوگا۔ سید احتشام حسین عالم ہیں اور اس مسئلہ کی باریکیوں کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ اس راز سے خوب واقف ہیں کہ مواد اور ہیئت کا باہمی تعلق وہی ہے جو جان وتن کے درمیان ہوتا ہے۔ دونوں کے درمیان توازن نہ ہو تو اعلیٰ درجے کا ادب وجود میں نہیں آسکتا۔ شاعری کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ایک خیال کو جو کسی مادی تجربے پر مبنی ہو شدت احساس کے ساتھ مخصوص فنی اظہار کے ساتھ پیش کرنا شاعری کہلاتا ہے۔''

احتشام حسین کسی فن پارے کو پرکھنے کے لیے ادبی اور جمالیاتی قدروں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے بلکہ یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے اشتراکیت کو کتنا فائدہ پہنچا اور محنت کشوں کی حمایت میں جو جنگ لڑی جارہی ہے اس میں کتنی مدد ملی۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اصول تنقید کے معاملے میں احتشام حسین کا رویہ کتنا ہی سخت اور بے لچک سہی لیکن عملی تنقید میں یعنی جب وہ کسی فن پارے یا فنکار پر تنقید کرتے ہیں تو یہ شدت کسی حد تک کم ہوجاتی ہے اور افادیت کے علاوہ وہ ادب کے دوسرے پہلوؤں کو بھی نظر میں رکھتے ہیں۔ انہوں نے خالص عملی نثر کو اپنی تنقید کے لیے اپنایا اور صاف ستھری غیر مبہم زبان میں اپنی بات کہی۔ یہی وجہ ہے کہ احتشام حسین کا خیال ان کی نثر کے آئینے میں پوری طرح روشن ہوجاتا ہے۔ سید احتشام حسین ایک ہمہ صفت اور ہمہ جہت نقاد تھے۔ انھوں نے ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا جنھیں بیشتر ترقی پسند ناقدین نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ادبی خدمات کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ چنانچہ ان کی جہاں دیگر تصانیف ادبی حلقوں میں مقبول ہیں وہیں 341 صفحات پر مبنی یہ کتاب 'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' اساتذہ اور طلبا کے درمیان اردو ادب کی تنقید کے حوالے سے ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ بیشتر یونیورسٹیوں میں اس کتاب کو کورس میں شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ مختلف اداروں، پبلشروں نے اس کے کئی کئی ایڈیشن شائع کیے ہیں۔

تحقیق و تنقید

شفیق فاطمہ شعریٰ اور گلہ صفورہ

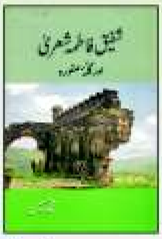

مصنف: محمد حسین

صفحات: 244، قیمت: 140 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

مبصر: امتیاز رومی

روم نمبر 231، لوہت ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

شاعری دراصل انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کا نام ہے۔ تاہم نسوانی جذبات صدیوں ان کے درون میں زندہ درگور ہوتے رہے۔ سسکتے اور بلکتے رہے۔ اظہار کے نت نئے طریقے ڈھونڈھتے رہے۔ جذبات کی شدت آنسوؤں کی نظم (موتی) بن کر عارض سیمیں پر بکھرتے رہے۔ چناں چہ انھوں نے فرضی نام سے اظہار جذبات کے لیے شاعری کا راستہ اختیار کرلیا۔ اردو کی اولین شاعرہ کے سلسلے میں کئی نام ہیں مثلاً لطف النسا امتیاز، مہ لقا بائی چندا اور زیب النسا بیگم مخفی۔ بہر حال ان کے علاوہ اس عہد میں دیگر شاعرات کے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو نسوانی راگ و رنگ دیا۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اردو شاعری اس وقت تک نابالغ تھی جب تک خاتون کے نرم و گداز احساس سے مس نہ ہوئی تھی۔ ان شاعرات کی بدولت اردو شاعری نسوانی جذبات کو چھو کر گل گلزار ہوگئی اور اس کے وجود کی تکمیل ہوگئی۔

بیسویں صدی کے افق پر اردو شاعری کا نسوانی راگ اپنی مدھرتا بکھیرنے لگا اور اس کے نرم و گداز الفاظ نازک لبوں سے نکل کر فضا میں تحلیل ہوکر نغمگی بکھیرنے لگے۔ اس عہد کے تمام موضوعات کو نسوانی حس سے حظ ملا۔ مگر اس کے باوجود تذکرہ نویسوں نے انھیں غیر محرم سمجھ کر پردہ نشیں رہنے دیا اور سیکڑوں صفحات کے ضخیم تذکروں میں ان کا نام تک نہ لیا۔ شاید اس وقت تک ان کی شاعری اس معیار تک نہ پہنچی ہو۔ بہرحال سب سے پہلے غلام ہمدانی مصحفی نے 'تذکرہ ہندی میں' اور پھر مصطفیٰ خاں شیفتہ نے 'گلشن بے خار' میں شاعرات کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ شاعرات کی تعداد میں خوب اضافہ ہوا اور معیار بھی کافی بلند ہوا۔ تاریخ و تفصیل سے قطع نظر سر دست محمد حسین کی تحقیقی کتاب 'شفیق فاطمہ شعریٰ اور گلہ صفورہ' پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

یوں تو شفیق فاطمہ شعریٰ پر اس کے علاوہ بھی تحقیقی مقالے / مضامین لکھے گئے تاہم ان کے استناد و استشہاد میں قدرے ضعف ہے۔ کئی مقام پر تواریخ و حقائق میں اختلاف اور ٹکراؤ ہے۔ ان سب کا موازنہ و مقابلہ کرکے محمد حسین نے استناد بخشا اور شعریٰ کی حیات و شعریات کی بازیافت کی۔ مقدمے میں مختصر طور پر خواتین شاعرات، ان کی شاعری اور موضوعات پر سیر حاصل خامہ فرسائی کی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو: ''ان شاعرات نے عورتوں کے مختلف مسائل کی نشان دہی کی ہے۔ جیسے عورت کا ذہنی و جسمانی استحصال، ماں کی ممتا، ماں بننے کی چاہت و احساس، لڑکی کے مجروح جذبات، سماجی اور خاندانی جبر، احساس تنہائی، سسکتی روح، ناکردہ گناہوں کا مجرم گردانا جانا وغیرہ پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ شاعرات کی شاعری میں ان مسائل کے حل کے مطالبے کا بھی جذبہ نظر آتا ہے۔'' (19)

شفیق فاطمہ شعریٰ کا تعلق ولی اورنگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی کی سرزمین سے ہے۔ انھوں نے 'فصیل اورنگ آباد' سے اجنتا اور ایلورا کی گپھاؤں / آثار قدیمہ کو نہ صرف دیکھا بلکہ صدیوں پرانی تہذیب و ثقافت میں خود کو تلاش کیا۔ شعریٰ نے مستقبل کی تعمیر کے لیے عظمت رفتہ کی بازیافت کو اہمیت دی نہ کہ محض 'خوابوں کی انجمن' سجانے کی تلقین کی۔ انھوں نے عورتوں کو 'قوی ہیکل پہاڑوں نازنین تن رہگزاروں سے بہت آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ شفیق فاطمہ شعریٰ خواتین شاعرات میں سب سے منفرد اور یگانہ مقام رکھتی ہیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، دینیات اور تاریخ سے گہری واقفیت ان کی تبحر علمی کا غماز ہے۔ بنا استاذ کے خود سے پورا قرآن حفظ کرلینا ان کی خداداد صلاحیت اور ذہانت کا پتا دیتا ہے۔ محمد حسین نے اس کتاب میں ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو نہایت تحقیقی انداز میں واضح کیا ہے۔ 'شعریٰ کی حیات اور شعری کائنات، وہ جو شاعری کا سبب ہوا، شعریٰ کی عروض شناسی، تخلیقی شعور، تخلیقی اضطرار اور تحریکات و رجحانات کے عنوان سے مصنف نے ان پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

محمد حسین نئی نسل کے محقق نقاد اور صحافی ہیں۔ ان کی تحریریں مختلف اخبارات و رسائل کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ زبان و بیان پر دسترس رکھتے ہیں۔ نسائی ادب ان کا تحقیقی میدان ہے۔ تانیثیت پر ان کی مضبوط گرفت ہے۔ بنیادی طور پر محمد حسین نے شفیق فاطمہ شعریٰ کا مطالعہ 'گلہ صفورہ' کے حوالے سے کیا ہے تاہم اس کے ضمن میں ان کی حیات اور شعری کائنات کی مکمل تصویر کشی کردی ہے۔ چونکہ شعریٰ کی شاعری فلسفیانہ خیالات، اساطیری ودیومالائی نظریات، تلمیحات و استعارات اور تاریخی واقعات سے پر ہے اس لیے اس کی تفہیم و تعبیر کے لیے تاریخی شعور سے آگہی ناگزیر ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں: 'ہماری شاعری میں تجربے کی ایسی پیچیدگی نہیں جیسی کئی شاعروں کے ہاں آپ کو ملے گی۔ رہی تاریخی اور تہذیبی شعور کی بات تو میرے خیال میں تاریخی اور تہذیبی شعور سے قاری کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔' شعریٰ میں جس قدر تخلیقی اضطرار تھا اس کتاب کے مصنف محمد حسین میں اسی قدر تحقیقی و تنقیدی افکار ہیں جن کی بدولت شعریٰ کی شخصیت اور شاعری کے اسرار و رموز ان پر منکشف ہوئے اور انھوں نے صفحۂ قرطاس کے حوالے کردیا۔

عورتوں کو ایک زمانے تک نظر انداز کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ردعمل کی نفسیات جاگزیں ہوگئی اور تانیثیت / فیمینزم کی شکل میں ایک رجحان کا وجود عمل میں آگیا اور شاعرات نے اس کی ترسیل کو ہی اپنی شاعری کا محور بنا دیا تاہم شعریٰ نے یہاں پر اپنی انفرادیت کا ثبوت پیش کیا اور کسی بھی ازم سے اپنے فن کو علاحدہ رکھا۔ حالاں کہ انھیں کئی تحریکات و رجحانات کا سامنا ہوا مگر اس کے باوجود انھوں نے کسی کا اثر قبول نہیں کیا۔ البتہ عورت ہونے کے ناطے ان کے یہاں تانیثی حسیت اور نسوانی مسائل ضرور پائے جاتے ہیں۔ تاہم وہ ردعمل کی نفسیات میں مرد بیزار نہیں ہیں۔ غرض کہ شاعرات کے کینوس پر شفیق فاطمہ شعریٰ کا جو حسین نقش محمد حسین نے ابھارا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ 'شفیق فاطمہ شعریٰ اور گلہ صفورہ' ان کا اہم تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ہے۔ امید ہے ان کی یہ تحقیقی کاوش شعریٰ کے باب میں مستند اور دستاویزی ثابت ہوگی۔

تقریظ و تنقید

مصنف وناشر: ڈاکٹر حاذق فرید

صفحات: 152، قیمت: 103 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: خالد علوی، محمد زئی، نزد مسجد چونے والی

شاہجہاں پور، 242001 (یوپی)

'تقریظ وتنقید' ڈاکٹر حاذق فرید کی اطلاع کے مطابق ان کی پانچویں تصنیف ہے۔ 'تقریظ وتنقید' عنوان دیکھ کر قاری کے ذہن میں یہ خیال ضرور آئے گا کہ یہ کتاب تقریظ و تنقید کے اصول وقواعد و دیگر متعلقات کے بارے میں ہوگی مگر ایسا نہیں ہے۔ زیر نظر کتاب میں 10 مضامین شامل ہیں اور مصنف کا بیان ہے کہ ان میں کچھ مضامین تقریظی اور کچھ تنقیدی ہیں۔

تقریظ وتنقید یک موضوعاتی کتاب نہیں ہے۔اس میں ناول، افسانہ، شاعری و دیگر موضوعات سے تعلق رکھنے والے مضامین شامل ہیں۔ان تمام اصناف کو ایک کتاب میں جمع کر دینا اور پھر ان پر تبصرہ کی خواہش رکھنا ایک طرح سے تبصرہ نگار کو دشواری میں ڈال دینے کے مترادف ہے۔

ناول کے ضمن میں احمد صغیر کا ناول 'دروازہ ابھی بند ہے'، 'پریم چند کے اردو ناول' کے عنوانات سے مضامین شامل کیے ہیں۔افسانے کی صنف میں 'بیدی اور لاجونتی'، 'خواجہ احمد عباس اور ابابیل' و'پریم چند کے دیہی افسانوں کی نشان دہی' کے عنوانات سے مضامین کتاب میں موجود ہیں۔ایک مضمون 'سر سید احمد خاں: ایک مطالعہ'، 'مسدس حالی ایک مطالعہ' اور اقبال کا فلسفۂ خودی' کے عنوانات سے مضامین اس کتاب میں ہیں۔دو مضمون وکیل اختر کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ہیں۔

'دروازہ ابھی بند ہے' احمد صغیر کا مشہور ناول ہے جو گجرات کے فساد کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ڈاکٹر حاذق فرید نے اس ناول کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔فساد کی تباہ کاریوں وہولناکیوں پر اظہار خیال کیا ہے کس طرح غیر مسلم مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں۔دونوں طبقات ایک دوسرے کے خلاف منظم طریقہ پر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔نوجوانوں کے ذہن ودل میں تعصب کا زہر بھرا جا رہا ہے۔پولیس کی زیادتیوں اور اس کے وحشیانہ رویہ کا ڈاکٹر حاذق نے کامیابی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔اگر پورا ناول نہ بھی پڑھا جائے تو بھی ڈاکٹر موصوف کی تحریر قاری کو ناول کے بارے میں مکمل آگاہی دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔دوسرے الفاظ میں ڈاکٹر موصوف کا یہ تجزیاتی مطالعہ ناول کی تلخیص ہے۔

'مسدس حالی: ایک مطالعہ' جو بھی ادب سے وابستہ ہے یا ادب سے شغف رکھتا ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ مسدس حالی (مد وجزر اسلام) مسلمانوں کے عروج وزوال کا تذکرہ ہے اور یہ نظم (مسدس) دیوان حالی سے علیحدہ کر کے شائع کر دی گئی ہے اور یہ نظم مسلمانوں کی معاشرتی، معاشی، تعلیمی، اخلاقی اور اقتصادی زوال و پسماندگی کا دردمندانہ اظہار ہے اور نہایت پُر اثر اظہار جسے ہر صاحب دل پڑھ کر آبدیدہ ہو سکتا ہے۔یہ مضمون برائے مضمون سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔اسے تنقیدی تو نہیں ہاں کسی حد تک تقریظی کہا جا سکتا ہے۔

'بیدی اور لاجونتی' ملک کے بٹوارے میں ایک مغویہ عورت لاجونتی (لاجو) جو ایثار و قربانی اور محبت کا پیکر ہے، کی کہانی ہے جو سندر لال کی بیوی تھی فساد میں اغوا کر لی جاتی ہے اور جسے بہ وجہ مجبوری دوسرے مرد کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔اچانک لاجونتی واپس آجاتی ہے اور سندر لال سے ملاقات ہوجاتی ہے۔لاجونتی کے دل میں اندیشے وسوسے اور جھجک ہے۔گو کہ سندر لال کا رویہ اس کے تئیں محبت بھرا نہیں تھا۔مار کھانا گالی گلوج روز کا معمول تھا اور ایک طرح سے اس کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا اس کے باوجود وہ سندر لال کے پہلو سے لگ جاتی ہے۔سندر لال بھی باوجود اندیشوں کے اور جھجک کے اسے قبول کر لیتا ہے۔

اسی طرح خواجہ احمد عباس کا افسانہ ابابیل بھی ایک جابر و قاہر شخص کی کہانی ہے مگر اس کے سینے میں بھی دھڑکتا ہوا دل ہے اور وہ چار ابابیلوں کو اپنے گھر میں جگہ دیتا ہے، ان سے محبت کا اظہار کرتا ہے اور جب اس کا آخری وقت آتا ہے تو ابابیلیں اس کے پلنگ پر بیٹھی ہوئی ماتم کناں ہوتی ہیں۔

ان دونوں افسانوں پر ڈاکٹر حاذق فرید نے نہایت عمدہ اظہار خیال کیا ہے اور دونوں افسانوں کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ بے حد کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔

سر سید احمد خاں پر تحریر کردہ مضمون میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ان کی شخصیت اور ایک چھوٹے سے اسکول کو یونی ورسٹی بنا دینے تک کی تگ وتاز سے سب واقف ہیں۔

ایک مضمون اقبال کے فلسفۂ خودی کے نام سے کتاب میں شامل ہے۔اقبال کی شخصیت وان کے کارناموں پر اور ان کے کلام کے مخفی گوشوں پر اپنے اپنے انداز میں ہر دور میں اظہار کیا جاتا رہا ہے اور آئندہ بھی کیا جاتا رہے گا۔بہر کیف ڈاکٹر حاذق فرید نے اپنے طور پر اقبال کے فلسفۂ خودی کو سمجھنے اور اپنے ہی انداز میں اسے قاری کو سمجھانے کی کوشش کی ہے جسے لائق تحسین کہا جانا چاہیے۔

'پریم چند کے اردو ناول' اور 'پریم چند کے دیہی افسانوں کی نشان دہی' زیر تبصرہ کتاب میں موجود ہیں۔بلا شبہ یہ دونوں مضامین نہایت معلوماتی، مفید اور کارآمد ہیں۔دو مضامین وکیل اختر پر موسوم بہ 'وکیل اختر اور ان کی شاعری' و'وکیل اختر بہ حیثیت غزل گو' تقریظ وتنقید میں شامل کیے گئے ہیں۔دونوں مضامین توصیفی ہیں۔دونوں مضامین پڑھ کر یہ سوال میرے ذہن میں کروٹیں لینے لگا کہ جب 'وکیل اختر اور ان کی شاعری' کے عنوان سے مضمون موجود تھا تو پھر علیحدہ سے 'وکیل اختر بہ حیثیت غزل گو' کے عنوان سے مضمون شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔وکیل اختر کی شاعری پر اظہار خیال اور زیادہ گہرائی کا مطالبہ کرتا تھا کیونکہ وکیل اختر نے جس معیار و مرتبے کی شاعری کی ہے ان دونوں مضامین میں اظہار خیال تشنہ معلوم ہوتا ہے۔

زیادہ تر مضامین تقریظی حیثیت کے حامل ہیں اس حقیقت کا اعتراف صاحب کتاب نے بھی کیا ہے لیکن کہیں کہیں تنقید کا پہلو ضرور نظر آتا ہے۔ڈاکٹر موصوف نے اپنے مضامین میں تحقیقی مواد کو بنیاد بنانے کی کوشش کی ہے اس لحاظ سے جن مضامین میں تنقید کا وجود ہے بھی تو وہ نیم تنقیدی ہے۔

ایک بات جس کی طرف توجہ مبذول کرانا میں اپنا خوشگوار فریضہ خیال کرتا ہوں وہ یہ کہ اکثر مضامین کو رفتار دینے کے لیے اقتباس کا بہت زیادہ سہارا لیا گیا ہے یا دیگر مصنفین کی آراء کی بیساکھیوں کے ذریعہ آگے بڑھایا گیا ہے۔یہ عمل ایک حد تک تو گوارہ کیا جا سکتا ہے مگر اس عمل میں زیادتی اعتراض میں بدل جایا کرتی ہے جس سے مضمون میں غیر ضروری طوالت کا سقم بھی پیدا ہوتا ہے اور قاری کے وقت کا زیاں بھی۔

'تقریظ وتنقید' میں شامل مضامین تازہ واردان بساط ادب کے لیے ابتدائی آگاہی کا سبب تو ہو سکتے ہیں مگر ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے ان میں اتنی قوت وطاقت نہیں ہے جتنی ہونا چاہیے تھی۔لیکن ڈاکٹر حاذق فرید کی محنت، عرق ریزی اور جگر کاوی ان کی تحریروں میں صاف دکھائی دیتی ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کی داد دینا چاہیے جس کے ڈاکٹر حاذق فرید بجا طور پر مستحق ہیں۔

انعکاس قلم

مصنف: ڈاکٹر انوار الحسن وسطوی

قیمت: 250، صفحات: 248، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر غلام اشرف قادری، صدر شعبۂ فارسی، جی ایف کالج، شاہجہاں پور

دریائے گنگا کے اتر میں واقع اضلاع خصوصاً ویشالی اور مظفر پور اردو وفارسی زبان وادبیات کے لیے ہمیشہ زرخیز رہے ہیں۔ بڑے بڑے شعراء، ادبا، حکما و مفکرین اس سرزمین میں پیدا ہوئے اور اپنی صلاحیتوں کو اوراق وحروف کے حوالے کیا آج بھی یہ سلسلہ بڑی آب وتاب کے ساتھ جاری وساری ہے۔دیرینہ گرانقدر سرمائے بھی موجود ومحفوظ ہیں۔اب عہد حاضر کے نویسندگان کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ان سرمایوں کو کتاب کی شکل میں یا ان پر مضامین لکھ کر عوام تک پہنچائیں۔ان کی افادیت سے لوگوں کو روشناس کرائیں۔اسی کی ایک کڑی ڈاکٹر انوار الحسن وسطوی کا مجموعہ ''انعکاس قلم'' ہے۔ موصوف لائق صد احترام ہیں کہ اس طرح کے کئی مجموعہ جات وقفے وقفے کے ساتھ پیش

کرتے آئے ہیں۔ ڈاکٹر انوارالحسن وسطوی گاگر میں ساگر بھرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ سمندر کو اس فن کے ساتھ بھرتے ہیں کہ اس کی سالمیت کا وجود مجروح نہ ہو اور اس کا فطری تلاطم انسانی وجود کو جھنجھوڑتا بھی رہے۔ حق تو یہ ہے کہ اپنے نوکِ قلم کا طلسم دکھانے میں وہ ہمیشہ کامیاب ہوئے ہیں شاید اسی لیے اپنے سارے مجموعہ جات کے ناموں کے ساتھ 'قلم' کو شامل اسمائے کتاب رکھا ہے۔ غرض اسی فکر سے اس مجموعہ کا نام بھی 'انعکاس قلم' رکھا ہوگا۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے ذریعہ 2019 میں مطبوعہ 248 صفحات پر مبنی مجموعہ 'انعکاس قلم' میں 'ذکر قائماں' کے عنوان سے نو شخصیات جو باحیات ہیں اور 'یادِ رفتگان' کے عنوان کے تحت پانچ شخصیات جو اس دار فانی سے کوچ کر چکی ہیں، پر تحقیقی وتنقیدی مضامین ہیں۔ اردو کی موجودہ صورت حال پر تین مضامین اور اس کے بعد تیرہ تبصرے ہیں۔ اصل مسودے سے پہلے مصنف کتاب نے دو صفحات پر مشتمل اپنی بات 'حرف آغاز' کے عنوان سے لکھا ہے۔ بعدازاں پروفیسر طارق احمد صدیقی اور پروفیسر رضیہ تبسم دونوں کی آرا 'انعکاس قلم' سے متعلق شامل ہیں۔

'ذکر قائماں' میں اول نمبر پر معروف شاعر، ناقد اور ماہر اقبالیات پروفیسر نجم الہدیٰ پر مفصل مضمون لکھا گیا ہے پروفیسر علیم اللہ حالی جو ایک مشہور صحافی اور گیارہ تصانیف کے مالک ہیں، کو دوسرے نمبر پر لائے ہیں۔ دربھنگہ کی منظوم تاریخ لکھنے والے عبدالمنان طرزی جیسی ازیں قبیل نو شخصیات کے احوال وکوائف اور رنگ قلم کو صفحات پر جگہ دی ہے۔ مفتی ثناء اللہ قاسمی، سید محمد اشرف، ڈاکٹر ایم اعجاز علی، ڈاکٹر ریحان غنی، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، اور منصور خوشتر جیسی نوادرات اردو پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ 'یادِ رفتگاں' کے زمرے میں سطحی علمی شخصیات کو جگہ دی ہو۔ اس حصہ میں بہار کے معروف ادبا، شعرا و ناقدین کو زیرِ بحث لائے ہیں جن کے فکر وفن کا اردو شعر وادب ہمیشہ احسان مند رہے گا۔ ڈاکٹر خلیق انجم، سید عبدالرافع، سید محمد اجمل فرید، پروفیسر ثوبان فاروقی، ڈاکٹر ناصر رضا خاں، یہ سبھی اردو کے لیجنڈ ہیں اور ان پر مفصل مضامین زینت کتاب کی ہیں۔

مسائل اردو کے عنوان سے تین مضامین کتاب میں شامل ہیں۔ 'اردو تحریک عالمی نظر میں' یہ ایک تحقیقی وتجزیاتی مضمون ہے 'بہار میں اردو صحافت: ماضی وحال کے آئینہ میں' مصنف کتاب کی تحقیقی صلاحیت کا بہترین نمونہ ہے۔ تیسرا مضمون 'مرنہ جائے زباں دیکھتے دیکھتے' جس میں اردو کی زبوں حالی کا چرچا تنقیدی لہجے میں اور اہل علم وقلم حضرات سے بچائے زبان وادبیات کی اپیل کی گئی ہے۔ بہرکیف یہ تینوں مضامین میں اردو زبان وادبیات کی موجودہ صورت حال، پستی وتنزلی کی کہانی کے ساتھ اس کی ترویج واشاعت کے لیے مناسب لائحہ عمل تیار کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

کتاب میں مشمولہ 13 تبصروں والا حصہ دراصل بہار کے اہل فکر ونظر کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ ان کی افادیت سے کسے انکار ہے مگر جن مضامین کو تبصرے کے علاوہ کتاب میں جگہ دی ہے وہ مصنف کی علمی وفنی گرفت کا مظہر ہیں۔ تمام مضامین بہار کے جید علم پرور، شاعر وادیب، ناقد ومحقق، مصلح قوم وملت، معمار تہذیب قلبی وروحانی پر مبنی ہیں۔ اردو کے حوالے سے یہ تمام مضامین بہار کی ادبی وفنی فضا کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

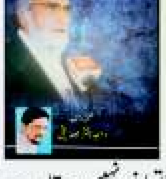

نشانات سہروردی

حمید سہروردی: فرد اور فن، تحقیق وترتیب: واجد اختر صدیقی
صفحات: 280، قیمت: 300 روپے، اشاعت: 2018
ناشر: ایپلائڈ بکس، 1739/10، دریا گنج، نئی دہلی 110002
مبصر: شیخ عبدالرحیم (غلام ثاقب)، قاضی نگر، جالنہ روڈ، بیڑ 431122

حمید سہروردی کی شخصیت اور فن، دونوں دنیائے اُردو ادب میں محتاج تعارف نہیں۔ ستارے جگمگاتے ہیں روشنی محدود نہیں رہتی۔ وہ اپنا سفر طے کرکے رہتی ہے۔ حمید سہروردی کا ادب، نصف صدی کے حقائق کے عکسِ آئینہ داری کو علامتوں کی زبان عطا کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں اَچھوتا پن ہے۔ ان کے افسانے، منظومات اور افسانچے انسانی نفسیات، ماحول اور سماج کی تجریدی تصویروں کا حسین وپرکشش البم ہیں، جس کے ہر پنے پر زندگی کے احساسات کے خطوط اور منقش اُبھار موجود ہیں۔ ان کی شخصیت اور خدمات وفن پر تاحال بے شمار تحقیقی مقالے، شمارے، گوشے اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا فن اُن کی پہچان ہے۔ اور نشاناتِ سہروردی میں اسی پہچان کو مختلف زاویوں سے تھری ڈی انداز میں پیش کیا گیا ہے تاکہ نیا قاری انھیں ذرا قریب سے دیکھے اور محسوس کر سکے۔ حمید سہروردی جہاں رہے وہیں ایک انجمن اور ایک جامعہ بن کر ادب کی خدمت کی۔ نئی نسل کی آبیاری میں حمید سہروردی کا کردار ایک مشفق ومربی استاد کے بطور رہا ہے۔

کتاب حمید سہروردی سے واجد اختر صدیقی کی حسن عقیدت کی خوبصورت تصویر پیش کرتی ہے۔ کتاب میں شخصیت پرستی سے اعراض کیا گیا ہے اور مرتب نے اپنے مزاج کو عادلانہ اور منصفانہ رکھا ہے۔ اسی لیے مضامین میں توازن برقرار رہتا ہے۔

مرتب کتاب واجد اختر صدیقی، نئی نسل کے پُر جوش محقق وتبصرہ نگار ہیں۔ کرناٹک اور دکن کے اُردو ادب میں ابھرتی ہوئی حیثیت کے حامل ہیں۔ تعلیم احتساب وتوازن (تعلیمی مضامین، 2003)، آفاق (ضلع گلبرگہ کے نامور قلمکاروں کا انتخاب، ڈاکٹر وحید انجم کی شراکت سے 2005) اور زیرِ تبصرہ کتاب نشاناتِ سہروردی (حمید سہروردی: فرد اور فن 2018) اب تک تین عدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ واجد اختر صدیقی یوں تو ایک معلم ہیں اور پیشۂ درس وتدریس سے وابستہ ہیں لیکن ان کی علمی پیاس کی تسکین تحقیقی وتجزیاتی ادب کی تحریریں لکھنے میں پوشیدہ ہے۔ گلبرگہ، کرناٹک اور پھر دکن کے ادبی حلقوں میں شناسائی حاصل کر چکے ہیں۔ انھوں نے نشاناتِ سہروردی کے حوالے سے نامور جدید علامتی افسانہ نگار پروفیسر حمید سہروردی کی شخصیت اور فن پر ملک کے نامی گرامی ادبا اور ناقدین کے ادب پاروں کو بڑی حسن وخوبی اور اہتمام کے ساتھ کتابی شکل دی ہے۔

'نشاناتِ سہروردی' مختلف حوالہ جات سے اخذ کی ہوئی ایک شخصیت کی مکمل جھلک اور حمید سہروردی کی ادبی خدمات کا ایک جھروکہ پیش کرتی ہے۔ اس کتاب میں ہندوستانی ادب کے شمال وجنوب اور شرق وغرب سے ادبا وناقدین کے تبصرے اور آرا شامل ہیں جس سے یہ کتاب ایک عالمگیر حیثیت کی حامل ہوگئی ہے۔ حوالہ جاتی سطح پر یہ کتاب ایک مستند حیثیت کی حامل بن گئی ہے۔ اس کتاب میں پانچ منظوم اور 8/شخصی تبصروں کے علاوہ دو انٹرویو، 16/مضامین، 4/خطوط، اور دیگر بہت سارے قابل قدر افسانے، تجزیے اور تبصرے شامل ہیں۔ نئی نسل کے فنکار واجد اختر صدیقی کی یہ کتاب نئی نسل کے قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہی ہے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے اپنی کتاب کو ہر پہلو سے نوجوان قلمکاروں اور فنکاروں کی تحریروں سے مزین کیا ہے اور نئی نسل کے اہم اہم قلمکاروں کو اپنی اس کتاب میں جگہ دی ہے۔ اس کتاب کا پس ورق نوجوان مصور شاہد پاشاہ نے تخلیق کیا ہے۔ نشاناتِ سہروردی کے دیگر اہم مشمولات میں فیاض رفعت اور خالد جاوید کے مضامین بالکل نئے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اور قارئین کے ذہن پر بھرپور طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

کتاب کے مشمولات میں 'نواب مرزا' (افسانہ) حمید سہروردی کا تازہ ترین مخاطبہ ہے۔ اس افسانے پر نئے پرانے فنکاروں نے بڑی کشادہ ذہنی کے ساتھ تبصرہ رقم کرایا ہے۔ یہ افسانہ حمید سہروردی کے قلم اور شخصیت سے نکل کر سیدھے قاری کی زندگی اور اس کے احساسات سے جڑ جاتا ہے۔ 'نواب مرزا' نے قریب قریب ملک کے تمام ہی

اہم ادبی اذہان تک رسائی حاصل کی ہے یہ افسانہ نگاری کی کامیابی پر دلیل پیش کرتا ہے۔

کتاب کا افتتاحیہ پروفیسر شاہ حسین نہری کے قطعۂ تاریخ، ڈاکٹر عاصم شاہ نواز شبلی کی رباعی (توقیر ہنر)، ڈاکٹر سلیم محی الدین کی آزاد نظم، ڈاکٹر مقبول احمد مقبول اور اختر صادق کی پر اثر نظموں سے ہوتا ہے۔ اور اختتام مرتب کے اظہار تشکر پر منحصر ہے۔

قاری کو 'نشاناتِ سہروردی' میں نہ صرف یہ کہ مختلف النوع تبصروں، تجزیوں اور نقد ونظر سے پُر مضامین کے ذریعہ حمید سہروردی کی شخصیت کو الگ الگ زاویوں سے جاننے اور پہچاننے کا موقع ملتا ہے بلکہ اس ایک کتاب میں حمید سہروردی کی نظمیں، افسانچے اور اہم افسانوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ان اہم ترین افسانوں میں امیر بخش کون؟، بے اعتنائی، خواب در خواب، کرسی میں دھنسا ہوا آدمی، سمندر، ان افسانوں کے علاوہ اور ان پر مشاہیرِ ادب کے تجزیے شامل ہیں۔ حمید سہروردی کے دیگر مشہور افسانوں میں نواب مرزا، دشتِ ہو کی صدائیں، منظروں کی ڈوبتی ابھرتی کہانی، گپھائیں، کہانی در کہانی، روشن لمحوں کی سوغات، عقب کا دروازہ، سفید پرندے، سفید کوا جیسے شہرت گیر و مقبول افسانوں پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا اشاریہ کہ حمید سہروردی، نئے میلانات، نئے اظہاریے اور نئے اسلوب کے افسانہ نگار ہیں، نشاناتِ سہروردی کی شکل میں حقیقت بن کر سامنے آیا ہے۔ نشاناتِ سہروردی ادب کے ہر طالب علم کے لیے اہم سوغات ہے اور خاصانِ ادب کے لیے مطالعہ کی میز کی زینت بھی۔

مناظر عاشق ہرگانوی کی نعت گوئی میں ندرت فن

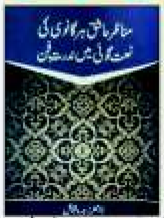

مرتبہ: ڈاکٹر زہرہ شمائل

صفحات: 192، قیمت: 250 روپے

ناشر: اردو ادبی سرکل، محلہ گنگوارہ،

پوسٹ سارا موہن پور، ضلع دربھنگہ 7 (بہار)

مبصر: حلیم صابر، کولکاتا

عربی اور فارسی ادب میں سرور کائنات نبی کریم کی مدح سرائی کی شکل میں نعت گوئی کا سلسلہ چودہ سو سال سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ بڑے بڑے شعرا نے بذریعہ نعت گوئی حضور پاکؐ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ اردو میں بھی اس کی مستحکم روایت ملتی ہے۔ عہد حاضر کے نعت گو شعرا کا اگر شمار کیا جائے تو ان میں ایک نام بلند پایہ ناقد، محقق، صحافی اور شاعر پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا سرفہرست نظر آئے گا' جنھوں نے نعت گوئی میں ندرتِ فن کا نمونہ پیش کر کے اپنے نام کی مناسبت سے عاشقانِ رسولؐ میں اپنا نام درج کرا لیا ہے اور انھوں نے اپنا نعتیہ مجموعہ 'ہر سانس محمدؐ پڑھتی ہے' پیش کرنے کا شرف بھی حاصل کیا۔

مناظر عاشق ہرگانوی کے نعتیہ مجموعے کا مطالعہ کرنے کے بعد 25 مشاہیر ادب نے ان کی نعت کے تعلق سے مضامین لکھے اور ان کی نعت گوئی سے متعلق ندرتِ خیال کو اجاگر کیا۔ علاوہ ازیں نصف درجن اہل قلم نے منظوم تاثرات قلم بند کیے۔ مذکورہ تمام منثورات و منظومات متفرق اخبارات و رسائل میں بکھری پڑی تھیں جنھیں ڈاکٹر زہرہ شمائل نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد نقل و جمع کر کے تقریباً 23 صفحات پر مشتمل پر مغز مقدمہ 'پہلی بات' سپرد قرطاس کیا ہے اور مضامین کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے قلم کاروں کی آراء کا بھی حوالہ دیا ہے۔

پہلا مضمون ڈاکٹر جمیلہ عرشی کا بعنوان 'مناظر عاشق ہرگانوی اور ثنائے خداوندی' ہے، جس میں انھوں نے شاعر کی جدت طرازی ہمہ از اوست صوفی مسلک کے عقیدے کو پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی نے 'مداحِ خدا اور رسولؐ' کے حوالے سے ہرگانوی صاحب کی حمد و نعت گوئی پر خامہ فرسائی کی ہے۔

نذیر فتح پوری نے مناظر عاشق ہرگانوی کے حج کے دوران کا واقعہ گفتگو کے انداز میں پیش کیا ہے۔ جناب علیم صبا نویدی نے اردو نعت گوئی کا تذکرہ تاریخ کے حوالے سے کیا ہے، جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

سعید رحمانی نے لکھا ہے کہ ''مناظر کے بعض نعتیہ اشعار کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے روضۂ اقدس کے ایک گوشے میں بیٹھ کر یہ اشعار تحریر کیے ہیں جن میں حضور اکرمؐ کی بے پناہ محبت اور بیکراں عقیدت کی خوشبو ہر لفظ سے عکس ریز ہے۔......'' پروفیسر محفوظ الحسن اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ: ''مناظر کی ان نعتوں میں جذبات کی تپش ہے، احساسات کا مرتعش سمندر ہے اور اخلاص کا بیکراں دریا ہے۔ ان میں عقیدت کی شیرینی اور محبت کی مٹھاس ہے۔''

ڈاکٹر سراج احمد قادری اس نعتیہ مجموعہ کے تعلق سے کہتے ہیں کہ ان (مناظر عاشق ہرگانوی) کی نعت گوئی نہایت ہی سادہ، سہل، سلیس، دلکش و دلفریبیوں کا مجموعہ ہے۔'' ڈاکٹر امام اعظم کہتے ہیں: ''ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی نعتوں میں تازگی ہے، دلدوزی ہے اور جاگتے ہوئے احساس کی چبھن ہے جس سے قاری کا دل بھر آتا ہے۔ کبھی آنکھیں چھلک پڑتی ہیں۔ کبھی دیدہ و دل سرشار ہو اٹھتے ہیں اور ایمان کی حرارت بڑھتی ہے۔......''

محمد متین ندوی لکھتے ہیں: ''مناظر عاشق کی ادبی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے جس کا مشاہدہ ان کی نعتوں میں کیا جا سکتا ہے......'' شارق عدیل کی نظر میں رسول کریمؐ کے شوق و جوش میں تخلیق کی گئی نعتیں اپنے اندر محبت و صداقت کا ایک بحرِ بیکراں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ایم۔ نصر اللہ نصر نے مناظر عاشق کی نعتوں کی تحسین کی ہے: ''انھوں نے نظمیہ انداز میں بھی نعت گوئی کی ہے جو واقعی قابلِ رشک ہے۔'' ڈاکٹر ایم۔ صلاح الدین کا ماننا ہے کہ ''مناظر عاشق کی شعری کائنات میں نعتوں کی کہکشاں محدود نظر آتی ہے۔ پھر بھی ان میں جو اسلوبیاتی و موضوعاتی تنوع ہے، جذب و کیف کی فراوانی ہے اور فکر و فن کی تازگی ہے وہ دیدنی ہے۔......''

شاہد اقبال نے ''مناظر عاشق ہرگانوی اور اردو میں نعت گوئی کی روایت'' کے عنوان سے بصیرت افروز مضمون قلم بند کیا ہے جس سے معلومات کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ ہمدم نعمانی کا بیان ہے کہ ''......جو جذبہ نعت کو معراج عطا کرتا ہے اور اسے اعلیٰ و ارفع بناتا ہے وہ سرشاریِ عشق، عقیدت اور محبت اور انکساری کا فلسفہ ہے جس کے ذریعہ ممدوح کا حق ادا ہوتا ہے۔ اس عمل سے مناظر عاشق ایک عاشقِ صادق کی طرح کشاں کشاں گزرتے ہیں۔''

علاوہ ازیں کتاب کے اخیر میں عبدالاحد ساز، ارشد مینا نگری، حیدر وارثی، ڈاکٹر فرحت جہاں، اسما پروین اور حکیم شاہد حسن قاسمی تابش نے منظوم تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ اس کتاب کی مرتبہ ڈاکٹر زہرہ شمائل لکھتی ہیں کہ ''مناظر عاشق ہرگانوی کی نعت کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اظہار میں غلو اور لفاظی سے کام نہیں لیتے ہیں۔ وہ نعت کے لیے غزلیہ انداز ضرور اپناتے ہیں لیکن رکیک تشبیہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ بلکہ نبی اکرمؐ پر، ان کی رفعت پر، ان کی بزرگی و برتری پر اور عظمت و شفاعت پر نعت کہتے وقت شریعت کی پاسداری کرتے ہیں۔''

داؤد حسن (زبانِ خلق کے آئینے میں)

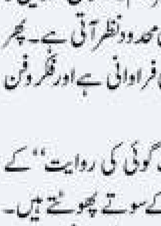

مرتب: ڈاکٹر عارف حسن وسطوی

صفحات: 176، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: ابراہیم افسر، وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا، نگر پنچایت سیوال خاص ضلع میرٹھ- 250501 (یوپی)

زیر تبصرہ کتاب 'داؤد حسن، زبانِ خلق کے آئینے میں' ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کی

مرتب کردہ ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں اپنے دادا مرحوم داؤد حسن وسطوی کی 26 فروری 2018 میں وفات کے بعد ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر تحریر کیے گئے مضامین کو یکجا کیا ہے۔ عارف حسن کے دادا داؤد حسن کا آبائی وطن موضع حسن پور وسطی، تھانہ مہوا، ضلع ویشالی تھا۔ ان کہ سنہ پیدائش 1932 اور تعلیم مڈل اسکول تھی۔ داؤد حسن نے مہوا رجسٹری آفس میں 1948 میں وثیقہ نویسی کا آغاز کیا۔ 1949 میں رجسٹری آفس میں کلرک کے عہدے پر فائض رہے لیکن بعض وجوہات کی بنا پر 1956 میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر دوبارہ سے آزادانہ طور پر وثیقہ نویسی کا کام شروع کیا۔ دسمبر 2017 میں صاحب فراش ہوگئے۔ علالت میں اضافہ ہوتا گیا اور 26 فروری 2018 کو اپنے حقیقی رب سے جا ملے۔ مرحوم داؤد حسن صرف مڈل پاس تھے لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں، ذہنی مشق اور مطالعے کے شوق کے بل بوتے ان کا شمار ذی شعور، روشن خیال اور باوقار لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کی پُر وقار شخصیت کا ہی کمال ہے کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے مداحوں نے اپنے قلم سے اُن گوشوں پر خامہ فرسائی کی جو ابھی تک اہلِ نظر کے لیے روپوش تھے۔

ڈاکٹر عارف حسن نے بڑی ہی جاں فشانی اور عرق ریزی سے اپنے دادا مرحوم کی شخصیت اور فن کے حوالے سے لکھے گئے مضامین کو اکٹھا کر کے اسے زیورِ طبع سے آراستہ کر کے کتابی شکل میں قارئین اور ناقدین کے سامنے پیش کیا، ڈاکٹر عارف حسن نے اس کتاب کو چھے ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں مضامین، دوسرے میں منظوم خراجِ عقیدت، تیسرے میں تعزیتی خبریں، چہارم میں منتخب کلام، پنجم میں داؤد حسن کی تحریریں اور باب ششم میں تصاویر دی گئی ہیں۔ ڈاکٹر عارف حسن نے اپنے پیش لفظ میں کتاب میں شامل مضامین کے حوالے سے بہت سی باتیں تحریر کی ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اپنے مقدمے میں ڈاکٹر عارف حسن اور ان کے خانوادے کی علمی و ادبی کارکردگیوں کا بہ خوبی جائزہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے ڈاکٹر عارف حسن کی ادبی کاوشوں کی ستائش کرتے ہوئے لکھا کہ ڈاکٹر عارف حسن اُردو کے سنجیدہ اسکالر اور اُبھرتے ہوئے ادیب و قلم کار ہیں۔

جواں سال شاعر کامران غنی صبا نے اپنے منظوم خراج عقیدت میں مرحوم داؤد حسن کی شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے چند اشعار میں اپنی بات یوں مکمل کی:

یہ سچ ہے آپ نہ شاعر تھے اور نہ عالمِ دیں
نہ رہنما تھے سیاسی، نہ شیخ تخت نشیں
نہ جامعہ سے فراغت کی کوئی پائی سند
مگر تھا علم و عمل میں بہت ہی اونچا قد

بہرکیف! مبارک باد کے مستحق ہیں ڈاکٹر عارف حسن وسطوی جنھوں نے اپنے دادا مرحوم کی حسیں یادوں، باتوں اور ملاقاتوں کو کتابی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو بہت ہی کم لوگ اس دنیا میں ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے بزرگوں اور اسلاف کے علمی و ادبی کارناموں کو صفحۂ قرطاس کی زینت بنایا ہو لیکن عارف حسن صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خاندان کے چھوٹے سے چھوٹے فرد اور بڑے سے بڑے بزرگ سے مضامین تحریر کرائے۔ یہ بات اس جانب واضح اشارہ کرتی ہے کہ اہلِ خانہ اپنے ادبی پیشوا اور شجرِ سایہ دار سے کتنی والہانہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ مجھے توقع ہی نہیں اُمید ہے کہ مرحوم داؤد حسن کے علمی کارناموں کو سمجھنے کے لیے ڈاکٹر عارف حسن کی یہ کتاب نہ صرف مفید اور سودمند ثابت ہوگی بلکہ صحیح معنوں میں زبانِ خلق، نقارۂ خدا تسلیم کی جائے گی۔

اسلم جمشید پوری: اردو افسانے کی ایک منفرد آواز

مصنفہ: ڈاکٹر صالحہ رشید

صفحات: 176، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری

گورنمنٹ ڈگری کالج، مارگر، کشمیر۔ 193401 (جموں کشمیر)

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری صدر شعبۂ اُردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ (یوپی) کا نام اور کام ہم عصر اُردو دنیا میں بہت دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ کئی معنوں میں اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ ایک فکشن نگار ہیں اور اپنے فکشن میں عصری مسائل پر بات کرتے ہیں، ساتھ ہی معاصر ادبی رجحانات اور تکنیکوں کو بھی بروئے کار لاتے ہیں۔

سردست ان پر ڈاکٹر صالحہ رشید (شعبۂ عربی و فارسی یونیورسٹی آف الہ آباد) نے 'اسلم جمشید پوری: اُردو افسانے کی ایک منفرد آواز' کے عنوان سے ایک مبسوط کتاب لکھی، جس پر یہاں بات کی جاسکتی ہے۔

اسلم جمشید پوری پر لکھی گئی یہ کتاب کوئی تحقیقی یا تنقیدی مقالہ نہیں ہے۔ بلکہ مصنفہ موصوف سے متاثر ہوئی ہیں اور انھوں نے وقتاً فوقتاً ان کی شخصیت، حالات زندگی اور ان کے فکر و فن پر کچھ رواں دواں مضامین سپرد قلم کیے تھے اور پھر ترتیب دے کر ایک کتاب تیار کر ڈالی۔

کتاب کے 'پیش لفظ' میں سب سے پہلے ڈاکٹر صالحہ رشید صاحبہ نے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی ادبی شخصیت کو مجموعی طور پر متعارف کرانے کی سعی کی ہے اور ان عوامل کا بھی بیان کیا، جو انھیں موصوف پر لکھنے کے لیے اُکسانے لگے۔

اس کے بعد 'وہ پانچ دن' کے عنوان سے ڈاکٹر صالحہ نے ایک رپورتاژ لکھا ہے۔ جو اصل میں پانچ روزہ اُردو، ہندی اور انگریزی افسانوں کے ورکشاپ پر مبنی ہے۔ جو کہ 'شعبۂ اُردو چودھری چرن سنگھ میرٹھ یونیورسٹی' نے (24 تا 28 اپریل 2015) منعقد کیا تھا، جس کے روح رواں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری تھے اور مصنفہ اس میں شریک ہوئیں تھیں۔ 'اسلم جمشید پوری کے افسانوں کے فکری و فنی امتیازات' کے عنوان سے ایک مختصر سا مضمون ہے۔ جس میں ان کے چند افسانوں کا مطالعہ سماجی تناظر میں کیا گیا ہے اور ساتھ ہی 'گاؤں سے شہر' کی جانب ہجرت کرنے کا جو فوبیا لوگوں میں پایا جاتا ہے اور یہ مسئلہ ڈاکٹر صاحب کے کچھ افسانوں کا بھی موضوع بنا ہے، تو یہاں اس پس منظر کے حوالے سے بھی بات کی گئی ہے۔

ہر کسی بڑے فنکار کی پہچان اس کا کوئی نہ کوئی ایک فن پارہ بن جاتا ہے۔ تو پھر اکثر و بیشتر ان کے بارے میں یہ ایک جملہ لکھا جاتا ہے کہ اگر 'الف' (مطلب یہ فنکار) صرف 'ب' (مطلب اس کا یہ شاہکار فن پارہ) ہی لکھتا، تو اس کی شہرت کے لیے یہ کافی تھا۔ جبکہ میرے نزدیک ایک فن کار کے لیے اس کا ہر کوئی فن پارہ یکساں ہوتا ہے۔ قاری یا نقاد کیا سمجھے گا، وہ الگ بات ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے 2009 میں 'لینڈرا' کے عنوان سے اپنے افسانوں کا دوسرا مجموعہ شائع کیا، جس پر انھیں یوپی اُردو اکادمی نے نقد انعام سے نوازا اور قارئین رناقدین نے بھی اسے کافی سراہا۔

پھر اپنے اس افسانے 'لینڈرا' کے ساتھ کچھ اور افسانے شامل کر کے 2014 میں 'لینڈرا اور دیگر کہانیاں' کے عنوان سے ان کا نیا مجموعہ پاکٹ بک ایڈیشن میں شائع ہوا۔

غرضیکہ افسانہ 'لینڈرا' کافی مقبول ہوا اور دیگر لوگوں کی طرح ڈاکٹر صالحہ رشید بھی اس افسانے کو مختلف صورتوں میں زیر بحث لائی ہیں۔

موصوف نے پہلے 'لینڈرا اور بچہ مردم: اصلاحی اور موضوعاتی نقطۂ نظر' عنوان کے

تحت جلال آل احمد کے سوانحی کوائف اور ان کی ادبی خدمات کا اجمالاً جائزہ لیا ہے، ٹھیک اسی طرح ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی سوانحی کوائف، ان کی شخصیت مجموعی طور پر ان کی ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ یہاں دونوں مصنفین کے افکار کا تقابلی جائزہ بھی لے لیا گیا ہے اور دونوں افسانوں کا موازنہ بھی کیا گیا۔ جلال کے افسانے میں سارا فوکس (اس بچے کی ماں) عورت کو کیا گیا، جس کی وجہ سے یہاں اس کی مجبوری اور لاچاری سامنے آجاتی ہے اور جس سے یہ افسانہ تانیثیت کے قریب بھی چلا جاتا ہے، جبکہ ڈاکٹر اسلم نے 'لینڈرا' کو ہی مرکزی کردار بنایا ہے اور اس طرح دونوں مصنفین نے ایک ہی موضوع کو بنیاد بنا کر الگ الگ طریقے سے اس کو پیش کیا ہے۔ مصنفہ نے کچھ سماجی مثالیں دے کر یہ صاف بیان کیا ہے کہ ڈاکٹر اسلم کے سماج میں ایسی کئی زندہ اور دل ہلا دینے والی مثالیں ہیں کہ جن سے وہ 'لینڈرا' جیسے افسانے لکھنے کے لیے مجبور ہوگئے ہوں گے، تو اس طرح جلال آل احمد یا کسی بیرونی شے سے متاثر ہونا دور کی بات ہے۔ ڈاکٹر صالحہ صاحبہ نے اپنے بیان کو ختم کرنے کے بعد اپنی کتاب میں افسانہ 'لینڈرا' کا متن بھی شامل کیا۔ اس کے بعد 'لینڈرا' کا فارسی ترجمہ بھی ساتھ ہی پیش کیا گیا ہے۔ پھر جلال آل احمد کے افسانے 'بچہ مردم' کا فارسی متن اور پھر اس کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

یہ چار چیزیں دو زبانوں میں پیش کرنے کا مقصد واضح ہے۔

ریسرچ کے لیے نئے نئے دروازے وا کرنا اور ایک نئی بحث قائم کرنا، نہ کہ کتاب میں بھرتی کا مال پیش کرنا یا اسے ضخیم بنانا ہے۔ میرے خیال میں 'لینڈرا' ایک ترقی پسند افسانہ ہے، مگر اسے ہم آج کل 'نو مارکسی لٹریچر' کے تحت بھی پڑھ سکتے ہیں۔ 'لینڈرا' کرشن چندر کے 'کالو بھنگی' کے جیسا ہی ہے مگر افسانے کے اختتام پر یہ اپنے آپ کو ثابت کر دیتا ہے کہ میں اب دبنے والا نہیں ہوں، حالانکہ ہمیں پہلے بھی لگتا ہے کہ اس کے اندر جما ہوا لاوا ایک دن ضرور پھٹ جائے گا۔ چونکہ زیر نظر کتاب کا موضوع اصل میں اسلم جمشید پوری اور ان کے افسانوں کی انفرادیت ہے۔ اس لیے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مصنفہ نے 'منٹو کے ہمعصر چند فارسی افسانہ نگار' کے تحت اس دور کے افسانہ نگاروں پر بھی بات کی ہے۔ یہ چیز اُردو والوں کے لیے کسی تحفے سے کم نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحبہ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی تخلیقات کے بارے میں وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ لکھتی ہی رہتی ہے۔ افسانوی مجموعے 'لینڈرا' میں شامل ایک اور معروف افسانے 'ناداں' کا بھی تجزیہ انھوں نے 'عورت کے لطیف جذبات کا فنکارانہ بیان' سرخی لگا کر کیا اور پھر اس کو مع متن اپنی کتاب کے کچھ اوراق کی زینت بنا کر سجایا ہے۔

اردو میں جسے 'منی افسانہ یا افسانچہ' کہتے ہیں۔ (جس کے موجد یہاں سعادت حسن منٹو قرار دیے جاتے ہیں) اسے فارسی میں 'مینیمال' کہتے ہیں۔ موصوفہ نے اس کے فن پر بات کرتے ہوئے فارسی اُردو کے چند افسانچوں کو بھی نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے بھی کچھ افسانچے شامل ہیں۔

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نہ صرف ایک افسانہ رائٹر ہیں، بلکہ اس فن پر ان کا تحقیقی و تنقیدی کام بھی سند کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کے ایک مجموعے پر 'اُردو فکشن کے پانچ رنگ۔ ایک عمومی جائزہ' کے تحت پانچ صفحات پر مشتمل ایک مضمون بھی شامل کتاب ہے۔

الغرض زیر نظر کتاب میں شامل بیشتر مضامین کو زیادہ تر 'تاثراتی تنقید' کے تحت ہی لکھا گیا ہے۔ مصنفہ کے بیانات میں کہیں بھی ابہام یا مبالغہ آرائی نہیں، بلکہ بڑی روانی سے انھیں پڑھا جا سکتا ہے اور اس طرح ہم عصر افسانہ نگار اور نقاد ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی ادبی شخصیت کے مختلف گوشے بہ آسانی منور ہو جاتے ہیں۔

خاکے

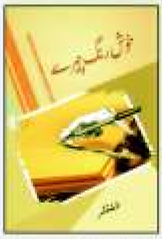

خوش رنگ چہرے

مصنف: پروفیسر غضنفر

صفحات: 158، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، محلہ گھیر مناف، امروہہ (یوپی)

محترم پروفیسر غضنفر اردو ادب میں مختلف حوالوں سے ایک بڑا اور معتبر نام ہے، آپ بیک وقت ایک بہترین افسانہ نگار، ناول نویس، خاکہ لکھنے والے، قادر الکلام، عصری حسیت و کلاسیکی مزاج کے استاد شاعر اور سنجیدہ نقاد ہیں۔ اب تک ان کے اردو زبان میں 9/ ناول، 2/ ناول ہندی میں، 2/ افسانوی مجموعے 'حیرت فروش' اور 'پارکنگ ایریا' تنقید میں 'زبان و ادب کے تدریسی پہلو'، 'مشرقی معیار نقد'، 'تدریس شعر و شاعری'، 'فکشن سے الگ' ایک مثنوی 'کرب جاں' اور بچوں کے ادب میں 'سخن غنچہ' وغیرہ کے ساتھ ہی ایک شعری مجموعہ 'آنکھ میں لکنت' دو خاکوں کے مجموعے 'روئے خوش رنگ' اور 'خوش رنگ چہرے' ہیں۔ اب تک آپ کی کل تقریباً 24 کتابیں منظر عام پر آ کر بقائے دوام اور تحسین خواص و عوام حاصل کر چکی ہیں۔

محترم غضنفر صاحب کی تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک منجھے ہوئے ادبی رچاؤ کے صاحب قلم ہیں، زبان و بیان پر انہیں قدرت حاصل ہے، ان کی شاعری اور تحریریں ان کے وسعت مطالعہ، عصری شعور و آگہی کی غماز ہیں۔ راقم الحروف نے ان کا شعری مجموعہ 'آنکھ میں لکنت' بھی پڑھا ہے جس سے میں پوری طرح متاثر و محظوظ ہوا۔ بعض اشعار نے ذہن و دل پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ سر دست آپ کے خاکوں کا مجموعہ ''خوش رنگ چہرے'' زیر مطالعہ ہے۔ اس میں کل 20 خاکے شامل ہیں (طوالت کے سبب عناوین نہیں لکھ رہا ہوں) جنھوں نے پوری طرح متاثر کیا اور یہ بھی باور کرایا کہ غضنفر صاحب نے اس میں ایک نئی طرز ایجاد کی۔

ممکن ہے کہ خاکہ نگاری کے بعض ناقدین کو یہ بات پسند نہ آئے کیونکہ ان کا ماننا تو یہ ہے کہ جس کا خاکہ لکھا جا رہا ہے اس کی تمام خوبیاں اور خرابیاں بڑی احتیاط سے بیان کر دیجیے، تبھی اس کی مکمل شخصیت اُبھر کر ہمارے سامنے آئے گی۔ آپ کا پہلا ہی خاکہ جو کہ محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب پر ہے، بعنوان ''جس کا رنگ، رنگِ بہار ہے'' بہت ہی خوب اور خاکہ نگاری کی تمام ہی خوبیوں سے مکمل طور پر سجا ہوا ہے۔ ان کی شخصیت کے سارے پہلو بڑی خوبی سے بیان کیے گئے ہیں۔

دوسری ایک اور نئی طرز غضنفر صاحب نے اپنے خاکوں میں یہ ایجاد کی ہے کہ وہ اکثر جگہ اپنی زیر قلم شخصیت کا نام نہیں بتاتے۔ مجتبیٰ حسین صاحب نے اس خوبی کو محسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''غضنفر کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ جس شخصیت کا نقشہ کھینچتے ہیں، اکثر اس کا نام نہیں بتلاتے۔ پڑھنے والا خوبصورت طرز تحریر کا لطف بھی اُٹھاتا ہے اور پہیلی بوجھنے کی کشمکش میں بھی گرفتار رہتا ہے۔''

ان خاکوں میں چھٹا خاکہ بعنوان ''قصہ کسی جنوں کا'' محترم ڈاکٹر عارف حسن خاں صاحب ریٹائرڈ لکچرار ہندو ڈگری کالج، مراد آباد کا ہے جو ایک بھرپور شاہکار خاکہ ہے جس میں ڈاکٹر عارف حسن خاں صاحب علیگ کی شخصیت کو بڑی خوبی اور چابکدستی سے سپرد قرطاس کیا ہے۔ اس میں غضنفر صاحب کا افسانوی اور شاعرانہ رنگ و مزاج بھی خوب در آیا ہے۔ میں نے اس خاکہ کو اس سحر کے سبب تین بار پڑھا اور ہر مرتبہ نیا لطف اُٹھایا۔ ''مجید میاں کا خون'' ایک نہایت ہی خوبصورت، جذباتی، سبق آموز اور لائق تقلید

خاکہ ہے۔ ''پیدا کہاں ہیں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ''

ناز قادری صاحب کا خاکہ بہت سوں کو اپنے گریبانوں میں جھانکنے پر مجبور کرتا ہے، جبکہ وہ غیرت مند ہوں۔

غضنفر صاحب نثر بھی شاعرانہ اور مسجع ومقفیٰ لکھتے ہیں، اگرچہ اکثر جگہ اضافتوں کی بھرماران کی نثر کو بوجھل کرتی ہے۔ اکثر جگہ تو بیجا اضافتیں لگادی گئی ہیں۔ (جیسے: رکنِ فعلن، حضرتِ فعولن وغیرہ وغیرہ) ساتھ ہی آپ کے بعض خاکوں میں خود کی شخصیت زیادہ ابھر آتی ہے اور جس کا خاکہ ہے وہ دب جاتا ہے، اس بات کا احساس احقر کو ''وہ جو میرا تیرا حبیب تھا'' میں بہت ہوا۔ اسی میں غضنفر صاحب ایک خاکہ نگار سے زیادہ واعظ و مبلغ نظر آتے ہیں۔ بعض مقامات پر وہ اپنے ممدوح کی تعریف وتوصیف میں خوبصورت اور بھاری بھرکم جملوں اور الفاظ کے اتنے گوہر لٹاتے ہیں جیسے کوئی ذاکر، شہدائے کربلا کے اوصاف حمیدہ بیان کررہا ہو۔ شمیم رضوی کا خاکہ ''ایک روشن دماغ تھا نہ رہا'' اس کی اچھی مثال ہے۔ خود پڑھیے گا تو مزہ آئے گا۔

'خوش رنگ چہرے' میں' املے کی غلطیاں وافر مقدار میں ہیں، صرف دو خاکوں 'موبائل فوارہ' میں 9 / اور' دائرۂ احساس' میں 20 غلطیاں ہیں۔ بعض جگہ جملوں کی نشست وبرخاست بھی درست نہیں ہے۔ اکثر جگہ تو مان لیا کہ یہ کاتب کی غلطی ہو مگر دو ایک مقام پر کاتب یا کمپوزر کو موردِ الزام ٹھہرانا زیادہ مناسب نہیں سمجھا اور سوچا کہ غضنفر صاحب کی اپنے وطن سے آج بھی جڑیں بڑی مضبوط ہیں جو ایک فطری عمل ہے، اپنی پہچان نہیں کھونی چاہیے۔ مثلاً: ڈنک ماردی۔

'خوش رنگ چہرے' کے مکمل مطالعے سے اندازہ ہوا کہ محترم غضنفر صاحب کی زبان پر گرفت مضبوط ہے، وہ اردو زبان میں نئے الفاظ کے اضافے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر منصور عثمانی صاحب کے خاکے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''وہ طوطائی جملے نہیں بولتے'' اس طرح کی ڈھیر ساری مثالیں اس مجموعے سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ 'خوش رنگ چہرے' سے غضنفر صاحب کی تحقیق وتلاش، تنقیدی بصیرت، وسعت مطالعہ اور حسِ مزاح کے جوہر بھی خوب کھلتے ہیں۔

بہرحال! 'خوش رنگ چہرے' میدانِ خاکہ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے، اس میں تحقیق وتلاش کی خوش رنگی، تنقیدی بصیرتوں کی خوش سلیقگی، وسعت مطالعہ کی خوش جمالی قدم قدم پر بکھری ہوئی ہے، جو دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ میں محترم پروفیسر غضنفر صاحب کو اردو ادب میں اتنے خوبصورت خاکوں کے لیے دلی مبارک باد دیتا ہوں اور اس دورِ پُرفتن میں عزت وآبرو کے ساتھ درازیِ عمر کی دعا بھی۔

شاعری

آہٹ پانچویں موسم کی

شاعر: ڈاکٹر عباس رضا نیر

صفحات: 316، قیمت 200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: حبیب سیفی، فرسٹ فلور حوض رانی E12/51B مالویہ نگر نئی دہلی 17

شاعری کی زباں سمجھتے ہو   کیا ہے اردو زباں سمجھتے ہو
گفتگو کا شعور ہے تم کو   خامشی کا بیاں سمجھتے ہو

لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر عباس رضا نیر کی شاعری کے بارے میں کسی نے کیا کچھ کہا اور نہیں کہا اس نکتہ سے قطع نظر آہٹ پانچویں موسم کی شاعری سماج کا وہ آئینہ ہے جس میں ہر ایک زاویہ سے ہر شخص پہلو بہ پہلو اپنا مطلوبہ چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ زندگی ایک امتحان ہے، جس سے کم وبیش ہر انسان کو گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کے شکست وریخت کی شکایتیں ایسے میں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ ہاں مگر ظلم سہہ کر خاموش رہنا بھی ظالم کی مدد کرنا ہے، ایسا میرا خیال ہے۔

مسئلہ نرم کلامی سے ہی حل ہوتے ہیں   مسئلے حل نہیں ہوتے کبھی تکرار کے ساتھ
میرے قلم کے حصے میں وہ سچ آیا   جس کو کبھی چھاپا ہی نہیں اخباروں نے
اٹھا نہ کوئی بجھانے ہمارے شہر کی آگ   مقررین تو شعلے اگل کے بیٹھ گئے

بلاشبہ میں اس کشمکش میں مبتلا ہوں کہ آپ شاعری اچھی کرتے ہیں یا نثر اچھی لکھتے ہیں، یا دونوں پر ہی آپ کو ملکہ حاصل ہے۔ دریچہ کے عنوان سے اپنی بات کے تحت ڈاکٹر عباس رضا نیر لکھتے ہیں کہ مجھ سے سرگوشیاں کرتی ہیں ادھوری نظمیں، اور غزلوں کا اصرار کہ میں ان کو کسی طور مکمل کردوں۔ میری غزلیں، مری نظمیں، جو میری وارث ہیں...... کیا کروں، کیا نہ کروں؟ قرض گراں کا جو گردن پر ہے میری وہ اتاروں کیسے؟۔ اسی طرح ایک اور مقام پر لکھتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ خلوت جاناں سے بہت آگے غزل کی منزل ہے........ یہ ملاسکتی ہے ہر عہد سے نظریں اپنی........ یہ وہ موم جو ہر سانچے میں ڈھل جاتی ہے...... ایک جگہ آپ نے لکھا ہے، ایک کسک دل میں ہے ماحول کو تبدیل کروں...... اس گھٹن اور گھٹاٹوپ اندھیروں کی فضا سے نکلوں۔ ظاہر ہے یہ عزم محکم اور حوصلہ وہی رکھ سکتا ہے جو اس سمت قدم بڑھانے کی حقیقی خواہش رکھتا ہو۔ عباس رضا نیر بلاشبہ انسانیت کے علمبردار ہیں اور اپنی شاعری سے انسانیت کی خدمت کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں، آپ کا نصب العین حاصل شدہ علم سے عمل کی راہیں طے کرانا ہے۔

غزل کے حسن میں ڈھلتا ہے جب خیال کوئی   تو بات بات میں پہلو نکلنے لگتے ہیں
یہ کہہ کے دشت میں خیمہ لگا رہا ہے چراغ   یہاں ہواؤں کا لشکر ٹھہر نہیں سکتا

شاعری کی جمالیات اور عمدہ خیالات کا تذکرہ جب بھی کیا جاتا ہے تو روکھے سوکھے شعر پیش کردیے جاتے ہیں۔ شعریت کا اس سے بہتر ثبوت میں آپ کو اور کیسے دوں، کہ

اس کو سینا تھا کسی کڑوی حقیقت کا لباس
رات میری آنکھ سے خوابوں کی کترن لے گئی

میرا مطالعہ اگر خاطر میں لایا جائے تو آپ کو عباس رضا نیر کی بیاض میں ہر طرح کے ہر مضمون پر مبنی اشعار مل جائیں گے۔ بس سچ پوچھیے تو مجھے عباس رضا نیر کی شاعری نے مایوس ذرا نہیں کیا، بلکہ تحیر افزا مسرت سے ہمکنار کیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ عباس رضا نیر کا مطالعہ نہ صرف یہ کہ وسیع ہے بلکہ ان کی حساس طبیعت ان کے دل میں موجزن کیفیات کو شعر کے پیکر میں ڈھال دیتی ہے۔

کھیلنے کی عمر میں ہی کام پر جانے لگے   چھین کر یہ مفلسی بچوں سے بچپن لے گئی
شکم کی آگ جلا ڈالتی ہے خود داری   شریف لوگ گھروں سے نکلنے لگتے ہیں
دھرتی سے سیلاب اگانے کی دھن میں   وہ مٹی میں آنسو بونے لگتا ہے

عمدہ نظموں کی تو بات ہی کیا، اگر وہ چاہتے تو ان نظموں کو ایک کتاب کی شکل میں علیحدہ بھی شائع کرسکتے تھے، یہ شاید بہتر رہتا، ہاں مگر میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ اگر نیر کو اپنی کتابوں کی تعداد بڑھانی ہی نہیں مقصود ہو تو کیا کیا جائے۔ شعور وفکر کی آگہی کو دیکھیں تو پروردگار نے جو سلیقہ شعر تخلیق کرنے کا ڈاکٹر عباس رضا نیر کو عطا کیا ہے وہ کم ہی لوگوں کو ملتا ہے۔ بہتوں کی زندگی تمام ہوجاتی ہے اور شاعری کے کئی کئی مجموعہ سامنے آجاتے ہیں، لیکن ان میں خال خال ہی کوئی ایک آدھا شعر یا مصرع طبیعت کے قریب ہوکر گزرتا ہے۔ اچھی شاعری کی پہچان میرے نزدیک یہ ہے کہ سماعتوں سے گزرے یا قرأت سے سیدھے دل میں اتر جائے، بلاشبہ یہ صفت آہٹ پانچویں موسم کی شاعری میں ہے۔ حالات کی ترجمان شاعری کو سند کی ضرورت قطعی نہیں ہے، آپ بیتی میں جگ

بیتی کا جو عنصر صاف طور سے جھلک رہا ہے یہ کمال شاعری ہے۔

غلامی ذہن میں رچ بس گئی ہے — مزہ آنے لگا سب کو قفس میں
ہوا نے اس طرح حملہ کیا ہے — چراغوں کا بدن ٹھنڈا ہوا ہے
خود انتظار میں رہتی ہیں منزلیں جن کے — وہ راستے مری زنجیر پا میں زندہ ہیں

زمانے کی تیز رفتاری سے متاثر کرنے والی یہ شاعری تو نہیں ہے، ہاں مگر دنیاوی معمولات کی تبدیلیوں پر نظر رکھنے والے اشعار کی بھی بڑی تعداد آہٹ پانچویں موسم کی شاعری میں پڑھنے کو ملے گی۔ امید ہے اس عمدہ اور لاجواب شاعری کے لیے ہم عصر شعراء حضرات میں عباس رضا نیر کو ایک الگ مقام ملے گا۔ میں مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آہٹ پانچویں موسم کی شاعری جس میں غزلیں اور نظمیں بلا امتیاز شامل ہیں، ظاہری لفظیاتی حسن کے ساتھ قلبی تاثیر سے بھی معمور ہیں۔

تاریخ

روضۂ تاج محل تاریخ کے آئینے میں

مصنف: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان

صفحات: 104، قیمت: 80 روپے

مبصر: عبداللہ عثمانی

4/16، گدڑی وارا، پوسٹ دیوبند۔ 247554 (یوپی)

علم تاریخ نہ صرف ایک دلچسپ موضوع ہے بلکہ حقائق کی دریافت اور فرسودہ روایات کی تردید کا ایک معتبر ذریعہ بھی ہے، اس موضوع پر ہر ملک ہر خطہ اور ہر سماج کی الگ الگ تاریخیں لکھی گئی ہیں، تاریخ ہند پر ہی لیجیے سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، محمد بن قاسم کی تاریخ فرشتہ، منشی ذکاء اللہ کی تاریخ عہد عروج انگلیشیہ، میر غلام علی آزاد بلگرامی کی، ماثر الکرام ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ، سید ہاشمی فرید آبادی کی تاریخ ہند، خافی خان کی منتخب اللباب، ڈاکٹر ایشوری پرساد کی ہسٹری آف انڈیا، وغیرہ مقبول عام وخاص رہی ہیں، مگر درج بالا کتب اپنے اپنے عہد کے حکمرانوں کے سماجی، معاشرتی اور جنگی حالات پر روشنی ڈالتی ہیں، اسی طرح ہندستان کی قدیم تاریخی عمارتوں کی تواریخ بھی اہل ہند ہی نہیں غیر ملکی وقائع نگاروں کے لیے دلچسپی کا سامان رہی ہیں، یوں تو ہندوستان کی ہزاروں عمارتیں اپنے اپنے فن وحسن کی جامع تاریخ کی حامل ہیں مگر مغل عہد میں تعمیر شدہ عمارتیں نہ صرف اپنے حسن کا اعلیٰ نمونہ ہیں بلکہ اپنی تکنیک، آرٹ، اور نقاشی کے امتیاز سے نہایت افضل ومنفرد ہیں، دلی کا پرانا قلعہ، آگرہ کا قلعہ، دلی کا لال قلعہ، جامع مسجد دہلی، مقبرہ ہمایوں وغیرہ، اپنی خوبصورتی اور فنی اعتبار سے نہایت بلند ہیں۔ اسی سلسلے میں ہندوستان میں سولہویں صدی عیسوی میں تعمیر دنیا کا ساتواں عجوبہ تاج محل آگرہ بھی اپنے حسن، کشش آرٹ ڈیزائن اور نادر ونایاب پتھروں اور موتیوں کے باعث چار سو سالوں سے دنیا بھر میں معروف ومشہور ہے اب تک اس عظیم عجوبہ پر نہ صرف ہندوستانی مؤرخین نے سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں بلکہ مغربی مصنفین نے بھی اس پر خامہ فرسائی کی ہے کوئی بھی مورخ یا وقائع نگار اس کی تعریف وتوصیف کیے بنا نہیں رہ سکا ہے، تاریخ تاج محل پر مختلف کتابیں لکھی جا چکی ہیں ان میں ڈاکٹر عزیز احمد کی، ہندوستان کے سات عجائبات، میکش اکبر آبادی کی آگرہ اور آگرہ والے، شہزادہ آصف خاں غوری، کی ممتاز محل کی یادگار تاج محل، ایسی ہی انگریزی زبان میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مذکورہ کتابوں میں یا تو اکثر نایاب ہیں یا پھر ضخیم ہیں غرض کہ آسانی سے قارئین کی رسائی بھی انگریزی ماخذوں تک ممکن نہیں۔ اس کمی کو ہمارے عصر کے نامور مصنف اور ماہر تعلیم جناب ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان اورنگ آبادی نے بڑی حد تک 'روضۂ تاج محل تاریخ کے آئینے میں' اردو میں لکھ کر پورا کر دیا، ڈاکٹر موصوف ہمارے عصر کے ایسے صاحب قلم مصنف ہیں کہ جن کی اب تک مختلف موضوعات پر تین درجن کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

'روضۂ تاج محل تاریخ کے آئینے میں' ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کی تازہ ترین کتاب ہے 104 صفحات پر مشتمل یہ کتاب کاغذ، کتابت اور سرورق کے لحاظ سے بھی بہت خوب ہے، مذکورہ کتاب ضمیمہ کے علاوہ گیارہ مختلف ابواب پر مشتمل ہے، (1) روزہ تاج محل تاریخ کے آئینہ میں (2) ممتاز محل کی وفات اور سپرد خاک، (3) عرس ممتاز محل (4) ممتاز محل کی نعش برہانپور سے آگرہ آمد (5) برہان پور سے آگرہ نعش کے ساتھ سفر (6) ممتاز محل کی نعش کا آگرہ آباد میں مدفن (7) تاج محل کے معماروں کے نام (8) تاج محل کی تاریخ وتعمیر (9) قیمتی پتھر اور جواہرات (10) تاج محل کے مصارف کے لیے اوقاف (11) تاج محل کی تعمیری اخراجات شاہی کا بیان، ان عنوانات کے علاوہ ضمیمہ میں بھی درج ذیل عنوانات شامل ہیں۔ (1) روضۂ تاج محل ایک تعارف (2) شہر آگرہ (3) بنیادی ڈھانچہ اور زمینی لے آؤٹ منصوبہ (4) ممتاز آباد تاج گنج علاقہ (5) قرآنی آیات اور فارسی کتبے۔

درج بالا عنوانات سے مصنف کی محنت شاقہ اور ذوق مطالعہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان نے اپنی اس کاوش کے لیے نہ صرف عربی فارسی اور اردو کتابوں سے استفادہ کیا بلکہ انگریزی کی معتبر کتابیں بھی دیکھی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعزیز کی کاوشوں کا ایک خاصہ یہ بھی رہا ہے کہ وہ سادہ اور سہل الفاظ میں بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عام لکھا پڑھا قاری مصنف کی منشاء ومقصد سے پوری طرح محظوظ ہوتا ہے بہر کیف تاج محل کی دلکشی، حسن اور رعنائی سے کسے انکار ہو سکتا ہے اس کے دیدار کے بعد فطرتاً سوال ابھرتا ہے کہ یہ عمارت کیسے اور کن معماروں کے توسط سے وجود میں آئی؟ مذکورہ کتاب ان تمام سوالات کا جواب ہے۔ ممتاز محل کی تاریخ پیدائش اور وفات میں قدیم زمانے سے اختلاف چلا آ رہا ہے مصنف نے معتبر کتابوں کے حوالے سے شاندار بحث کے بعد یہ تاریخیں متعین کی ہیں چناں چہ اس بابت لکھتے ہیں:

''اس کے متعلق میری ذاتی رائے یہ ہے کہ شاہجہاں کی محبوب بیگم ممتاز محل کا قلعہ ارک چہار شنبہ (بدھ) 17/ذی قعدہ 1040ھ بمطابق 7/جون 1631 کو انتقال ہوا مؤرخین کی اکثریت بھی اسے ہی تسلیم کرتی ہے، مصنف ظفر نامہ شاہجہاں، عبدالحمید لاہوری، ڈاکٹر محمد شفیع مہوبوی، بناری پرشاد سکینہ وغیرہ مصنفین ومورخین اس تاریخ سے متفق ہیں دوسرے ممتاز محل کا انتقال چودھویں بچے (گوہر آرا بیگم لڑکی) کی پیدائش کے بعد ہو چکا تھا اس لڑکی کے سنہ پیدائش کے بارے میں 7/جون 1631 کو کہا جاتا ہے ممتاز نے بچہ کو جنم دینے کے بعد وفات پائی تھی گویا یہی تاریخ ممتاز محل کی سنہ وفات ہے یہی صحیح ہے''۔

بہر کیف ڈاکٹر عبدالعزیز نے اس چھوٹی سی کتاب میں تاج کے متعلق کافی معلومات فراہم کی ہیں مثلاً تاج محل کے معماروں کے نام مع ان کے وطن اردو زبان کے ساتھ انگریزی زبان میں بھی لکھے ہیں علاوہ ازیں اس عظیم عجوبے میں مستعمل قیمتی پتھروں اور جواہرات کی ایک طویل فہرست شامل کی ہے جس سے ایک اندازہ قائم کیا جا سکے کہ شاہجہاں نے تاج کی تعمیر میں کتنی دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا نیز تاج محل کی تعمیر پر کتنا صرفہ آیا اس پر بھی عمدہ تحقیق پیش کی ہے مجموعی طور پر ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان اس کتاب کی تخلیق پر قابل مبارک ہیں انھوں نے یہ کتاب اردو میں لکھ کر اردو کے دامن کو ایک نایاب موتی سے مالا مال کر دیا ہے۔

خوبصورت سرورق، عمدہ کاغذ وطباعت سے مزین اس کتاب کی قیمت صرف 80/ روپے رکھی ہے بہر کیف ڈاکٹر موصوف کا یہ کارنامہ نہ صرف تاج کی تاریخ میں نیا اضافہ ہے بلکہ اہل اردو کے لیے بھی بہترین سوغات ہے۔ ■

عالمی اردو نامہ

جشن آزادی کے تعلق سے مشاعرہ اور کوی سمیلن کا انعقاد

نئی دھلی: ہندوستان کے جشن آزادی سے متعلق ہندوستان کے سفارت خانے کی طرف سے ایک مشاعرے اور کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام میں بڑی تعداد میں شعرا اور باذوق شائقین نے شرکت کی۔ اس باوقار تقریب میں سفیر نویپ سوری نے 1919 میں ہونے والے جلیان والا باغ سانحہ کے تعلق سے اپنی ایک نظم 'خونی بیساکھی' سنائی۔ سفیر کبیر نویپ سوری جلیان والا باغ سانحہ میں زندہ بچ جانے والے نانک سنگھ کے پوتے ہیں۔ اس پروگرام کی صدارت ہندوستان کے مشہور اردو شاعر منظر بھوپالی نے کی اور شرکا میں ہندی کے مشہور شاعر ڈاکٹر کنور بے چین، شاعرہ شبینہ ادیب کے علاوہ یو اے ای میں رہنے والے شاعر عرفان اظہار، سید اعظم جیوری، حیدر امان حیدری اور ای بھوجپوری قابل ذکر ہیں۔ اس موقعے پر نویپ سوری نے شعرا، معزز سامعین اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اس پروگرام میں این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ پروگرام متحدہ عرب امارات میں ہندوستانی سفارت خانے اور ورنگس ایونٹس کے تعاون سے کیا گیا۔ اس موقعے پر ورنگس ایونٹس کے مینیجنگ ڈائرکٹر پشکن آغا نے کہا کہ جشن ہندوستان کے پروگراموں کا حصہ ہونا باعث افتخار ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 ستمبر 2019

بزم اردو قطر کے زیر اہتمام پلاٹینم جبلی عالمی مشاعرہ

قطر: 60 سالہ قدیم ادبی تنظیم 'بزمِ اردو قطر' کے زیر اہتمام عالمی مشاعرہ پرل راؤنڈ اباؤٹ وکرہ دوحہ کے قریب ڈی پی ایس اسکول کے خوبصورت اور عظیم الشان آڈیٹوریم میں منعقد کیا گیا، جس میں ہندوستان اور پاکستان کے مشہور شعرا نے شرکت کی۔ اس مشاعرے کی صدارت ہندوستان کی ایک مشہور شخصیت کامنا پرساد (بانی جشن بہار ٹرسٹ) نے کی، جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق رکن پارلیمنٹ معروف اداکار شتروگھن سنہا نے شرکت کی۔ خطبہ استقبالیہ پروگرام کے روح رواں بزم کے سرپرست اعلیٰ صبیح بخاری نے پیش کیا۔ پروگرام کے پہلے حصے کی نظامت کے فرائض احمد اشفاق (جنرل سکریٹری) نے انجام دیے اور مشاعرہ کی باضابطہ نظامت ڈاکٹر عنبر عابد کے حصے میں آئی۔ اسٹیج پر موجود شخصیات میں شتروگھن سنہا، صبیح بخاری، کامنا پرساد، مینو بخشی، ڈاکٹر عنبر عابد، ڈاکٹر بسمل عارفی، عمران عامی، اعجاز اسد، ہاشم فیروز آبادی، شاداب اعظمی، فوزیہ رباب، عارف علی عارف اور مقامی شعرا میں شوکت علی ناز، منصور اعظمی، احمد اشفاق نے اپنی موجودگی سے اسٹیج کو رونق بخشی۔ اشفاق نے بخاری کے بارے میں حبیب النبی نے بتایا کہ 32 سالوں سے قطر میں مقیم رہ کر اردو زبان و ادب کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، مختلف ادبی اور نیم ادبی تنظیموں سے وابستگی ہے۔ مزاج میں بے انتہا سادگی ہے، اپنی بے تکلف، سادہ اور پرلطف باتوں سے لوگوں کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ تعارف کے بعد صبیح بخاری نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا، جس میں تمام اہل دوحہ اور خصوصاً مہمانان کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کیا، اپنی گفتگو میں انھوں نے کہا کہ اردو زبان اور مشاعرے لوگوں کے درمیان محبت اور جوڑ پیدا کرتے ہیں۔ اردو زبان صرف زبان ہی نہیں بلکہ ایک معاشرہ ہے، ہم یہاں سے اس مشاعرے کے ذریعے لوگوں کو جوڑنے کا کام کریں گے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ ہے کہ پہلی بار خلیج میں کوئی 60 سالہ ادبی تقریب منائی جارہی ہے اور قطر میں پہلی بار کوئی خاتون مشاعرے کی صدارت فرمارہی ہیں اور یہ بھی پہلی بار ہی ہوگا کہ نظامت بھی کوئی خاتون ہی کریں گی۔ احمد اشفاق نے مہمان خصوصی شتروگھن سنہا کا تعارف پیش کیا۔ شتروگھن سنہا نے امیر قطر، صبیح بخاری، احمد اشفاق اور تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا نیز کامنا پرساد کے بارے میں انھوں نے کہا کہ جس طرح سے انھوں نے اردو سیکھی اور بولنے کا انداز پایا ہے، اس طرح سے اچھے اچھے لوگ بھی نہیں بول پاتے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے انتہائی پرلطف انداز میں اپنے پاکستانی دورے کا ذکر پرلطف انداز میں پیش کیا جس سے سامعین کافی محظوظ ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اکتوبر 2019

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

اردو ہندوستان کی بیٹی ہے، اس کی خوشبو پوری دنیا میں پھیلنی چاہیے
قومی اردو کونسل کے لیے فنڈ کی کمی نہیں ہونے دی جائے گی

قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین اور ڈائرکٹر کے ساتھ جائزہ میٹنگ میں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب رمیش پوکھریال نشنک کا اظہار خیال

نئی دہلی: اردو ہندوستان کی بیٹی ہے اور ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی۔ ہم چاہتے ہیں کہ اردو کی شیرینی اور خوشبو مشک کی طرح پوری دنیا میں پہنچے۔ اس کے لیے جو بھی تعاون ہوگا وہ ہم وزارت کی جانب سے کریں گے۔ اردو کے لیے جتنے فنڈ کی ضرورت ہوگی

ہم مہیا کرائیں گے۔ یہ باتیں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب رمیش پوکھریال نشنک نے قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر اور ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، جناب مظاہر خان (ایگزیکٹیو بورڈ کے ممبر) کے ساتھ جائزہ میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کی اسکیموں کی جانکاری لی اور کونسل کے کاموں پر اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ لوگ کونسل میں اردو کے فروغ کے لیے بہت عمدہ کام کر رہے ہیں لیکن اس میں نئی اسکیموں کا بھی اضافہ ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنی وزارت کے انڈر سکریٹری اور ڈپٹی سکریٹری سے بھی کونسل کو نئی اسکیموں کی تجاویز بھیجنے کی ہدایت دی تاکہ اردو کی ترقی کو رفتار مل سکے۔ وزیر موصوف نے کونسل کے اردو کمپیوٹر کورس CABA-MDTP اسکیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اس کورس سے فارغ طلبا اعلی عہدوں پر فائز ہیں۔ انھوں نے کونسل سے ایسے طلبا کی فہرست طلب کی ہے جو کونسل کے مراکز سے فارغ ہوکر اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم انھیں وزارت میں دعوت دے کر ان کی حوصلہ افزائی کریں گے اور انھیں اعزاز سے نوازیں گے۔ انھوں نے کونسل کے مراکز میں شفافیت لانے کے لیے کہا کہ کونسل کے ڈائرکٹر اور وائس چیئرمین سینٹر والوں کو بغیر اطلاع دیے کمپیوٹر مراکز کا دورہ کریں۔ انھوں نے یہاں تک کہا کہ وہ خود بھی اچانک کسی سینٹر کا دورہ کرسکتے ہیں۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے انھیں اطلاع دی کہ قومی اردو کونسل دارا شکوہ کی فارسی کتابوں کا اردو ترجمہ بھی شائع کرنے والی ہے تو وہ خوش ہوئے اور کہا کہ یہ ایک اچھی پہل ہے۔ دارا شکوہ نے ہندوستانی تہذیب وثقافت پر بہت کچھ لکھا ہے جو فارسی میں ہے، اسے اردو اور دیگر زبانوں میں منظر عام پر لایا جائے۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب اور فلسفہ کو اردو میں ترجمہ کرکے گھر گھر پہنچانا بھی ہماری ذمے داری ہے۔ مدارس میں بھی ایسی کتابوں کا ہونا ضروری ہے تاکہ مدارس کے طلبا بھی ہندوستان کی ثقافت اور فلسفہ سے روشناس ہوسکیں اور انھیں بھی ملازمت میں مساوی مواقع مل سکیں۔

وزیر موصوف نے یہ سن کر طمانیت کا اظہار کیا کہ سابق وزیر اعظم جناب منموہن سنگھ کے دور اقتدار کے آخری پانچ برسوں میں این سی پی یو ایل کو 146 کروڑ کا فنڈ ملا تھا جبکہ موجودہ وزیر اعظم عزت مآب نریندر مودی کے پانچ سال کے اقتدار میں یہ بجٹ بڑھ کر 376 کروڑ روپے کا ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے کو برقرار رکھتے ہوئے قومی اردو کونسل کے لیے فنڈ کی کوئی کمی نہیں ہونے دیں گے۔

اس جائزہ میٹنگ میں وزارت کے سکریٹری، زبانوں کے ڈپٹی و انڈر سکریٹری اور ان کے پی ایس کے علاوہ قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) جناب کمل سنگھ اور جونیئر اکاؤنٹس آفیسر محمد احمد بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 18 ستمبر 2019

حکومت کے تعلیمی مشن کی طرح فروغ اردو کے لیے اردو مشن کو عام کرنے کی ضرورت: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دھلی: موجودہ عہد انفارمیشن اور ٹیکنالوجی کا ہے۔ اب بات ٹیلی ویژن، موبائل، انٹرنیٹ اور واٹس ایپ سے ہوتی ہوئی ویب چینل تک پہنچ گئی ہے۔ عصری تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے قومی اردو کونسل روایتی ڈگر سے ہٹ کر جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے اردو کے فروغ کے لیے کام کرنا چاہتی ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ میٹنگ برائے ماس میڈیا میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج کی میٹنگ میں اردو کے فروغ کے لیے کئی اہم فیصلے لیے

گئے ہیں، جن میں سائبر لائبریری کی تشکیل بھی شامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک ایسی لائبریری ہوگی جس میں اردو کے حوالے سے مختلف موضوعات پر مشتمل مواد وافر مقدار میں دستیاب ہوگا۔ ساتھ ہی اس میں کونسل سے شائع ہونے والے رسالوں کے گزشتہ دس برس کے شماروں کے علاوہ کونسل کی شائع کردہ بیشتر کتابیں بھی ہوں گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل جلد ہی ایک موبائل ایپ بھی تیار کرے گی جس میں اردو لرننگ سے متعلق کہانیاں، نظمیں اور دیگر ضروری چیزیں ہوں گی، ساتھ ہی صحیح تلفظ کے لیے آڈیو ویژول سہولت بھی فراہم کی جائے گی۔ اس موبائل ایپ میں فونیٹک ٹولس کا بھی اہتمام کیا جائے گا جس کی مدد سے اردو کے تقریباً دس ہزار الفاظ کو صحیح مخرج و تلفظ کے ساتھ ادا کیا جاسکے گا۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ افسانے، نظمیں، غزلیں، مشاعرے اور اردو کوئز کے حوالے سے مسابقاتی پروگرام کا انعقاد بھی کیا جائے گا، جس میں دس بہترین شاعروں کا انتخاب کرکے ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان کی ہمت افزائی کی جائے گی اور ان کو انعام واکرام سے بھی نوازا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اسکرپٹ رائٹنگ کے لیے کونسل ایک کتاب شائع کرنے جارہی ہے جس کا مقصد اردو اسکرپٹ رائٹنگ سے دلچسپی پیدا کرنا ہے۔ اسکرپٹ رائٹنگ کے تئیں عوام الناس میں بیداری لانے کے لیے کونسل فلمی دنیا کے تمام اسکرپٹ رائٹرس، موسیقاروں، اداکاروں اور اداکاراؤں کے ساتھ ایک Interactive Session کا بھی انعقاد کرے گی تاکہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اردو کی تشہیر ہوسکے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ جس طرح حکومت تعلیمی مشن چلا رہی ہے، اسی طرح اردو مشن بھی چلانے کی ضرورت ہے اور اس میں خاص طور سے خواتین کو شامل کیا جانا چاہیے، کیونکہ ان کے ذریعے نئی نسل کو اردو سے بہتر طور پر روشناس کرایا جاسکتا ہے۔

اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر این اے کے درّانی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ماس میڈیا کے ذریعے اردو کے فروغ کی راہ ہموار کرنے کے لیے کونسل کے تحت میڈیا افراد کے لیے ایک تربیتی پروگرام منعقد کیا جائے گا۔ پروفیسر اقبال احمد نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے کونسل کے زیر قیادت ملکی سطح پر اردو کارواں نکالا جائے۔ اس سے نہ صرف اردو کا فروغ ہوگا بلکہ خوشگوار ماحول بھی قائم ہوگا اور یہ آج کی ضرورت بھی ہے۔ جناب عبدالسمیع بوبیرے نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے حوالے سے کونسل نے جتنی بھی کوششیں کی ہیں وہ سب کی سب کامیاب رہیں، تاہم موجودہ حالات میں یہ سوال بھی کم اہم نہیں ہے کہ ہم اردو کو عام گھروں تک کیسے پہنچائیں؟ اس تعلق سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ جناب سلیم عارف اور پروفیسر امینہ عباسی نے بھی اردو کے فروغ کے لیے کئی اہم تجاویز پیش کیں جن پر غوروخوض کیا گیا۔

میٹنگ میں جن دیگر حضرات نے شرکت کی ان میں پروفیسر غیاث الرحمن سید، ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر فیاض عالم اور ڈاکٹر شاہد اختر کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 ستمبر 2019

داراشکوہ پروجیکٹ کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: داراشکوہ صلح کل کے علمبردار، فارسی، عربی اور سنسکرت کے متبحر عالم اور تصوف کے رموز واسرار سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ انھوں نے ویدانت کا بہت ہی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ نہایت وسیع المشرب اور کشادہ ذہن کے حامل تھے۔ مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی پر ان کا یقین کامل تھا۔ انھوں نے اسلام اور ہندوازم کے مشترکات کی جستجو کی اور محبت اور انسانیت کے پیغام کو عام کیا۔ وہ قومی یکجہتی اور اتحاد کا ایک نشان امتیاز تھے۔ صوفیا اور رشی منیوں سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے 52 اپنشدوں کا نہ صرف فارسی میں ترجمہ کیا بلکہ انھی کے ترجمے کی وجہ سے باہری دنیا میں اپنشدوں کا مکمل تعارف ہوا۔ آج کے تناظر میں داراشکوہ کی فکر اور فلسفے کی معنویت بڑھ گئی ہے۔ اسی لیے

اردو میں ان کی کتابوں کا ترجمہ بہت ضروری ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ داراشکوہ پروجیکٹ کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس پروجیکٹ کا مقصد یہ ہے کہ داراشکوہ کی تصنیفات کا اردو ترجمہ شائع کیا جائے تاکہ اردو قارئین داراشکوہ کی فکر اور فلسفے سے واقف ہوسکیں۔ مذہبی اور تہذیبی تصادم کے اس عہد میں ہمارے لیے اس نقطۂ اشتراک کی جستجو بہت ضروری ہے جس کی طرف داراشکوہ نے برسوں پہلے اشارہ کیا تھا۔ انھوں نے سیکڑوں برس پہلے بین المذاہب مکالمے کی اہمیت کو سمجھا تھا۔ اس لیے اس مکالمے کو زندہ کرنے کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ اسی مقصد کے تحت ان کی تمام تصنیفات کو قومی اردو کونسل نے اردو میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کہا کہ کونسل کا یہ قدم قابل صد ستائش ہے۔ یہ ایک اہم پروجیکٹ ہے جو کونسل کی تاریخ میں ایک سنگ میل

ثابت ہوگا۔ میٹنگ میں داراشکوہ کی تصانیف: حسنات العارفین، سرِّ اکبر، سفینۃ الاولیاء، سکینۃ الاولیاء، مجمع البحرین، رسالہ حق نما وغیرہ کی اشاعت پر بھی گفتگو کی گئی۔ میٹنگ کے آخر میں کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ اگر کسی نے داراشکوہ پر تحقیقی کام کیا ہے یا کرنا چاہتا ہے تو قومی اردو کونسل ایسے تحقیقی مقالات/کتابوں کو ترجیحی طور پر شائع کرے گی۔

میٹنگ میں پروفیسر آزرمی دخت صفوی کے علاوہ پروفیسر عبدالقادر جعفری (الٰہ آباد)، پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی (مانو، حیدرآباد)، قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر فیروز عالم اور ریسرچ اسسٹنٹ جناب محمد انصر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 19 ستمبر 2019

قومی اردو کونسل کا انٹریکٹیو پروگرام

شیلانگ: اردو پورے ملک میں رابطے کی زبان بن سکتی ہے اور یہ زبان ملک کی تمام قوموں کو ایک دھاگے میں پرو کر رکھ سکتی ہے۔ ہم ملک کے کونے کونے تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ قومی اردو کونسل حکومت ہند کی ایک نوڈل ایجنسی ہے جس کا مقصد پورے ملک میں اردو زبان کو پھیلانا ہے۔ قومی اردو کونسل کے ذریعہ اردو، فارسی و عربی کورس کے علاوہ

کمپیوٹر کورس، گرافک ڈیزائننگ کورس اور خطاطی کے کورس کرائے جاتے ہیں۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے شیلانگ کے اوم شرپی کالج کے آڈیٹوریم میں قومی اردو کونسل کے ذریعہ اوم شرپی کالج اور اجمل فاؤنڈیشن کے اشتراک سے منعقدہ ایک انٹیرکٹیو Interactive پروگرام میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہماری موجودہ حکومت بھی اردو کی ترقی کے تئیں سنجیدہ ہے اور سرکار کا موقف ہے کہ ملک کا ہر طبقہ ترقی کرے اور ہماری سرکار نے قومی اردو کونسل کا بجٹ یوپی اے سرکار کے بجٹ کے مقابلے میں کافی بڑھادیا ہے۔ وزیر برائے فروغ انسانی وسائل نے بھی حال ہی میں ایک خصوصی میٹنگ میں اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ کونسل نئی اسکیمیں بھی نافذ کرے اور ہم کونسل کو اردو کے کاموں کے لیے ہر ممکن تعاون دیں گے۔ اردو کی اسکیموں کو دور دراز کے علاقوں تک پہنچانے پر بھی توجہ دینی ہے اور سب کا ساتھ سب کا وکاس کے مقولے پر عمل کرنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ میگھالیہ میں بھی اردو کا بول بالا ہو اور یہاں کی مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب بھی ریاست میں اپنی شناخت بنائے۔ ہندوستان کی سبھی زبانیں اہمیت کی حامل ہیں اور ہم مقامی زبانوں سے اردو زبان اور اردو زبان سے مقامی زبانوں میں کتابوں کے ترجمے پر بھی کام کریں گے تاکہ زبانوں کے لسانی وتہذیبی روابط سے ہمارے ملک کی سبھی زبانیں مضبوط ہوں اور ان کے آپسی رشتے استوار ہوں۔ اردو زبان ہندوستان میں ہی پیدا ہوئی ہے اور یہ زبان ہمیشہ امن و آشتی اور محبت کے پیغام کو عام کرنے میں پیش پیش رہی ہے۔ ہندوستان کی مختلف قوموں کو ایک دھاگے میں پرونے کے لیے محبت کی زبان اردو کا سیکھنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کا تعارف بھی پیش کیا ساتھ ہی مختلف اسکیموں اور پروگراموں کی تفصیلات بھی بتائیں۔ کونسل کی مختلف اسکیموں، پروگراموں کے لیے شمال مشرقی ریاستوں سے بہت کم درخواستیں موصول ہوتی ہیں اسی لیے ہم نے آج یہاں اس پروگرام کا انعقاد کیا ہے تاکہ یہاں کے اردو جاننے والے بھی ہماری اسکیموں سے فائدہ اٹھائیں اور میگھالیہ جو سب سے زیادہ بارش ہونے کے لیے مشہور ہے اب یہاں سید اللہ صاحب جیسے عاشقان اردو کی کوششوں سے اردو زبان وادب کی بھی برسات ہوگی۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے یہ بھی کہا کہ مقامی لوگوں کو اسکولوں میں اردو زبان کی تدریس و تعلیم کے لیے اپنی اپنی سطح پر بھی کوشش کرنی چاہیے۔ جب تک آپ کوشش نہیں کریں گے تب تک کوئی حل نہیں نکلے گا۔ انھوں نے اپنی جانب سے سرکاری سطح پر بھی کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ یہاں کے لوگوں کو اردو کے پروگرام ریڈیو، ٹی وی، اور انٹرنیٹ کی مدد سے سننے دیکھنے چاہئے کیوں کی اس طرح آپ اردو کے الفاظ کی درست ادائیگی سیکھ سکتے ہیں۔

شیلانگ مسلم یونین اور اوم شرپی کالج کے صدر اور سابق وزیر برائے صحت وکلسٹائل نانگ روم اور قبائلی رہنما جناب سید اللہ نے بھی قومی اردو کونسل کے اس پروگرام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ایسے پروگرام کی ریاست میں سخت ضرورت ہے۔ ہم میگھالیہ میں اردو زبان اور اردو تہذیب کی ترویج واشاعت چاہتے ہیں۔ قومی اردو کونسل سے انھوں نے ریاست میں مشاعرے، شام غزل جیسے کلچرل پروگرام کرانے کی درخواست کی تاکہ ریاست میں اردو کے تئیں ماحول سازگار ہو۔ پروگرام کی ایک قابل ذکر بات یہ رہی کہ وہاں کی سرکاری زبان انگریزی ہونے کے باوجود سبھی مقررین نے اردو میں ہی اظہار خیال کیا۔

اس پروگرام میں اجمل فاؤنڈیشن کے منیجر (ناظم) ڈاکٹر ایم آر ایچ آزاد، شیلانگ مسلم یونین کے نائب صدر مون اسٹار شانگ یلانگ، نیہو یونیورسٹی کے پروفیسر حسن عسکری، ڈاکٹر عرفان احمد کے علاوہ نارتھ ایسٹ اسٹیٹ کے مدارس، غیر سرکاری تنظیموں اور دیگر اداروں کے سربراہان بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 22 ستمبر 2019

عربی زبان پینل کی میٹنگ

نئی دهلی: ہندوستان کی تہذیب وثقافت اور قدیم فلسفہ سے عالم عرب کو روشناس کرانے کی ضرورت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسی لیے کونسل ہندوستان کی تہذیب وثقافت اور فلسفے پر مبنی کتابوں کی اشاعت پر زور دے گی۔ یہ باتیں صدر دفتر میں منعقدہ عربی زبان

پینل کی میٹنگ میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل کو عربی میں کتابیں شائع کرنے کا گو کہ مینڈیٹ نہیں ملا ہے مگر عربی زبان میں کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی تعاون فراہم کرتی ہے۔ اب کونسل اس

مینڈٹ کو حاصل کرنے کے لیے ایگزیکیٹو بورڈ کی میٹنگ میں ایجنڈا رکھے گی۔ انھوں نے کہا کہ عالم عرب کے بازار تک کتابوں کی فروخت کے لیے ماحول سازگار کیا جائے گا تا کہ عالم عرب کو ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب وثقافت اور ہندوستانی فلسفے سے روبرو کرایا جاسکے۔ اس حوالے سے حکومت ہند بھی بہت سنجیدہ ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ عرب ممالک میں قومی اردو کونسل کی کتابوں کی فروخت کی اجازت نہیں ہے، ہمیں حکومت ہند سے اس بابت بھی گزارش کرنی ہوگی۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے مزید کہا کہ جس طرح داراشکوہ کی فارسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا جارہا ہے اسی طرح عربی زبان کے ماہرین کی مدد سے داراشکوہ کی کتابوں کا عربی میں بھی ترجمہ کرایا جائے گا اس سے عالم عرب اور ہندوستان کے درمیان رشتوں میں اور مضبوطی آئے گی۔

میٹنگ کی صدارت پروفیسر نعمان خان نے کی۔ انھوں نے عربی پینل کی کارکردگی کا جائزہ لیا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ عنقریب تاریخ ادب عربی، اور ہندوستان میں عربی زبان وادب کی تاریخ شائع ہوکر منظر عام پر آجائے گی۔ جب کہ 'مشاہیر ادبیات مشرق' اور 'اردو زبان وادب پر عربی کے اثرات' یہ دونوں کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ممبران نے بھی کئی تجاویز رکھیں جن پر غور وخوض کیا گیا۔ آخر میں ڈاکٹر ایوب صدیقی (حیدرآباد) کی موت پر دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

میٹنگ میں جن حضرات نے شرکت کی ان میں پروفیسر حسنین اختر، پروفیسر مسعود انور علوی، پروفیسر رضوان الرحمٰن، ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی، ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی، ڈاکٹر مشیر حسین صدیقی، ڈاکٹر حسین پی کے مدلاور، مولانا علاء الدین ندوی، ڈاکٹر محمد قطب الدین کے علاوہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر فیروز عالم، محترمہ آبگینہ عارف، اور ڈاکٹر شاہد اختر کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 ستمبر 2019

مالی تعاون اسکیم گرانٹ ان ایڈ کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کی مالی اسکیموں سے ملک کی مختلف ریاستوں کے اردو سے وابستہ افراد اور ادارے مستفید ہورہے ہیں، البتہ جنوبی ہند کی ریاستوں سے مالی تعاون کے لیے درخواستیں کم موصول ہوتی ہیں۔ اس لیے مالی تعاون کے لیے ان علاقوں سے

آنے والی درخواستوں کو ترجیحی طور پر منظور کیا جائے گا۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے گرانٹ ان ایڈ کی میٹنگ میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ معیاری مسودات اور کاموں پر خاص طور پر توجہ دی جائے گی، نیز ایسے ادارے اور این جی اوز جن کی کارکردگی بہتر رہی ہے، ان کی درخواستوں کو کونسل کے ضابطوں کے تحت پوری شفافیت سے فوقیت دی جائے گی۔

اس میٹنگ میں سیمناروں، کانفرنسوں، ورکشاپوں، مشاعروں، ریسرچ پروجیکٹوں

اور اردو، عربی وفارسی مسودوں کی اشاعت سے متعلق درخواستوں پر غور کیا گیا اور موصول ہونے والی بہت سی درخواستوں کو بجٹ کی مناسبت سے منظوری دی گئی۔ میٹنگ کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی۔ جب کہ پروفیسر ایس حسنین اختر، پروفیسر عراق رضا زیدی، ایم این سعید، ڈاکٹر کے سی عطاء اللہ خاں، ڈاکٹر نصیب علی، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر انوار حسین، جناب نصیر افسر کے علاوہ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ڈاکٹر فیروز عالم، جناب محمد شہاب الدین اور ڈاکٹر شاہد اختر نے میٹنگ میں شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 اکتوبر 2019

لسانیات اور سماجی لسانیات پینل کی میٹنگ

نئی دھلی: عہد حاضر میں دنیا ایک گلوبل ولیج کی شکل میں تبدیل ہوگئی ہے جس کے سبب علاقائی بولیوں اور زبانوں کا دائرہ محدود ہوتا جارہا ہے۔ ایسے میں زبانوں کا تحفظ ایک اہم مسئلہ ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک میں لسانیات کے حوالے سے بنیادی کام ہورہے ہیں۔ جب کہ ہمارے ملک میں اس جانب کم توجہ دی گئی ہے۔

حالانکہ ہندوستان کثیر لسانی اور تکثیری ملک ہے۔ یہاں اس طرف نسبتاً زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے کونسل ترجیحاً اردو لغت نویسی، اصول فرہنگ نویسی اور اصطلاحات جیسے موضوعات پر گذشتہ کئی سالوں سے کام کررہی ہے۔ اسی سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے لغات کو اردو میں ترجمہ کے لیے ایک مثبت لائحۂ عمل تیار کیا گیا ہے۔ یہ باتیں کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ لسانیات اور سماجی لسانیات پینل کی میٹنگ میں کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ کونسل اردو کشمیری، اردو ڈوگری، اردو لداخی، اردو تیلگو، اردو مراٹھی، اردو ملیالم اور اردو پنجابی ڈکشنری پر کام شروع کرنے جارہی ہے۔ کونسل اردو اور کنڑ سہ لسانی لغت شائع کرچکی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جامع انگریزی اردو لغت جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے، اشاعت ثانی کے لیے تیار ہے۔ انھوں نے اردو کے علاقائی روپ کے حوالے سے کی جارہی کوششوں پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اس موقع پر اس پینل کے دو اہم رکن پروفیسر اقتدار حسین علی گڑھ اور پروفیسر اومکار ناتھ کول ڈی یو کی وفات پر دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

پروفیسر ابوذر عثمانی نے میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں لسانیات پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کونسل نے اس تعلق سے کئی اہم فیصلے لیے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل ملک کی دوسری زبانوں کو اردو سے جوڑنے پر غور کررہی ہے۔ اس موقع پر ماہر لسانیات پروفیسر نذیر احمد نے کہا کہ اردو لسانیات کے حوالے سے ہندوستان میں جو بھی کام ہورہا ہے، اس میں سب سے بڑی خدمات قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ہیں۔ اس پینل کے رکن پروفیسر اعجاز احمد شیخ نے بھی کئی تجاویز پیش کیں جن پر غور وخوض کیا گیا۔ میٹنگ میں ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (ڈائریکٹر اسسٹنٹ اکیڈمک)، ڈاکٹر

فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، جناب محمد شہاب الدین (ریسرچ اسسٹنٹ) اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔ پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 اکتوبر 2019

تھوک خریداری اسکیم کی میٹنگ

نئی دھلی: اردو کے وہ ادیب اور مصنفین جنھیں ادبی دنیا نے بھلا دیا ہے یا مالی

کمزوری کی وجہ سے کتابوں کو شائع کرنے سے محروم ہیں، کونسل ترجیحی طور پر ایسے قلمکاروں اور ادیبوں کی مالی اعانت کرتی ہے۔ واضح ہو کہ ہر سال کونسل میں کتابوں کی خریداری کے لیے آنے والی درخواستوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سال قلمکاروں کو مالی تعاون اسکیم کے تحت تھوک کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں لگ بھگ سات سو کتابوں کی درخواستیں موصول ہوئی تھیں، جن میں سے تقریباً 350 کتابوں کو تھوک خریداری اسکیم کے تحت منظوری دی گئی۔ یہ کام پینل کے ممبران نے انتہائی شفافیت اور غیر جانبداری سے انجام دیا۔ اس اسکیم کا مقصد اردو، عربی اور فارسی کے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ تھوک کتابوں کی خریداری کی میٹنگ میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل ملک کا ایک بڑا ادارہ ہے، جو فائدے اور نقصان سے بالاتر ہو کر ہر سال کتابوں کی تھوک خریداری کرتا ہے، پھر ان کتابوں کو ملک کی مختلف ریاستوں کی لائبریریوں کو بطور ہدیہ ارسال کرتا ہے۔ تاکہ ملک کے طول و عرض میں موجود اردو کے قارئین ان کتابوں سے استفادہ کر سکیں۔

میٹنگ کی صدارت پروفیسر ایم ڈی شوکت نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اس اسکیم سے یقیناً حاشیہ پر کھڑے قلمکاروں اور ادیبوں کو فائدہ پہنچے گا اور پوری دلجمعی کے ساتھ وہ اردو کی خدمت کر سکیں گے۔ میٹنگ میں جن حضرات نے شرکت کی ان کے نام اس طرح ہیں: ڈاکٹر کیول دھیر، پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر علیم اشرف، ڈاکٹر ریاض احمد، ڈاکٹر نعیم انیس، ڈاکٹر رضوان الرحمٰن کے علاوہ کونسل سے ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ڈاکٹر فیروز عالم، محترمہ شہناز اختر، محترمہ فرح دیبا اور ڈاکٹر شاہد اختر۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 اکتوبر 2019

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

شکیل الرحمٰن اور ادب کی جمالیات

موتیہاری: دیہات اور قصبات میں اردو پھیلانا ہمارا مقصد ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ زیادہ تر ادبی و ثقافتی سرگرمیاں مراکز میں محصور ہو کر رہ گئی ہیں، ہمیں دیہات اور مراکز سے دور گاؤں اور قصبات کو ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا محور بنانا ہے۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد نے این سی پی یو ایل اور ایم ایس کالج موتیہاری کے زیر اہتمام 'شکیل الرحمٰن اور ادب کی جمالیات' کے موضوع پر کالج میں منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار کے پہلے سیشن میں بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے باپو کے میدان عمل موتیہاری، مشرقی چمپارن میں دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کر کے اپنے عزم کو پورا کیا ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر موجود شرکا کو یقین دہانی کراتے ہوئے کہا کہ این سی پی یو ایل کے پروگرامس کو راجدھانی اور بڑے شہروں تک محدود کرنے کے بجائے ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک لے جانا ہے اور این سی پی یو ایل کے ہر ایک منصوبے کو گھر گھر پہنچانا ہے تاکہ اس کے دور رس نتائج برآمد ہوں اور اردو کی ترقی کما حقہ ترقی ہو سکے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر عقیل احمد نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایم ایس کالج موتیہاری سے شکیل الرحمٰن کا تعلق طالب علمی سے رہا ہے۔ بہار یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر سرفراز ہونے کے بعد بھی ان کا رشتہ اس کالج سے رہا ہے اور آج ان کے مادر علمی میں شکیل الرحمٰن

اور ادب کی جمالیات کے موضوع پر سیمینار ہو رہا ہے۔ اس عمل سے یقیناً ان کی روح کو خوشی مل رہی ہوگی۔ سیمینار کی صدارت کر رہے پروفیسر انور پاشا، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نے ادب اور جمالیات پر تفصیلی بات کی۔ صدر محترم نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ کائنات میں جو خوبصورتی اور جمالیات پائی جاتی ہیں وہ خدائی جلوہ ہیں، اور ادب میں جو جمالیات پائی جاتی ہیں اس کا ذریعہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی خوبصورتی ہے، مسٹر پاشا نے کہا کہ شکیل الرحمٰن کی ادبی جمالیات کو خدائی خوبصورتی کے ساتھ جوڑ کر دیکھیں۔ اس موقعے پر پروفیسر کوثر مظہری نے ادب اور جمالیات کے سبھی نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے شکیل الرحمٰن کی کتابوں میں جمالیات کا اظہار کیا۔ اس سیمینار کی نظامت تفضیل احمد تفضیل نے کی۔ پروگرام کا دوسرا سیشن ڈھائی بجے دن میں شروع ہوا جس میں پروفیسر توقیر احمد، ڈاکٹر ظفر کمالی، ڈاکٹر حامد علی خان، ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی، پروفیسر فصیح الدین احمد، سید شاہ حسین احمد، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر رضوان اللہ، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے شکیل الرحمٰن اور ادب کی جمالیات کے موضوع پر مقالے پیش کیے۔

بابائے جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن ہندوستانی جمالیات کا تنقیدی استعارہ بن چکے ہیں۔ انھوں نے

ادب اور فنون لطیفہ کی جمالیاتی جہتوں سے اردو کے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔ 'ہندوستانی جمالیات' میں ہندوستان کی ہزاروں سال پرانی تہذیبی جمالیات کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ہندوستان جمالیاتی سطح پر دیگر ممالک سے زیادہ زندہ وتابندہ نظر آتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے موتیہاری کے ایم ایس کالج میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام 'پروفیسر شکیل الرحمٰن اور ادب کی جمالیات' کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ سمینار کے دوسرے دن خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ جمالیات ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی تعریف وتوضیح پیش کرنا انتہائی مشکل کام ہے کیونکہ اس میں اتنی تہیں اور جہتیں پائی جاتی ہیں کہ ان کی تہوں اور جہتوں کو کھولنا اور ان پر روشنی ڈالنے کا کام کبھی ختم نہیں ہوسکتا ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن جیسی نابغہ روزگار شخصیت کے افکار ونظریات سے لوگوں کو روشناس کرانا وقت کا اہم تقاضہ ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل دو دنوں تک اس سمینار میں مسلسل موجود رہے۔

سمینار کا تیسرا اور چوتھا سیشن سنیچر کی صبح دس بجے سے اسمارٹ کلاس میں شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر کوثر مظہری وی ایم آرٹس کالج کے پرنسپل پروفیسر مشتاق احمد نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر رضوان اللہ آروی، پروفیسر آفتاب اشرف، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ڈاکٹر سلمان احمد، تفضیل احمد تفضیل، فاروق راہب، انور شمیم، عزیز انجم، پروفیسر عطاء اللہ، شازیہ کمال نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر توقیر عالم نے قومی سمینار کے انعقاد کے لیے این سی پی یو ایل کی ستائش کرتے ہوئے دیہی علاقوں میں اس طرح کے پروگرام کے انعقاد پر زور دیا۔ صدارت کرتے ہوئے پروفیسر کوثر مظہری نے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر شکیل نے ادب کے مختلف گوشوں پر کام کیا۔ ادب کے طلبہ کو ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔ پروفیسر مشتاق نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ڈاکٹر شکیل کو سنسکرت سے گہری دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا نقش نظر آتا ہے۔ ایک نئے موضوع پر سمینار کا انعقاد کرا این سی پی یو ایل نے ایک نیا گوشہ وا کیا ہے۔ اس موقعے پر این سی پی یو ایل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، فیاض احمد، پروفیسر ایم این حق، پرنسپل پروفیسر پردیپ کمار، پروفیسر ارون کمار، خورشید امام، راشد فرحان، ڈاکٹر صبا اختر شوخ، ڈاکٹر قاسم انصاری، طارق انور چمپارنی سمیت بڑی تعداد میں دانشوران شہرت نے شرکت کی۔

فروغ اردو کے لیے عملی اقدامات وقت کا تقاضا

نظام آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی موبائل وین جو کہ اردو کتابوں کی نمائش وفروخت کے لیے چلائی جارہی ہے وہ صبح 9 بجے قلعہ روڈ نظام آباد پہنچی۔ جہاں ڈاکٹر عبدالعزیز سہیل، ڈاکٹر ضامن علی حسرت، ایم اے مقیت، حلیم قمر، محمد جاوید، محمد عثمان، محمد یٰسین، رفیق قریشی، خلیل احمد اور دیگر متعدد شخصیات نے اس وین کا استقبال کیا۔ قلعہ روڈ نزد کریسنٹ گرلز کالج پر صبح 9 تا شام 4 بجے وین میں موجود اردو کتابوں کو مشاہدہ اور فروخت کے لیے رکھا گیا۔ اس موقعے پر میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے ڈاکٹر عزیز سہیل نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی کتاب موبائل وین کا نظام آباد میں پہنچنے پر ہم استقبال کرتے ہیں۔ یہ موبائل وین اردو زبان کے فروغ خاص کر اردو طلبہ، ریسرچ اسکالرس کے لیے فائدہ مند ہے۔ اس موبائل وین کے ذریعے مختلف علوم پر مشتمل اردو کتابیں دستیاب کرائی جارہی ہیں اور رعایت پر یہ کتابیں طلبہ کے لیے دستیاب ہیں۔ NCPUL اردو کے فروغ کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا آرہا ہے اور مختلف اسکیموں کے ذریعے فروغ اردو کے لیے کوشش کی جاری ہے۔ حلیم قمر نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان وادب کو فروغ دینے کے لیے باہمی اتحاد ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ایک دوسرے کے تعاون سے عملی اقدامات انجام دیے جانے چاہئیں۔ اردو کو زندہ رکھنا ہمارا اخلاقی فریضہ ہے، چونکہ ہماری تاریخ، تہذیب وتمدن ان کتابوں میں محفوظ ہے جس سے نسل نو کو واقف کرانا ضروری ہے۔ عبدالمقیت سابق کارپوریٹر نے کہا کہ اردو کتابیں آپ کے گھر کی دہلیز تک قومی کونسل پہنچا رہی ہے، اردو داں طبقے کو چاہیے کہ ان سے استفادہ کرے۔ اس موقعے پر رضی الدین لکچرار، ڈاکٹر عبدالقوی اسسٹنٹ پروفیسر، سید وسیم، شرجیل پرویز (تحریک نفاذ اردو)، عبدالوحید، سید جاوید، ریسرچ اسکالرس، شعرا، اساتذہ برادری، صحافیوں کے علاوہ طلبا وطالبات کی کثیر تعداد نے اردو کتاب کا مشاہدہ کیا اور اپنے ذوق کے مطابق کتابیں بھی خریدیں۔

روزنامہ 'صحافی' دکن، 14 اکتوبر 2019

سمینار کے آخری سیشن میں مشاعرہ ہوا۔ مشاعرے کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر کوثر مظہری نے اور نظامت سماجی کارکن وصحافی عزیز انجم نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 ستمبر، 'قومی تنظیم' پٹنہ 30 ستمبر 2019

پروفیسر خورشید الاسلام کا صد سالہ یوم پیدائش

دیو بند: رابعہ صبیحہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کلیر اور فروغ اردو کونسل حکومت ہند کے اشتراک سے مرحوم پروفیسر خورشید الاسلام کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقعے پر ان کی ادبی اور تنقیدی خدمات کے موضوع پر اردو سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کے معروف ادیبوں، شاعروں، سیاست دانوں، علما اور دانشوروں نے پروفیسر خورشید الاسلام کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ایم ایل اے اور اتراکھنڈ اسمبلی میں آئی ٹی سیل کے چیئرمین دیش راج کرن وال نے مہمان خصوصی کے طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کی طرف سے اردو کے فروغ اور درس وتدریس کے لیے بڑے پیمانے پر مختلف اداروں کو گرانٹ دی جارہی ہے۔ خاص طور سے اقلیتی اداروں کو اردو تعلیم کے لیے مالی امداد اتراکھنڈ حکومت کی جانب سے فراہم کی جارہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اتراکھنڈ اسمبلی میں انھوں نے اردو مدرسوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے کئی مرتبہ سوالات اٹھائے جس پر صوبہ کی حکومت نے عمل بھی کیا۔ اتراکھنڈ کے پی سی ایس آفیسر اور روڈ کی اوقاف کے سی ای او ڈاکٹر تنظیم علی نے کہا کہ اردو تعلیم کے ذریعے ہم اپنے سماج اور اپنے گھر کو تہذیب یافتہ بنا سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ تہذیب بھی ہے۔ ڈاکٹر تنظیم علی نے کہا کہ ہمارے مدارس میں اردو اور عربی کے ساتھ دنیاوی تعلیم انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں کی تعلیم بھی دی جانی چاہیے۔ علما کونسل اتراکھنڈ کے چیئرمین اور مدرسہ دارالسلام لاٹر دیوا کے صدر قاری شمیم احمد نے کہا کہ اب مدارس میں جدید تعلیم اور تعلیم نسواں پر بھی خاصی توجہ دی جارہی ہے۔ جمعیۃ علما، اتراکھنڈ کے صدر مفتی ریاست علی نے کہا کہ اردو کے بغیر ہماری دینی تعلیم اور مذہبی امور نامکمل ہیں، اس لیے ہمیں اپنے معاشرے میں اردو کے فروغ کے لیے تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ اتراکھنڈ اردو اکادمی کے بانی نائب صدر اور عالمی شہرت یافتہ شاعر افضل منگلوری نے سمینار میں مہمان ذی وقار کی حیثیت سے بولتے ہوئے کہا کہ اردو کا جنم ہندوستان میں خانقاہوں میں ہوا اور حضرت امیر خسرو نے اردو زبان کو عوامی زبان بنایا اور آسان زبان میں شاعری اور اپنے کلام کے ذریعے سے عوام کو جوڑنے کی کوشش کی، اس لیے ہم اردو کو زبان خسروی بھی کہتے ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 2 اکتوبر 2019

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

بچوں کا ادب: سمت و رفتار

نئی دھلی: ماہنامہ 'گل بوٹے'، ممبئی سلور جبلی تقریبات کے شاندار آغاز کے بعد چار روزہ عالمی سمینار کا آغاز ہوا، سمینار کا افتتاحی جلسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد ہوا جس میں کناڈا سے تشریف لانے والے بچوں کے مشہور ادیب پروفیسر ادریس صدیقی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں

نے بچوں کی کہانیوں کی چھ ہزار سالہ تاریخ کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ 'بچوں کا ادب یا کہانیاں ہر دور میں موجود رہی ہیں، اس کی شکل اور پیش کش بدلتی رہی ہے۔ پروفیسر صدیقی نے سمینار کی سمت و رفتار کا تعین کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں بھی بچوں کے بدلتے مزاج کے مطابق کہانی اور بچوں کے ادب کی پیش کش کو بدلنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ جو بچے انٹرنیٹ کی وجہ سے کہانیوں سے دور ہوگئے ہیں انھیں ادب کی طرف واپس لانے کے لیے جدید وسائل کا استعمال کرنا ہوگا۔ سمینار میں اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے پروفیسر صدیقی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ چار ہزار سال پہلے سے کہانیاں رائج ہیں اور ان کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑوں کے لیے لکھنے والے بچوں پر بھی توجہ دیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے افتتاحی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ گل بوٹے جیسے ادارے کی خدمات قابل ستائش ہیں۔ انھوں نے گل بوٹے کے ایڈیٹر فاروق سید کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے پروفیسروں کو ایوارڈ دینے کے بجائے ان جیسے اردو کے خادموں کو ایوارڈ ملنا چاہیے۔ انھوں نے اردو کی بنیادی تعلیم کو اسکولوں میں پھر سے شروع کرانے کے لیے کونسل کی کوششوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ادب اسی وقت زندہ رہے گا جب زبان زندہ رہے گی۔ ابتدائی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے صدر شعبہ اردو پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ ہم ادارہ گل بوٹے کے شکرگزار ہیں کہ اس نے اپنی سلور جبلی تقریبات کے لیے جامعہ ملیہ کا انتخاب کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں نے ہمیشہ بچوں کے ادب کو اہمیت دی، جس کا اثر جامعہ کے تعلیمی نظام میں آج بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ افتتاحی جلسے میں پروفیسر عتیق اللہ، بچوں کے ادیب غلام حیدر، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر محمد اختر صدیقی اور قاضی مشتاق احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کے دوران مہاراشٹر سے آئے شاعر عرفان شاہ نوری کے شعری مجموعے 'حاشیے میں نیکیاں' کی رسم اجرا بھی انجام پائی۔ افتتاحی جلسے کی نظامت ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔

جامعہ میں منعقد سمینار کا پہلا سیشن پروفیسر احمد محفوظ اور قاضی مشتاق احمد (پونہ) کی صدارت میں 'بچوں کے ادب کی اہمیت، غرض و غایت' کے عنوان کے تحت منعقد ہوا۔ اس سیشن میں اسلم جاوداں نے افتتاحی کلمات پیش کیے۔ عذرا نقوی، ڈاکٹر عادل حیات، ڈاکٹر جاوید حسن اور ڈاکٹر عبدالحی نے مختلف عناوین پر مقالات پیش کیے اور نظامت ڈاکٹر شاہنواز فیاض نے کی۔ سمینار کا دوسرا سیشن 'ادب اطفال کا بدلتا منظرنامہ' کے زیرعنوان منعقد ہوا۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر کوثر مظہری اور فیروز بخت نے انجام دی۔ معروف ادیب رونق جمال نے افتتاحی کلمات پیش کیے۔ ستار فیضی، ڈاکٹر ثاقب عمران اور غزالہ فاطمہ ڈاکٹر رضوان الحق نے مقالات پیش کیے اور نظامت ڈاکٹر سمیع احمد نے کی۔ جامعہ میں تیسرا سیشن معروف افسانہ نگار ڈاکٹر خالد جاوید کی صدارت میں بعنوان 'ادب اطفال میں امکانات' منعقد ہوا۔ اس سیشن میں محمد اسلم پرویز، ڈاکٹر نثار احمد، ڈاکٹر زاہد ندیم احسن اور ڈاکٹر عمران نے مقالات پیش کے جن پر ڈاکٹر خالد جاوید نے بصیرت افروز تقریر کی۔ اس سیشن کے نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد مقیم نے انجام دیے۔ پہلے دن کے تینوں کامیاب سیشنوں کے بعد صفدر ہاشمی ایمفی تھیٹر میں کلچرل پروگرام کے تحت داستان گوئی کا خصوصی پروگرام منعقد ہوا جسے داستان گوئی کلیکٹیو نامی گروپ نے پیش کیا۔ بطور داستان گو عینی فاروقی اور نصرت انصاری نے سامعین کو اپنے سحر میں گرفتار کرلیا۔ افتتاحی کلمات ڈاکٹر مصطفیٰ پنجابی نے ادا کیے۔

گل بوٹے سلور جبلی تقریبات کے تیسرے دن دہلی یونیورسٹی اور چوتھے دن جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں اجلاس منعقد ہوئے جس میں بچوں کے ادب سے متعلق مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے گئے۔

عالمی کانفرنس کا اختتامی اجلاس اردو اکادمی دہلی میں منعقد ہوا جہاں اردو اکادمی کی طرف سے ٹیم گل بوٹے اور عالمی سمینار میں شریک تمام مندوبین کو استقبالیہ دیا گیا۔ پروگرام کی صدارت وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے فرمائی جبکہ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے دہلی کے نائب وزیراعلی منیش سسودیا، عام آدمی پارٹی کے ترجمان اور بچوں کے ادیب دلیپ پانڈے، اردو اکادمی کے سکریٹری ایس ایم علی، گل بوٹے کے مدیر فاروق سید، خان نویدالحق اور آصف اعظمی موجود تھے۔ اس موقعے پر نائب وزیراعلی کے ہاتھوں گل بوٹے کی 25 کتابوں اور بچوں کے ادیبوں کی اولین ڈائرکٹری کے اجرا کی تقریب منائی گئی۔ فاروق سید نے اپنے پچیس سالہ سفر کی مختصر روداد پیش کرتے ہوئے اپنے اور بچوں کے ادیبوں کے استقبال پر دہلی حکومت اور اردو اکادمی کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض آصف اقبال نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، 'انقلاب' 25، 30 ستمبر 2019

داستانِ مرثیہ: کربلا سے کاشی تک

نئی دهلی: جشن بہار ٹرسٹ کے زیر اہتمام مرثیہ نگاری کے ادبی سفر پر مبنی ایک منفرد ثقافتی پروگرام لودھی روڈ میں واقع انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے بی ایس عبدالرحمٰن

آڈیٹوریم میں منعقد کیا گیا۔ ہندوستانی تہذیب اور اردو زبان و ادب کے خدمت گار 'جشن بہار ٹرسٹ' کے بینر تلے منعقد پروگرام کا عنوان تھا 'داستان مرثیہ: کربلا سے کاشی تک' اور کہانی تھی مرثیہ نگاری کے ادبی سفر کی۔ بتادیں کہ 'داستان مرثیہ: کربلا سے کاشی تک' کی اسکرپٹ اور ڈائریکشن کا سامنا پرساد اور اپرنا شریواستو ریڈی نے کی اور ہندوستان کی پہلی خاتون داستان گو فوزیہ، نوجوان داستان گو فیروز خان اور نوجوان شاعر پلو مشرا نے اسے اپنے خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ اس دوران پروگرام میں موجود شرکا نے مرثیہ کے سفر کی خوبصورت پیش کش کو خوب سراہا اور جشن بہار ٹرسٹ کی طرف سے اردو ادب کی آبیاری کے لیے کی جارہی کاوشوں کو قابل تقلید بتایا اور کامنا پرساد کی خدمات کی ستائش کی۔ قبل ازیں پروگرام کی روح رواں و جشن بہار ٹرسٹ کی بانی محترمہ کامنا پرساد نے استقبالیہ کلمات میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ یہ سفر واقعی کربلا سے کاشی تک کا ہے، گوتم بدھ سے گاندھی تک، اگر ہند میں اہنسا کا نعرہ گونجتا رہا ہے تو حضرت امام حسین نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ جنگ نہیں چاہتے۔ ستیہ اور اہنسا کی اس دھرتی نے بھی کربلا کے پیغام کو کھلے دل سے اپنا لیا اور مرثیہ کے ادبی سفر کی داستان یہی بتاتی ہے۔ پروگرام میں بحیثیت مہمان خصوصی سابق نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر محمد حامد انصاری نے اپنے خطاب میں کہا کہ قدیم، موزوں اور ہر دور میں اثردار، مرثیہ اردو شاعری کی ایسی صنف ہے جو زمان و مکان سے ماورا حساس دلوں کو اس المیے سے جوڑے رکھتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مرثیہ خوانی ادب کا ایک اہم جز بن گئی ہے اور یہ ہندوستان میں ہی پروان پائی۔ اس اسٹیج شو میں جہاں داستان گوئی میں قدیم اور جدید کی آمیزش نظر آرہی تھی، وہیں صنف مرثیہ کے ارتقائی سفر کی عکاسی کرتی ہوئی خصوصی نمائش ہندوستان کی سماجی وثقافتی فضا اور اتحاد سے بھرپور ادب و تہذیب کی حقیقت بیان کررہی تھی۔ پروگرام کا انعقاد 'موراکا فاؤنڈیشن' اور 'شگفتہ ایجوکیشنل سوسائٹی' کے باہمی اشتراک سے عمل میں آیا۔ تقریب میں سابق لوک سبھا سابق اسپیکر میرا کمار، روزنامہ راشٹریہ سہارا اور عالمی سہارا نیوز چینل کے گروپ ایڈیٹر ڈاکٹر جسیم محمد، جامعہ کے سابق وی سی سید شاہد مہدی، آئی آئی سی سی کے نائب صدر ایس ایم خان، پدم شری ڈاکٹر محسن ولی، ریٹائرڈ آئی ایف ایس پروفیسر ذکر الرحمٰن، قمر احمد (سابق آئی پی ایس)، ابرار احمد (سابق آئی آر ایس)، اے ایم یو کے سابق وی سی لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ، اسپینش زبان کی ٹیچر و معروف شاعرہ پروفیسر مینو بخشی، پارلیمنٹ جامع مسجد کے خطیب و امام مولانا محب اللہ ندوی، معروف ادیب ڈاکٹر حفظ الرحمٰن کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ اہم شخصیات موجود تھیں۔

'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 ستمبر 2019

مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا احمد سعید دہلوی پر دو روزہ سمینار

نئی دهلی: جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام مولانا محمد عبدالباری فرنگی محلی بانی و رکن جمعیۃ علماء ہند اور مولانا احمد سعید دہلوی سابق ناظم عمومی و بعدہ صدر جمعیۃ علماء ہند کی حیات و کارنامے پر جاری دو روزہ سمینار میں مقالہ نگاروں نے دونوں شخصیات کے شش جہات پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر مفتی محمد سلمان منصور پوری نے اپنے خطاب میں کہا کہ ان بزرگوں نے خون جگر سے جمعیۃ علماء کی آبیاری کی۔ جب انگریزوں کے خلاف بولنے کا تصور نہیں کیا جاتا تھا، ایسے دور میں جمعیت کا قیام عمل میں آیا۔ پروفیسر عبدالحق نے مولانا احمد سعید دہلوی کی ہمہ گیر شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جہاں وہ شاعری میں راسخ دہلوی سے اصلاح لیتے تھے، وہیں وہ علم دین میں وہ مفتی اعظم مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے جہاں قرآن کریم کی تفسیر لکھی، وہیں افسانہ بھی لکھا۔ مشہور مورخ پروفیسر ظہیرالحسن جعفری نے جمعیۃ علماء ہند کی صد سالہ تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اپنے بزرگوں کے خیالات اور کارناموں کو جمع کرنا ایک قابل ستائش قدم ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے صدی تقریبات میں اپنے بزرگوں کو یاد کرنے کے لیے جمعیۃ علماء کی تحسین کی، پروفیسر نعمان نے دینی مدارس اور یونیورسٹی کے درمیان فاصلے کو پاٹنے پر زور دیا اور کہا کہ آج کے اجلاس میں جس طرح سبھی طبقوں کے دانشور جمع ہیں یہ بہت ہی اچھی علامت ہے۔ گلزار دہلوی نے اپنے ہم عصر مولانا احمد سعید دہلوی کی عظمت کو شاعری اور نثری پیرائے میں پیش کیا۔ ان کے علاوہ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی، مفتی محمد عفان منصور پوری، ڈاکٹر مسعود حسن اعظمی، مفتی اختر امام عادل، مولانا ضیاء الحق خیر آبادی، ڈاکٹر جسیم الدین سمیت پچاس سے زائد مقالہ نگاروں نے بھی اپنی نگارشات پیش کیں۔ اخیر میں صدر جمہوریہ جمعیۃ علماء ہند مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری نے اپنے خطاب میں جمعیۃ علماء ہند کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہم اپنے بزرگوں کی زندگی کا مطالعہ کرکے موجودہ وقت میں درپیش مسائل کا حل نکال سکتے ہیں۔ انھوں نے مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ حضرات نے جمعیۃ علماء ہند پر ہی نہیں بلکہ پوری ملت پر احسان کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جمعیۃ علماء ہند سرگرم سیاست میں حصہ نہیں لیتی لیکن وہ خدمت پر مبنی سیاست کرتی ہے۔ دوسری نشست کی نظامت مولانا عمران اللہ قاسمی کنوینر سمینار مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور صبح کی دونوں نشستوں کی نظامت ڈاکٹر عبدالملک رسول پوری نے کی۔ اس موقعے پر اہم شخصیات نے پرمغز مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 ستمبر 2019

عربی اور عبرانی زبان کا رشتہ

نئی دهلی: شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 'موجودہ تناظر میں عربی اور عبرانی زبان کا رشتہ' کے

موضوع پر شعبۂ عربی کی ڈاکٹر عبدالعلیم لائبریری میں پروفیسر حبیب اللہ خان صدر شعبۂ عربی کی صدارت میں توسیعی لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں سینٹر فار عربک اینڈ افریکن لینگویجز، جواہر لال یونیورسٹی کے عبرانی زبان کے استاذ ڈاکٹر خورشید امام نے بحیثیت خطیب شرکت کی۔ ڈاکٹر خورشید امام پورے ہندوستان میں عبرانی زبان کے واحد ایکسپرٹ ہیں۔ انھوں نے عبرانی زبان اسرائیل جاکر یونیورسٹی آف ہبرو، یروشلم میں اہل زبان سے سیکھی ہے اور کئی سال وہاں مقیم رہے ہیں، پروفیسر عبدالماجد قاضی نے عربی اور عبرانی زبان پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ دونوں زبانیں ایک ہی خاندان یعنی سامی زبان سے تعلق رکھتی ہیں اور ڈاکٹر خورشید صاحب عربی زبان و ادب میں ایم اے اور عبرانی زبان کے ماہر ہیں اس لیے ہمیں موصوف سے دونوں زبانوں کے درمیان جو رشتہ موجودہ دور میں پایا جاتا ہے اس سے استفادے کا موقع ملے گا۔ موصوف کے بعد مہمان خطیب نے اپنے لیکچر کے آغاز میں عبرانی زبان کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ اس زبان کا زمانہ قدیم میں ایک زریں دور رہا ہے لیکن اس زبان پر ایک دور ایسا بھی آیا جب اس کا وجود بالکل ختم ہوگیا تھا، لیکن حالات بدلے اور اس زبان کے لوگوں نے اس کا احیا کیا اور آج عبرانی زبان دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح دنیا میں ہے۔ موصوف نے عبرانی زبان اور عربی زبان کے درمیان یکسانیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ دونوں زبانیں سامی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور دونوں کی جڑ ایک ہی ہے اس لیے دونوں زبانوں میں بہت سے ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دونوں زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ فاضل مقرر نے دونوں زبانوں کے یکساں الفاظ کو بطور مثال سامعین کے سامنے پیش کیا۔ موصوف نے اپنی گفتگو میں کہا کہ عبرانی زبان میں بہت سی ایسی تعبیرات پائی جاتی ہیں جو عربی زبان سے متاثر ہوکر آئی ہیں۔ اسی طرح عبرانی زبان میں بہت سے الفاظ عربی زبان کے الفاظ کی طرح ہیں لیکن عربی میں جس معنی میں وہ استعمال ہوتے ہیں وہ اس سے مختلف معنی میں عبرانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر خورشید امام کے بعد صدر شعبۂ عربی پروفیسر حبیب اللہ خان نے اپنے صدارتی خطاب میں مہمان مقرر کو ایک علمی لیکچر پیش کرنے کے لیے مبارک باد پیش کی اور کہا کہ عبرانی زبان کے بارے میں ہمیں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 ستمبر 2019

ساحر کے بیش قیمتی مخطوطات اور ڈائریاں

ممبئی: اردو کے مایۂ ناز اور مقبول شاعر نیز ترقی پسند تحریک کے سرخیل ساحر لدھیانوی کے مخطوطات، ڈائریاں اور ان کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں ممبئی کے جوہو علاقے میں ایک کباڑی کی دکان میں ملی۔ تاریخی اثاثہ کی حیثیت کی حامل ان دستاویزات کو محفوظ رکھنے کے مقصد سے ایک غیر سرکاری تنظیم نے انھیں محض 3 ہزار روپے میں خرید لیا ہے۔ ممبئی میں واقع 'فلم ہیریٹیج فاؤنڈیشن' جس نے مذکورہ دستاویزات کو کباڑی سے خریدا ہے، انھیں محفوظ کرنے کے ساتھ ہی ان کی عوامی نمائش پر بھی غور کررہا ہے۔ تنظیم کے بانی ڈائرکٹر شیویندر سنگھ ڈونگر پور نے بتایا ہے کہ ''جو ڈائریاں ملی ہیں ان میں ساحر کی روزانہ کی مصروفیات کی تفصیل ہے، مثلاً وہ گانوں کی ریکارڈنگ کے لیے کہاں جارہے ہیں یا پھر ان کے ذاتی معمولات وغیرہ۔ ان کے علاوہ کئی نظمیں اور نوٹس بھی ہیں جو ان کی اپنی تحریر میں ہیں۔ زیادہ تر تحریریں ان کے اشاعتی ادارے پرچھائیاں سے متعلق ہیں۔'' انھوں نے مزید بتایا کہ ''جو خطوط ملے ہیں ان میں ملک کی نامور شخصیات کی جانب سے ساحر کے نام آنے والے خطوط بھی ہیں جیسے موسیقار روی، ان کے دوست اور شاعر ہربنس وغیرہ کچھ خطوط انگریزی میں ہیں کچھ اردو میں۔ بقیہ تمام تحریریں اردو میں ہیں'' تحریروں کے علاوہ کئی تصویریں بھی ہیں۔ کچھ تصویریں اکیلے ساحر کی ہیں، کچھ ان کی بہنوں اور دوستوں کے ساتھ ہیں۔ چند تصویریں پنجاب میں ان کے آبائی وطن کی بھی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 ستمبر 2019

دھلی:

جے این یو میں فرزانہ اعظم لطفی کا خصوصی خطاب

نئی دھلی: ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے اشتراک سے ایک خصوصی لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی کے خصوصی خطاب سے قبل پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر شفیع ایوب نے جے این یو میں مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے پروگرام کے روح رواں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کو تعارفی کلمات کے لیے زحمت دی۔ پروفیسر موصوف نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ فارسی میں زبان حال کی روایت تو ہے لیکن اردو شاعری یا اردو ادب میں اس طرف کم توجہ دی گئی ہے، یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس جانب تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی نے اپنے خصوصی خطاب میں کہا کہ زبان حال کی روایت فارسی میں تو دیکھنے کو مل جاتی ہے لیکن اردو میں کم ادیبوں نے اس جانب توجہ دی ہے۔ زبان حال کی رموز و نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی نے فارسی کے معروف شاعر حافظ شیرازی سے لے کر اردو کے نامور شعرا نظیر اکبرآبادی، (خدائے سخن) میر تقی میر، علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری وغیرہ جیسے شعرا نے 'زبان حال' کا کس خوب صورتی سے استعمال کیا ہے۔ ان سب پر بھرپور اور جامع روشنی ڈالی۔ زبان حال ایک ایسی اصلاح ہے جس میں احساسات و کنایات کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی کا تعلق شعبۂ اردو تہران یونیورسٹی تہران، ایران سے ہے۔ اس نشست میں مہمان خصوصی جناب جناب فہیم اختر (لندن) تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 15 ستمبر 2019

ترجمے کے مسائل پر توسیعی خطبہ

نئی دھلی: ترجمہ دراصل مختلف پردوں کو چاک کرکے متن کے معنی کو ہدف زبان میں منتقل کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں مذہب، تہذیب، سیاست، جغرافیہ اور زبان کی خاص اہمیت ہوا کرتی ہے۔ ترجمے

میں درپیش آنے والے مسائل کو بنیادی طور پر زبان، تہذیب اور اسلوب کی سطح پر ہم دیکھ سکتے ہیں۔ کسی بھی متن کے ترجمے میں منشائے مصنف یا مقصد مصنف تک پہنچنے کے لیے ہمیں کئی مفاہمتیں کرنا پڑتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر اے نصیب خاں نے 'ترجمے کے مسائل' موضوع پر شعبۂ اردو میں منعقدہ توسیعی خطبے میں کیا۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو، پروفیسر شہزاد انجم نے مہمان مقرر اور شرکا و حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا کہ نئے تعلیمی سال کا یہ پہلا بے حد اہم توسیعی خطبہ ہے جس کے لیے اس عہد کے نامور مترجم ڈاکٹر اے نصیب خاں کو زحمت دی گئی ہے جن کے علمی و ادبی کاموں سے ہم سب واقف ہیں۔ اس توسیعی خطبے کے کنوینر ڈاکٹر خالد جاوید نے مہمان مقرر کا مختصر تعارف پیش کرتے

ہوئے فرمایا کہ جس موضوع پر یہ خطبہ منعقد کیا گیا ہے وہ اپنے آپ میں ایک مسئلہ ہے اور اس کے ابتدا کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ اس موقعے پر صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے سابق صدر شعبۂ اردو اور سابق ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجز پروفیسر وہاج الدین علوی نے ڈاکٹر اے نصیب خاں کے توسیعی خطبہ کو بہت گراں قدر اور بصیرت افروز قرار دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ خطبہ ترجمہ کے ہمہ جہت مسائل پر محیط ہے اور بہت سہل اور عام فہم زبان میں دلکش انداز میں مہمان مقرر نے اسے پیش کیا ہے۔ خطبے کا اختتام ڈاکٹر سرور الہدیٰ کے اظہار تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 ستمبر 2019

ستیہ وتی کالج کے شعبۂ اردو میں استقبالیہ تقریب

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی، ستیہ وتی کالج کے شعبۂ اردو میں استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کے ٹیچر انچارج ڈاکٹر قمرالحسن نے طلبا و طالبات کو خطاب کیا۔ انھوں نے شعبہ کی سابقہ کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شعبے کی رونق طلبا سے ہے، تمام طلبہ کو کلاس میں پابندی سے حاضر رہنا چاہیے کیونکہ کلاس روم طلبا کی تربیت گاہ ہوتی ہے جس میں طالب علموں کے مستقبل کی راہ ہموار ہوتی ہے جس میں وہ اپنی زندگی کا لائحہ عمل طے کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے طلبہ کی ہمہ جہت شخصیت سازی کے لیے اپنے اساتذہ سے علمی معاملات میں ہر طرح سے تعاون کا مشورہ دیا۔ اس موقعے پر شعبہ کی استاد ڈاکٹر نسرین رئیس خان نے طلبا کو اپنی نیک خواہشات سے نوازا اور تعلیم کے حوالے سے تعاون کرنے کا عندیہ دیا۔ تقریب میں نو وارد طلبہ کا بی اے (آنرس) سال آخر کے طلبہ نے استقبال کیا اور سال اول کے طلبہ نے اپنی پسندیدہ تخلیقات پیش کیں۔ اس جلسے میں شعبہ کے اساتذہ ڈاکٹر رئیسہ پروین، ڈاکٹر سجاد مہدی حسینی، ڈاکٹر عارف اشتیاق، ڈاکٹر سرفراز جاوید، ڈاکٹر ندیم احمد اور ڈاکٹر سورج کمار کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ نے شرکت کی۔ جلسے کی نظامت کے فرائض محمد حامد رضا اور نشا پروین نے ادا کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 ستمبر 2019

ہندوستانی زبانوں سے مہکے گا افغانستان

نئی دھلی: دہلی میں انٹرنیشنل بزنس سمٹ اور انویسٹمنٹ کے دوران صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے تجارتی فروغ اور زبان فاؤنڈیشن آف انڈیا کے صدر فاروق صدیقی نے کہا کہ تجارت کے ساتھ ہندوستان پڑوسی ملک افغانستان میں ہندوستانی زبان اردو، ہندی، پنجابی اور دیگر زبانوں کا فروغ بھی وقت کا اہم تقاضا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ تجارتی میل جول اور باہمی ربط و تعلق سے بہت سارے مسائل حل ہوتے ہیں، روزگار کو فروغ بھی ملتا ہے اور اسی طرح ملک ترقی کرتا ہے۔ ساتھ ہی زبان و تہذیب اور ثقافت کا میل جول بھی ترقی میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی فلمیں اور ٹی وی افغانستان میں بہت مقبول ہیں، جس کی وجہ ہندوستانی ہیرو اور ہیروئنوں کو وہاں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی شعرا بھی وہاں کافی مقبول ہیں۔ صدیقی صاحب نے بتایا کہ ہندوستان اور افغانستان کے قدیم رشتے ہیں۔ دونوں ملکوں کا تعلق سفارتی ہو کہ تجارتی یا سیاسی ہر اعتبار سے مضبوط و مستحکم ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آنے والے سال میں قابل زبانوں کا ایک سینٹر کھلے گا جس سے یہ رشتے مزید مضبوط ہوں گے جہاں ساری سہولتیں مفت دی جائیں گی اور واضح ہو کہ افغانستان کی زبان فارسی ہے اور اردو میں فارسی کے بہت سارے الفاظ ہیں جس کی وجہ سے افغانستان میں رہنے والے ہندوستانیوں کو وہاں کی زبان سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس موقعے پر زبان فاؤنڈیشن کے صدر جناب فاروق صدیقی نے کہا کہ اگلے ماہ سے ساؤتھ دہلی میں جہاں کافی افغانی ریفیوجیز رہتے ہیں وہاں بھی زبانوں کا ایک سینٹر کھول رہے ہیں جہاں ترجیحی طور پر افغانیوں کو ہندوستانی زبانیں سکھائیں گے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 ستمبر 2019

اتر پردیش:

تحقیق: فن اور طریق کار

وارانسی: شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیر اہتمام

پندرہ روزہ قومی ورکشاپ بہ عنوان "تحقیق: فن اور طریق کار" کے افتتاحی اجلاس میں مہمان خصوصی شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد پروفیسر شہاب الدین ثاقب نے کہا کہ دنیا کی ترقی اور کامرانی میں تحقیق کا رول کلیدی ہے۔ جہاں تک زبان و ادب کا تعلق ہے تحقیق ان معنوں میں ایک ناگزیر عمل ہے کہ تحقیق جہاں نامعلوم سے معلوم کی طرف لے جاتی ہے، وہیں بہت سارے گڑھے ہوئے مفروضوں کو تہس نہس بھی کرتی ہے۔ یہ درست ہے کہ تنقید کھرے کھوٹے کو الگ کرتی ہے لیکن بغیر تحقیق کے کسی تخلیقی نگارشات کی جانچ پرکھ بسا اوقات غلط تعبیر پیش کر دیتی ہے جس کی عمدہ مثال مجنوں گورکھپوری کا وہ مضمون ہے جس میں امیر کے شعر کو میر کا قرار دے کر اپنا معروضہ پیش کیا ہے۔ اس لیے محقق کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ معتبر متن کی دریافت کا معاملہ ہو یا ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑنے کا عمل بغیر تحقیق کے ممکن نہیں۔

اس موقعے پر ہندی کے ممتاز نقاد و دانشور پروفیسر اودھیش پردھان نے کہا کہ جس موضوع پر قومی اور بین الاقوامی سمینار مذاکرے اور مباحثے کا انعقاد کیا گیا ہے وہ اکادمی جگت کے لیے ایک نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے استقبالیہ کلمات میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے موضوع کی اہمیت کی مناسبت سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں سائنس اور تکنیک نے ادب کے سامنے کئی سوالیہ نشان قائم کیے ہیں، ہم نے قدما سے وراثت میں ملے تحقیق کے فن اور مبادیات کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے لیکن موجودہ تقاضا یہ ہے کہ ہم مختلف زبانوں کے درمیان باہمی اتفاق پیدا کریں اور دوسرے علوم و فنون میں جو طریق کار ہیں ان سے بھی فائدہ اٹھائیں۔ اس سے زبان و ادب میں نہ صرف تنوع پیدا ہوگا بلکہ ہمارے ریسرچ اسکالر عصری تقاضوں سے بخوبی واقف ہو پائیں گے۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر مشرف علی نے، جب کہ اظہار تشکر کی رسم محترمہ رقیہ بانو نے ادا کی۔

"تحقیق: فن اور طریق کار" کے اختتامی اجلاس میں مہمانِ خصوصی اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر عتیق اللہ نے کہا

کہ دنیا کی ترقی اور کامرانی میں تحقیق کا اہم رول رہا ہے۔ تہذیبیں جب تک اپنی جڑوں سے وابستہ نہ ہوں پائیدار نہیں ہوسکتیں۔ شہر کی اپنی کوئی مخصوص تہذیب نہیں ہوتی بلکہ وہ ملٹی کلچر ہوتا ہے۔ بازار، صارفیت اور بازار کی بدلتی صورت حال کو سمجھے بغیر کوئی بھی تحقیق بامعنی نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے مزید کہا کہ شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی نے جس موضوع پر ورکشاپ کا انعقاد کیا ہے، اس جانب عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ اس موقعے پر سیاسیات کے ممتاز عالم اور دانشور پروفیسر آر پی پاٹھک نے اپنی صدارتی تقریر میں تحقیق کے مسائل اور موضوعات اور یونیورسٹی میں ہونے والی تحقیقات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی کو اپنی ذمے داری ادا کرنی ہوگی۔ اپنے استقبالیہ کلمات میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے مہمانوں اور شرکا کا استقبال کرتے ہوئے پندرہ روزہ ورکشاپ کی روداد اور کارگزاریوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ یہ ورکشاپ ہمارے طلبا اور اساتذہ کی کردار سازی اور تحقیق میں ان کی دلچسپیوں کو جلا بخشے گی۔ پروفیسر اشفاق احمد صدر شعبۂ عربی نے جامعات میں تحقیق کی صورت حال اور منصوبہ سازی و تحقیقی خاکہ تیار کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ منصوبہ بندی کے بغیر کوئی بھی اہم کام انجام نہیں دیا جاسکتا۔ پروفیسر منظر حسین صدر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی نے تحقیق اور تنقید کے رشتوں پر گفتگو کی۔

پریس ریلیز: آفتاب احمد آفاقی، صدر شعبۂ اردو، بی ایچ یو، 19 ستمبر و روزنامہ 'قومی تنظیم' لکھنؤ، 4 اکتوبر 2019

نعت کی فنی حیثیت

مراد آباد: مہاراجہ ہریش چندر پوسٹ گریجویٹ کالج میں 25 ستمبر کو شعبۂ اردو کے زیر اہتمام 'نعت کی فنی حیثیت' کے موضوع پر سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح کالج ہذا کے منیجر کاویہ سوربھ رستوگی اور پرنسپل ڈاکٹر مینا کول نے شمع روشن کرکے کیا۔ مقرر خصوصی شہر کے معروف ادیب ڈاکٹر محمد آصف حسین نے موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ نعت گوئی اردو شاعری کی ایک اہم صنف سخن ہے، تاہم اردو شعرا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ شعرا نے مذہب کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کلچر کو بھی اہمیت دی اور نمائندہ طور پر اس کی عکاسی نعت میں کی ہے۔ منیجر کاویہ سوربھ رستوگی نے پروگرام کے کامیاب انعقاد کے لیے شعبہ اردو کو مبارکباد پیش کی۔ صدارت کرتے ہوئے پرنسپل ڈاکٹر مینا کول نے کہا کہ اس طرح کے لیکچر طلبہ کے لیے بہت فائدہ مند ہیں۔ اس سے ادب میں دلچسپی ہوگی اور امتحانات کی تیاری میں مدد ملے گی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالرب نے بحسن وخوبی انجام دیے اور اظہار تشکر شعبہ اردو کی صدر ڈاکٹر اسماعزیز نے کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 ستمبر 2019

'1857 میں صحافت کا کردار'

میرٹھ: اردو صحافت کو ابھی تک اس کا مقام نہیں مل سکا ہے جبکہ اٹھارہ سو ستاون کی پہلی جنگ آزادی میں اردو صحافت کا بڑا کردار رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر نیرج نے کیا، وہ سبھارتی یونیورسٹی میں '1857 میں صحافت کا کردار' کے موضوع پر سیمینار میں خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ 'پیغام آزادی' کے نام سے نکلنے والا اردو اخبار درحقیقت 1857 میں آزادی کا پیغام دے رہا تھا، آج ضروری ہے کہ اردو صحافت کے ذریعے کی گئی ناقابل فراموش خدمات کو منظر عام پر لایا جائے۔ غور طلب ہے کہ میرٹھ کی سبھارتی یونیورسٹی میں 1857 میں صحافت کے کردار کے موضوع پر سیمینار کا انعقاد کیا گیا، جس میں مختلف مقالہ نگاروں نے اپنے مقالات پیش کیے۔ پروفیسر کے جی سریش نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ 1857 کے وقت اتر پردیش، مدھیہ پردیش اور دہلی میں ہندی، اردو، فارسی زبان استعمال ہوتی تھی، چھوٹے اخبارات انھیں زبانوں میں نکل رہے تھے جو عوام کی زبان سمجھے جاتے تھے جن میں اردو اخبار کا اپنا الگ کردار تھا۔ ایک وقت تو ایسا لگ رہا تھا کہ آزادی کی جو آواز اردو اخبارات کے ذریعے اٹھائی جارہی ہے اس سے ملک اٹھارہ سو ستاون میں ہی آزاد ہوجائے گا، لیکن کسی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کے کردار کو منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ آئی آئی ایم سی کے سابق ڈائرکٹر جنرل کے جی سریش نے بتایا کہ 1857 کی تحریک آزادی میرٹھ کی سرزمین سے شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ پورے ملک میں پھیل گئی، یہ تحریک ملک کو متحد کرنے میں کامیاب رہی۔ انھوں نے بتایا کہ 1857 کی تحریک میں منصوبہ بند حکمت عملی نہ ہونے کی وجہ سے کامیابی نہیں مل سکی تھی، لیکن ہندو مسلم نے ایک ہوکر ملک کی آزادی کے لیے قربانی دی تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 ستمبر 2019

فن سوز خوانی

علی گڑھ: انجمن محبانِ اردو علی گڑھ کے زیر اہتمام فن مرثیہ خوانی پر منعقد مجلس کو خطاب کرتے ہوئے معروف نوجوان سوز خوان عظیم شمس آبادی نے کہا کہ سوز خواں ذاکر اول ہوتا ہے یہی مجلس کا آغاز کرتا ہے اور اپنی پرسوز آواز میں واقعات کربلا کو بیان کرتا ہے جس سے مجلس میں غم کی فضا قائم ہوجاتی ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو غم امام مظلوم کے سبب پروان چڑھا اور ہندوستان کی خاص فضا نے اسے تقویت عطا کی۔ اس فن کے سیکھنے کے لیے برسوں کی ریاضت درکار ہے، ساتھ ہی آواز کا پرسوز ہونا اور فن موسیقی کا علم بھی ہونا لازمی ہے اس کے لیے اردو زبان پر دسترس بھی ضروری ہے کیونکہ اردو زبان کے اندر ہی بہترین رثائی ادب دیکھنے کو ملتا ہے۔ ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی مرثیہ کی کافی اہمیت ہے۔ میر ضمیر، میر خلیق، مرزا دبیر، میر انیس وغیرہ نے اردو مرثیہ نگاری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تاریخ کے حوالے سے دیکھا جائے تو مرثیہ خوانی کی ایک قدیم روایت ہے لیکن اسے عروج لکھنؤ کے تہذیبی ماحول میں ملا لکھنؤ کے نوابین کے دور میں یہ فن اپنے بام عروج پر تھا۔ فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ کی بیوی بہو بیگم اس فن میں کافی دلچسپی رکھتی تھیں اور ان کے یہاں باقاعدہ اس کی محفل منعقد ہوا کرتی تھی۔ موصوف نے مزید کہا کہ سوز خوانی کے فن سے وابستہ ہوئے گیارہ سال ہوچکے ہیں۔ اس فن میں میرے استاد منظر حسین شکوہ آبادی ہیں۔ موصوف نے فن سوز خوانی کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یوں تو مرثیہ سوز وسلام کو تحت الفاظ کے منفرد انداز میں بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں مکالماتی اور ڈرامائی انداز اور آواز کے زیر وبم کے ذریعے سامعین پر مختلف جذباتی کیفیات کو ابھارا جاتا ہے لیکن سوز خوانی کے فن میں سامعین کے ذہن ودل پر ایک منفرد تاثر پیدا ہوتا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 ستمبر 2019

الہ آباد یونیورسٹی کا کنووکیشن

الہ آباد: الہ آباد یونیورسٹی نے امسال یوم اساتذہ کے موقعے پر کنووکیشن کا انعقاد کیا۔ گذشتہ 23 برس سے یونیورسٹی اس سے محروم رہی۔ وائس چانسلر پروفیسر رتن لعل ہانگلو نے اپنے مضبوط عزم وارادے کی بدولت اس کار محال کام کو انجام دے دیا جس کے لیے ان کی ستائش کی ہی جانی چاہیے۔ اس موقعے پر عالی جناب کیلاش ستیارتھی (معروف چائلڈ رائٹ ایکٹیوسٹ اور نوبل پیس پرائز ونر) نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور کانووکیشن سے خطاب کیا جب کہ وائس چانسلر پروفیسر رتن لعل ہانگلو نے جلسے کی صدارت کی۔ جناب کیسری ناتھ ترپاٹھی (سابق

ماہنامہ 'سائنس' کے جشن سیمیں پروگرام کا منظر

گورنر بنگال، بہار اور اتر پردیش) اور شری اوم پرکاش سنگھ، ڈی جی پی اتر پردیش کو اعزازی ڈگری تفویض کی گئی۔ 181 طلبا کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ 2018 میں یونیورسٹی کے مختلف کورس میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے چھ طلبا کو چانسلر مڈل اور 55 طلبا کو 119 میموریل مڈل سے نوازا گیا۔ ان میں شعبۂ عربی و فارسی کی عرشی شمیم پانچ گولڈ میڈل لے کر سر فہرست رہیں۔ اسی شعبے کی انشرح بانو کو دو گولڈ میڈل ملے۔ اس کے علاوہ دیگر طلبہ و طالبات کو بھی اعزاز سے نوازا گیا۔

پریس ریلیز: پروفیسر صالحہ رشید، صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، 6 ستمبر 2019

بہار:

رحمٰن عباس کے دو ناولوں کا انگریزی ترجمہ

پٹنہ: (اسفر فریدی) ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ناول نگار رحمٰن عباس کے ناولوں کو اگلے سال سے انگریزی زبان کے قاری بھی پڑھ سکیں گے۔ پنگوئن انڈیا رحمٰن عباس کے دو ناولوں 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' اور 'روحزن' کو شائع کرے گا۔ اردو میں لکھے گئے ان ناولوں کی بین الاقوامی سطح پر پہلے ہی پذیرائی ہو چکی ہے۔ روحزن کے لیے رحمٰن عباس کو سال 2018 کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا۔ یہ ناول جرمن زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ رحمٰن عباس کے اردو ناولوں کا انگریزی ترجمہ شائع کرنے جا رہی پنگوئن کی شاخ پرنٹ دنیا کے اہم اور انعام یافتہ ناولوں اور نئے تخلیقی اذہان کی کتابیں شائع کرنے کے لیے مشہور ہے۔ سمیکا عباس نقوی نے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ناول 'روحزن' کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ رحمٰن عباس کے ناولوں کو شائع کرنے کے حوالے سے پنگوئن رینڈم ہاؤس انڈیا نے میڈیا کو جاری کردہ اپنے بیان میں کہا ہے کہ رحمٰن عباس کا ناول 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' عہد حاضر کے مسائل، پدری نظام کا جبر، سیاسی ہتھکنڈوں اور مذہبی ٹھیکیداروں کی دہریت کو نمایاں کرتا ہے۔ اس ناول پر انھیں مہاراشٹر اسٹیٹ اکادمی کا فکشن ایوارڈ 2011 ملا تھا۔ ناول کا کردار عبدالسلام بیگ وقت ذہین، تخلیقی اور لاابالی شخصیت کا مالک ہے۔ دوسری جانب 'روحزن' محبت کی کہانی ہے جو ممبئی شہر کی زندگی کی بہت ساری مخفی حقیقتوں کو طشت از بام کرتی ہے۔ اس ناول میں رحمٰن عباس قارئین کو ممبئی کی ایک منفرد سیر پر لیے چلتے ہیں اور انھیں پر تجسس کردار، زندگی اور محبت سے روبرو کراتے ہیں۔ پنگوئن انڈیا کی پبلشر ملی ایشوریہ نے اس موقعے پر کہا: ''میں رحمٰن عباس کو کئی برسوں سے جانتی ہوں، ان برسوں میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور بے باکی کا مشاہدہ پیش نظر رہا ہے۔ ان کی تحریروں میں انسانی جذبات اور سماجی سروکار کا ایک حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ پنگوئن انڈیا سے ان کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 ستمبر 2019

اردو اور ہندی کا رشتہ

مدھوبنی: شعبۂ اردو بی ایم کالج رہیکا، مدھوبنی میں 'اردو اور ہندی کے باہمی رشتے' پر ایک خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا، جس میں علاقہ کے ادبا، شعرا اور مقامی اسکالرس کے علاوہ دربھنگہ اور قرب و جوار سے بڑی تعداد میں اردو اور ہندی کے ماہرین شریک ہوئے۔ پروگرام کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پنکج کمار چودھری نے کی، جب کہ متعلقہ موضوع پر لیکچر صدر عالم گوہر نے پیش کیا اور انھوں نے بہت ساری مثالوں کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ اردو اور ہندی میں قواعد اور زبان اور الفاظ کی سطح پر بہت زیادہ اشتراک پایا جاتا ہے، صرف دونوں میں رسم الخط کا فرق ہے، ورنہ یہ دونوں زبانیں ایک ہی خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہیں اور دونوں میں 70 فی صد الفاظ اور محاورے مشترکہ طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ اس موقعے پر موجود پروگرام کے مہمان خصوصی صدر شعبۂ اردو للت نارائن متھلا یونیورسٹی ڈاکٹر سید محمد رضوان اللہ نے کہا کہ جس طرح ہمارے آبا و اجداد کی ایک حویلی ہوتی تھی مگر بعد میں فیملی کے ممبران میں اضافہ کی وجہ سے تقسیم در تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے، اسی طرح زبانوں کا معاملہ ہے کہ ہندوستانی زبان ایک حویلی ہے جس کی تعمیر و تشکیل میں اردو، ہندی، مراٹھی، پنجابی، گجراتی اور میتھلی سب کا حصہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندی ایک ہی ماں کی بیٹیاں اور سگی بہنیں ہیں اور یہ رشتہ اب بھی برقرار ہے اور قیامت تک برقرار رہے گا۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی نے کہا کہ اردو اور ہندی کا رشتہ بہت ہی گہرا ہے، دونوں نے ایک ہی زبان کھڑی بولی کے بطن سے جنم لیا ہے، مگر ہماری مفاد پرست سیاست نے ان دونوں کے درمیان بہت بڑی خلیج قائم کردی ہے جس کو پاٹنے اور دونوں کو قریب لانے کی شدید ضرورت ہے۔ آج کے حالات میں جبکہ عالمی پیمانے پر تمام زبانیں ایک دوسرے سے استفادہ کر رہی ہیں اور دنیا گلوبل ولیج ہی نہیں لینگویج ولیج میں تبدیل ہو گئی ہے، اردو اور ہندی کے بیچ جو تہذیبی، ثقافتی، ادبی، علمی، تاریخی اور لسانی رشتے ہیں، اس کو نمایاں کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ تاکہ یہ دونوں اہم ہندوستانی زبانیں ایک دوسرے کی حریف نہیں، رفیق بن کر رہیں اور قوم و ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کریں۔ اس موقعے پر آر کے کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر مطیع الرحمٰن، پروفیسر اشتیاق بنی پٹی کالج کی صدر شعبۂ اردو فرحہ معید، ادے چندر جھا، راجیش پانڈے، پروفیسر چھتیش کمار اور ڈاکٹر اشوک کمار نے بھی اردو اور ہندی کے گہرے تعلقات کو تاریخی حوالوں سے نمایاں کیا۔ اس پروگرام کی نظامت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی نے کی، جبکہ شکریہ کی رسم انگریزی شعبہ کے صدر پروفیسر وبھو کمار نے انجام دی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 ستمبر 2019

تلنگانہ:

ماہنامہ 'سائنس' کا 'جشن سیمیں' پروگرام

علی گڑھ: سائنسی فکر کے بغیر زندگی کے کسی بھی شعبے میں ترقی ممکن نہیں ہے، سائنسی فکر ہی بہتر سماج کی تعمیر میں اہم رول ادا کر سکتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد اردو نیشنل یونیورسٹی (MANUU) حیدرآباد کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر اسلم پرویز نے کیا۔ وہ انجمن فروغ سائنس کے زیر اہتمام مسلم یونیورسٹی کے پالی ٹیکنک آڈیٹوریم میں منعقد ماہنامہ 'سائنس' کے 'جشن سیمیں' کے جلسے کو خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ قرآن کریم بھی قدرت کے تخلیق کردہ جملہ شعبہ ہائے حیات کو دیکھنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے پر زور دیتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے ماہنامہ 'سائنس' کے خصوصی شماروں کے مضامین کے عنوانات اور موضوعات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ عصر حاضر میں ان کی

اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ انجمن فروغ سائنس کے سکریٹری ڈاکٹر عبدالمعز شمس نے سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے اردو میں سائنسی مضامین لکھنے والے قلم کاروں کا تعارف کرایا۔ پروفیسر ظفر احسن نے سبھی شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے منتظمین کی کاوشوں کی ستائش کی اور کہا کہ سائنس کے تئیں بیداری انتہائی ضروری ہے۔ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے ڈاکٹر عبدالمعز شمس کی مرتب کردہ سائنسی کارواں کی دوسری جلد کا اجرا کیا۔ جلسے کے دوسرے سیشن کو خطاب کرتے ہوئے شمس تبریز عثمانی نے اردو سائنس اور قرآن کے حوالے سے کہا کہ اردو والوں کو دوسروں کی طرف نہ دیکھ کر خود اردو کے لیے اقدام کرنے ہوں گے، کیونکہ زبان کا تعلق معیشت سے نہیں معاشرہ سے ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ اپنے بچے کو اردو صرف اس لیے نہیں پڑھاتے ہیں کہ اس کو اردو پڑھ کر نوکری نہیں ملے گی۔ ڈاکٹر عابد نے کہا کہ اصطلاح سازی کے بجائے اس کے مفہوم کو پہچانیں۔ انھوں نے اردو کو پوری طرح اپنانے کی تلقین کی اور کہا کہ تب ہی اس کے مثبت نتائج برآمد ہوں گے اور تب ہی زبان اور ثقافت کا تحفظ ہو سکے گا۔ جلسے کی نظامت شاہین نصر نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 ستمبر 2019

راجستھان:

اردو میں ادبی تاریخ نگاری کی روایت

جے پور: بھگونت یونیورسٹی، اجمیر میں شعبۂ اردو کی جانب سے ایک توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا۔ یہ شعبہ کا پہلا توسیعی خطبہ تھا جس کے خصوصی مقرر ڈاکٹر معین الدین شاہین (ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج، اجمیر) نے 'اردو میں ادبی تاریخ نگاری کی روایت' کے عنوان سے اپنا پرمغز خطبہ پیش کیا۔ ادبی تاریخ نگاری کی اہمیت وافادیت اور اس کی معنویت پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو کی ادبی تاریخیں تہذیب وتمدن کی آئینہ دار ہیں۔ ادبی تاریخ نگاری کے اصول وضوابط پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے رام بابو سکسینہ، سید اعجاز حسین، سید احتشام حسین، رشید حسن خاں، اصغر وجاہت، برج موہن کیفی، وہاب اشرفی، گیان چند جین وسیدہ جعفر، عظیم الحق جنیدی، نورالحسن نقوی، محی الدین قادری زور، گارساں دتاسی، مسعود حسن خان، نورالحسن ہاشمی، محمود شیرانی، سہیل بخاری، نصیرالدین ہاشمی کی ادبی تواریخ کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو کو سب سے مستند قرار دیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر نوازالحق (سینئر میڈیکل آفیسر، آیورویدک اینڈ یونانی ہاسپٹل گنج، اجمیر) نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ادبی تقریبات انسانی صفات کا سرچشمہ ہیں۔ ادب کے بغیر اچھے سماج کی تشکیل نہیں ہوسکتی ہے۔ اردو زبان کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے نقطوں سے پیدا ہونے والی معنوی تفریق کو واضح کیا۔

پروفیسر آر کے ایس اروڑا (پرنسپل، فیکلٹی آف ایجوکیشن، بی یو) نے اپنے صدارتی خطبہ میں کامیاب توسیعی خطبہ کی صدر شعبہ کو مبارکباد دی اور مقرر کے پیش کردہ خطبہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ادب کے استاد کو ادبی ادب کو سمجھ کر طلبہ کو پڑھانا چاہیے۔ ڈاکٹر دنیش مانڈوت (رجسٹرار، بھگونت یونیورسٹی) نے اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ اردو زبان ہماری تہذیب کی پہچان ہے، اردو ہمارے ملک کی جان ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے گیان کے بغیر ہندوستانی تہذیب کو سمجھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ جلسے کی نظامت اور تعارفی کلمات کا فریضہ صدر شعبہ ڈاکٹر شاکر علی صدیقی نے انجام دیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو خالص ہند آریائی زبان ہے، جس پر ہندوستان کی مختلف زبانوں کے اثرات ہیں، یہ دہلی اور نواح دہلی میں پیدا ہوئی لیکن اس کی پرورش وپرداخت دکن میں ہوئی۔ اس پر مذہبی یا غیر ملکی الزام نہیں لگایا جاسکتا ہے، کیونکہ زبان کسی مذہب کی نمائندہ نہیں ہوتی، بلکہ زبان کا خود اپنا ایک مذہب ہوتا ہے۔ آخر میں ڈین، بھگونت یونیورسٹی ڈاکٹر دھرمیندر دوبے نے تمام مہمانان وسامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج کے اس خطبے سے ہم نے بخوبی جان لیا کہ ہندوستان میں اردو زبان کی ایک تابناک تاریخ ہے، جس کی حفاظت ہم سب کی ذمے داری ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 اکتوبر 2019

گجرات:

فوزیہ رباب کے اعزاز میں نشست

احمد آباد: فوزیہ رباب کی شاعری میں جو بے ساختگی، آمد کی کیفیت اور والہانہ پن ہے وہ ان کے فطری شاعرہ ہونے کی دلیل ہے اور یہی ان کی اصل شناخت ہے۔ یہ بات فوزیہ رباب کے اعزاز میں نشست کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر محی الدین بامبے والا نے کہی۔ انھوں نے کہا کہ اس کم عمری میں ان کا یہ شعری رویہ ان کے تابناک تخلیقی مستقبل کا اشاریہ بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ فوزیہ رباب کا تعلق احمد آباد کے ایک علمی خانوادے سے ہے۔ ان کے دادا اور والد کا شمار اپنے وقت کے جید علما میں ہوتا ہے اور ان کی تعلیمی، سماجی اور ملی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تقریب کے آرگنائزر ابہام رشید نے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ فوزیہ رباب کے شعری مجموعہ 'آنکھوں کے اس پار' کا اجرا جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں ہوا تھا۔ اس مجموعے کو ادبی دنیا میں اتنی جلدی جس قدر مقبولیت ملی ہے وہ بہت ہی کم کسی فن کار کے حصے میں آتی ہے اور ان کے درجنوں علمی مقالے ملک وبیرون ملک کے مشہور اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے درجنوں قومی اور بین الاقوامی سیمناروں میں مقالات پیش کرکے اہل علم سے داد وتحسین وصول کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ فوزیہ رباب نے مشاعروں کی پستی کے اس دور میں بھی اپنے وقار ومعیار سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ ساہتیہ اکادمی دہلی، اردو اکادمی مدھیہ پردیش اور اردو اکادمی راجستھان کے علاوہ بیسوں پروقار مشاعروں میں بحیثیت شاعرہ شرکت کرچکی ہیں۔ انھیں ریڈیو، ٹیلی ویژن پروگراموں میں بلایا جاتا ہے۔ ان کے اعزاز میں دلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ممبئی میں تقریبات منعقد ہوچکی ہیں۔ یہ تقریب تاریخی لائبریری حضرت پیر شاہ لائبریری، احمد آباد، میں منعقد ہوئی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 ستمبر 2019

مہاراشٹر:

ہماری تہذیبی روایت اور غالب

پونے: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام بہ تعاون دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ پونے دو روزہ قومی سیمنار بعنوان 'ہماری تہذیبی روایت اور غالب' بتاریخ 28-27 ستمبر 2019 کو منعقد ہوا۔ ان دو دنوں میں کلام غالب اور ہندوستانی تہذیبوں کے گہرے رشتوں پہ سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ افتتاحی اجلاس کا آغاز قاری محمد حسن نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ اس اجلاس کے مہمان خصوصی سید شاہد مہدی (سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) نے کہا کہ غالب کو پڑھتے وقت سب سے پہلے جو تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے کسی دوسرے شاعر نے ہنداسلامی تہذیب کی نمائندگی اس طرح نہیں کی جس طرح غالب نے کی ہے۔ لہٰذا یہ بات سب سے پہلے ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ غالب ہنداسلامی تہذیب کا نمائندہ شاعر ہے۔ غالب ایک تجزیاتی ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے کلکتہ تک جتنا لمبا سفر طے کیا ان کے کسی معاصر نے نہیں کیا، جس کی وجہ سے ان کے نقطۂ نظر میں بڑی وسعت پیدا ہوئی لیکن ایک اور بات یہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ غالب

کوصرف ان کے اردو کلام کے ذریعے نہیں سمجھا جاسکتا اور صرف تقابلی روش کو ہمیں خیر باد کہنا ہوگا۔ سیمینار کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ممتاز ادیب و دانشور شمیم طارق نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اپنے بنیادی مقصد کو نظر انداز کیے بغیر اپنے دائرۂ کار کو وسیع کیا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے اپنے تعارفی کلمات میں فرمایا کہ میں دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انھوں نے غالب کی 150 ویں برسی کے موقعے پر ہمیں پونے میں مدعو کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 ستمبر 2019

گاندھی کی 150 ویں سالگرہ اور بچوں کی دنیا

اورنگ آباد: مہاتما گاندھی کی 150 ویں سالگرہ پر اورنگ آباد مہاراشٹر کے اردو اسکولوں کے طلبا نے ایک انوکھے انداز میں گاندھی جی کو یاد کیا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے گاندھی جی کی سالگرہ کی مناسبت سے ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کا خصوصی شمارہ شائع کیا ہے۔ شہر کی مشہور سماجی تنظیم ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن نے مختلف اردو اسکولوں کے 15 ہزار طلبا تک یہ شمارہ پہنچایا جسے طلبا نے خرید کر اجتماعی مطالعہ کرکے گاندھی جی کی سالگرہ منائی۔ فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر مرزا عبدالقیوم ندوی نے شہر کے مختلف اردو اسکولوں میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسلام میں مجسمہ سازی کی اجازت نہیں ہے، اس لیے ہم ملک کے عظیم رہنماؤں کو ان کے تصویروں مجسموں پر ہار، پھول، مالا چڑھانے کے بجائے ان کی زندگی اور ان کی خدمات و کارناموں کو یاد کرکے، ان کی کتابوں کا مطالعہ کرکے مناتے ہیں، اسی لیے ہم نے یہ طے کیا کہ شہر کے اردو اسکولوں میں قومی کونسل سے شائع ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کا خصوصی شمارہ پہنچایا تاکہ 2 اکتوبر کو طلبا مہاتما گاندھی جی کے زندگی کے بارے میں شائع خصوصی مضامین کا مطالعہ کرکے معلومات حاصل کریں۔

روزنامہ 'اردو ٹائمز' ممبئی 12 اکتوبر 2019

ہریانہ:

اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ

ہریانہ، پنچکولہ: 'اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ' کے موضوع پر ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے شاندار سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کے تعارفی کلمات و نظامت کے دوران ڈائرکٹر ہریانہ اردو اکادمی ڈاکٹر چندر ترکھانے کہا کہ اکادمی کا اصل مقصد اردو کا ارتقا ہے، لیکن ملکی دونوں

زبانوں یعنی اردو اور ہندی کے بولنے لکھنے پڑھنے والوں کے رشتوں کو مزید مستحکم بنانا بھی ہے، اور منشا دونوں ہی زبانوں کا فروغ بھی ہے۔ اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ، اس عنوان پر منعقدہ سیمینار کا کلیدی خطبہ معروف ادیب و شاعر شیو کمار شین کاف نظام نے دیا اور بتایا کہ دونوں ہی کا استعمال ہماری طرز زندگی کا حصہ ہونا چاہیے۔ اسی سے ہندوستان جھلکتا ہے۔ اس موقعے پر نائب صدر دہلی ساہتیہ اکادمی اور ندی گڑھ ساہتیہ اکادمی کے چیئرمین مادھو کوشک، انجمن ترقی اردو ہندی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے لسانی تناظر پر گفتگو کی۔ اہم مقالہ نگاروں میں یوپی سے آئے ہندی کے معروف ادیب وگیان ورت نے لفظیات کے تعلق سے بات کی، دہلی سے آئے ہوئے ادیب و صحافی حبیب سیفی نے اپنے مقالہ میں انگریزوں کی عیارانہ کوشش کے تحت لسانی تفریق کو بڑھاوا دینے کی سازش کو پیش کیا۔ مہمان ڈی جی وجیلنس ڈاکٹر کے پی سنگھ، ڈائرکٹر ہریانہ اردو اکادمی ڈاکٹر چندر ترکھانے بھی اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے باہمی اختلاط اور مضبوط رشتوں کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔ شرکت کرنے والوں کے مطابق اپنی نوعیت کو یہ پہلا ایسا پروگرام منعقد کیا گیا ہے۔ اردو اور ہندی کے تناظر میں جس میں دونوں زبانوں کے بولنے والوں کی تفریق کے اسباب و تدارک پر غور کیا گیا۔ دوران تقریب اکادمی کی اشاعتی کارگزاریوں کے منصوبے پر شائع کی گئی کتابوں کی رونمائی بھی عمل میں آئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 ستمبر 2019

اعزاز و اکرام:

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

آگرہ: آگرہ کی ادبی انجمن 'بزم میکش' کے زیراہتمام پدم شری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی سکریٹری، غالب

انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی وصدر انجمن ترقی اردو ہند، دہلی کو اٹھائیسواں 'قومی میکش ایوارڈ' 25 اگست 2019 کو شہر کے مشہور ہوٹل ہوٹل گرانڈ میں ایک پروقار تقریب میں دیا گیا۔ مہمان خصوصی پدم شری پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر ایمریٹس عبدالحق، دہلی یونیورسٹی، پروفیسر محمد معظم الدین، این سی ای آر ٹی نئی دہلی تھے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نسرین بیگم و سید فیض علی شاہ کی مرتب کردہ کتاب بعنوان 'دبستان ادب آگرہ کے معروف شاعر و ادیب سید محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ کتاب کا اجرا پدم شری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پدم شری پروفیسر اختر الواسع، سید اجمل علی شاہ نیازی، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر محمد معظم الدین کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر نسرین بیگم، جنرل سکریٹری، بزم میکش آگرہ 3 ستمبر 2019

پروفیسر عبیداللہ فہد کو تیرہواں شاہ ولی اللہ ایوارڈ

نئی دھلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے تیرہویں شاہ ولی اللہ ایوارڈ سے پروفیسر عبیداللہ فہد کو جامعہ ہمدرد کے کنونشن ہال میں ایک تقریب کے دوران سرفراز کیا

گیا۔ پروفیسر عبیداللہ فہد کی اسلامی سیاسیات میں نمایاں اور قابل ذکر خدمات ہیں۔ اسلامی شورائی نظام پر انھوں نے نمایاں کام کیا ہے جس کی بنیاد آئی او ایس کی ایوارڈ کمیٹی نے تیرہویں شاہ ولی اللہ ایوارڈ کے لیے ان کا انتخاب کیا۔ پروفیسر عبیداللہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کے صدر ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ دو سو سے زائد سیمیناروں میں شرکت کرچکے ہیں۔ سیکڑوں مقالات لکھ چکے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور راجہ پرتھوی چوہان کے خاندان سے ان کا تعلق ہے۔ ایوارڈ میں ایک لاکھ روپے کا چیک، سپاس نامہ اور مومنٹو پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے پروفیسر عبیداللہ فہد نے کہا کہ اسلام کا سیاسی نظام سب سے اہم اور سب سے زیادہ جمہوری ہے لیکن اس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے اور بہت کم کام ہوا ہے۔ آئی او ایس کے چیئرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس ایوارڈ کا نام شاہ ولی اللہ رکھا گیا ہے جس کا مقصد ماضی کی تاریخ جاننا، اس کے ہیرو کو یاد رکھنا اور پھر اس کی روشنی میں اپنے حالات کا جائزہ لینا اور سبق سیکھنا ہے۔ دنیا میں وہی قوم

زندہ رہتی ہے جو اپنی تاریخ یاد رکھتی ہے۔ تقریب کی صدارت کا فریضہ پروفیسر یاسین مظہر صدیقی نے انجام دیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 ستمبر 2019

جلسہ تقسیم انعامات برائے اردو ٹاپرز

نئی دھلی: اردو اکادمی کے زیر اہتمام قمر رئیس سلور جبلی ہال میں جلسہ تقسیم انعامات 2018 (برائے اردو ٹاپرز یونیورسٹیز، بورڈز، اردو سرٹی فکیٹ کورس، اردو کمپیوٹر کورس اور اردو کتابت کورس) کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر دہلی کے نائب وزیر اعلیٰ اور اردو اکادمی کے چیئرمین منیش سسودیا نے شرکت کی اور صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کی۔ اس موقعے پر سیلم پور کے ایم ایل اے حاجی اشراق بھی موجود تھے۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین معروف و ممتاز شاعر پروفیسر شہپر رسول نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ اردو اکادمی ہر سال اردو کے مختلف کورسیز میں ٹاپ کرنے والے طلبا و طالبات کو انعام دیتی ہے۔ اس سال ہماری یہ خوش بختی ہے کہ ہمارے نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا جی اس پروگرام میں موجود ہیں۔ اپنی صدارتی تقریر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ اردو اکادمی، دہلی ملک کی سب سے فعال اور متحرک اکادمی ہے۔ اردو کے فروغ کے تمام امکانات پر اکادمی کام کر رہی ہے۔ میں اکادمی کے اکثر پروگراموں میں آتا ہوں، لیکن اردو کے مستقبل کے نمائندوں کو انعام دینے کے لیے آنا مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ اکادمی کا یہ سلسلہ شاندار ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 ستمبر 2019

پروفیسر تسنیم فاطمہ

نئی دھلی: معروف سائنس داں پروفیسر تسنیم فاطمہ سابق صدر ڈپارٹمنٹ آف بائیو سائنسز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کو معروف ادارہ 'رولا ایوارڈس' نے ماحولیاتی

بائیولوجی اور سائنو بیکٹیریل بائیوٹکنالوجی میں بین الاقوامی معیار کی جدید، نادر اور اعلیٰ سطحی تحقیقی خدمات کے اعتراف میں 'ریسرچ پیس ایوارڈ 2019' سے سرفراز کیا ہے۔ یہ پروقار ایوارڈ انھیں ترو چیراپلی (تمل ناڈو) کے ہوٹل بریز ریزیڈینسی کے ایک وسیع آڈیٹوریم گرانڈیور کے ہال میں پیش کیا گیا۔ قبل ازیں انھیں باٹنی ایلگی برانچ میں بیش بہا تحقیقی حصولیابیوں کے لیے پروفیسر وائی ایس کے شرما ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ پروفیسر تسنیم فاطمہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں سینئر پروفیسر ہیں۔ پروفیسر تسنیم فاطمہ نے ہندوستان کے علاوہ کئی بیرونی ممالک کے تعلیمی سفر کیے ہیں۔ حکومت کے تعاون سے امریکہ میں ایک سال اور جرمنی و اٹلی میں چھ چھ ماہ قیام کیا۔ آسٹریلیا، ہانگ کانگ، چین، اٹلی، ملیشیا، فلپین اور کنیڈا وغیرہ کی کانفرنسوں میں سرکاری طور پر شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 ستمبر 2019

رضوان شیخ

سولاپور: لائنس کلب آف سولاپور (مرکز) اور ضلع سولاپور سوشل ورکنگ کمیٹی کے اشتراک سے یوم اساتذہ

کے موقعے پر سوشل اردو ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج آف سائنس سولاپور کے ہونہار معلم رضوان احمد عبدالجلیل شیخ کو مثالی معلم کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایس وی سی ایس، بی ایڈ کالج اکلکوٹ روڈ سولاپور میں اے آر برڈلا کالج کے پرنسپل ڈاکٹر راجندر شینڈ گے کے دست مبارک سے رضوان شیخ کو ٹرافی، سند اور شال پیش کی گئی۔ رضوان شیخ کے ساتھ ڈاکٹر پروفیسر سنگمیشور نیلا، سہاس اُپاسے، پرشانت دیشپانڈے، شریمتی سندھیا چندن شوے ان پانچ معلم کو انعام سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر راجندر شینڈ گے نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "اساتذہ قوم کی ترقی کے ضامن ہوتے ہیں" اس موقعے پر لائنس کلب آف سولاپور مرکز کے صدر لائنس راجو چودھری، ضلع سولاپور سوشل ورک کمیٹی کے صدر الیاس پاٹل اور پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر شری کانت یلیگا وکر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'اردو ٹائمز' ممبئی، 4 ستمبر 2019

شاعرہ سیما پٹھان

ناگپور: جو قلمکار اپنے دکھوں کے ساتھ زمانے کا غم بھی لفظوں میں موثر انداز میں بیان کرنا جانتا ہے وہی سچا شاعر ہے۔ ان خیالات کا اظہار مراٹھی کی مشہور ادیبہ اور محقق ڈاکٹر زلفی شیخ نے ایک تقریب میں کیا جس میں ضلع امراوتی کے ایک غیر معروف قصبے کی شاعرہ سیما پٹھان کو 'ڈاکٹر سلبھا ہیرلے کرسرتی پرسکار' سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر زلفی شیخ نے مشہور مراٹھی شاعرہ ڈاکٹر سلبھا ہیرلے کر کی ادبی خدمات پر بھی روشنی ڈالی۔ ناگپور کے مشہور ادب نواز ادارے، یشونت راؤ چوہان پرتشٹھان کی جانب سے ہر سال کسی ابھرتے ہوئے فنکار کو یہ انعام دیا جاتا ہے۔ اس موقعے پر ایک شاندار تقریب کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ امسال اردو اور مراٹھی کی شاعرہ اور ادیبہ سیما پٹھان کو اس اعزاز کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس ادارے کے صدر ڈاکٹر گریش گاندھی کی صدارت میں منعقد کی گئی اس تقریب میں اردو انشائیہ نگار محمد اسداللہ مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ سیما پٹھان نے ادارے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ جلد ہی وہ مراٹھی میں ایک ناول شائع کرنے جا رہی ہیں جس میں دیہاتی زندگی کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ جلسے کی نظامت کے فرائض ریکھا ونڈ گے نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 ستمبر 2019

محمد قمر حیات

ناگپور: علاقۂ ودربھ کے مشہور و مقبول اردو مدرس جناب محمد قمر حیات کا ان کی قومی اتحاد، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سماجی و تہذیبی ہم آہنگی پر ان کی نمایاں خدمات کے لیے شہر ناگپور کی اہم مراٹھی سنستھا ودربھ ساہتیہ سنگھ کی جانب سے ایک پروقار تقریب میں اعزاز و اکرام کیا گیا۔ استقبالیہ جلسے کی صدارت منوہر مہیسا لکر صاحب فرما رہے تھے۔ صدر جلسہ نے مومنٹو دے کر جناب قمر حیات کی خدمات کو سراہا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جناب محمد قمر حیات گذشتہ 38 برسوں سے وی ایس ایس میں فری اردو کوچنگ کلاسز چلا رہے ہیں جس کے ذریعے قومی یکجہتی بھائی چارہ اور محبت اتحاد و اتفاق کے پیغام کو عام کر رہے ہیں۔ ودربھ ساہتیہ سنگھ جیسے باوقار اور اہم مراٹھی ادارے کے ذریعے قمر حیات صاحب کو اعزاز پوری اردو دنیا کے لیے باعث فخر ہے۔ جناب قمر حیات صاحب نے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھنا بڑی ناانصافی کی بات ہے۔ زبان کا کوئی دھرم مذہب نہیں ہوتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ساری زبانیں انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔ اردو ان سے ہٹ کر نہیں ہے اردو ادب میں ہمیں ابتدا سے ہی محبت، اتفاق و اتحاد، انسانیت دوستی اور عالم گیر بھائی چارے کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ امیر خسرو سے لے کر غالب تک اور غالب سے لے کر پروین شاکر تک سب نے انسانیت کے گیت گائے ہیں۔

پریس ریلیز: ایم اطہر حیات، مہاراشٹر، 24 ستمبر 2019

ڈاکٹر ناہیدہ سلطانہ

حیدرآباد: آل انڈیا اردو ماس سوسائٹی فار پیس کی جانب سے حیدرآباد کی ابھرتی ہوئی ادیبہ ونقاد اور اردو کی استاد

ڈاکٹر ناہیدہ سلطانہ کو انمول رتن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اردو گھر مغلپورہ میں منعقدہ ایک تقریب میں ڈاکٹر م ق سلیم (صدر شعبہ اردو شاداں کالج)، محمد آصف علی (نیوز ہیڈ روبی نیوز) صاحبزادہ مجتبیٰ فہیم (ایڈیٹر رنگ وبو)، عابد صدیقی (سابق نیوز ایڈیٹر دوردرشن)، ڈاکٹر عابد معز (سابق ایڈیٹر اور سیس شگوفہ)، صلاح الدین نیر (ایڈیٹر خوشبو کا سفر)، ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی (ایڈیٹر ماہنامہ صدائے شبلی اور محسن خان نے ڈاکٹر ناہیدہ کو ایوارڈ پیش کیا۔ صدر آل انڈیا اردو ماس سوسائٹی فار پیس ڈاکٹر مختار احمد فردین نے کہا کہ ڈاکٹر ناہیدہ سلطانہ نے حیدرآباد میں اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ دو حصوں میں شائع کر کے تاریخی اقدام کیا ہے جس میں 1960 سے لے کر 2010 تک شعرا کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ناہیدہ نے کتاب کو کافی تحقیق و کڑی محنت سے لکھا ہے۔ وہ اخبارات میں پابندی سے ادبی مضامین لکھتی ہیں۔ انھوں نے ناہیدہ سلطانہ سے خواہش ظاہر کی کہ جن شعرا کرام کی خدمات کا احاطہ نہ ہو پایا ہو اس پر بھی تحقیق کی ضرورت ہے۔

پریس ریلیز: مختار احمد، حیدرآباد، 12 ستمبر 2019

ڈاکٹر امان اللہ ایم بی

مدراس: مدراس یونیورسٹی نے یوم اساتذہ کے موقعے پر یونیورسٹی اساتذہ کی تحقیقی صلاحیتوں اور ان کے کارناموں

کے اعتراف میں ڈاکٹر امان اللہ کو بیسٹ ریسرچ ایوارڈ سے نوازا۔ ایوارڈ یافتگان نے یہ ایوارڈ ڈاکٹر ایم جی آر میڈیکل یونی ورسٹی کی وائس چانسلر ڈاکٹر پروفیسر سدھا سیشیئن کے ہاتھوں حاصل کیا۔ مدراس یونی ورسٹی ہندوستان کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔ اس یونیورسٹی میں تقریباً 89 شعبہ جات ہیں اور اساتذہ کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ اس ایوارڈ کے لیے یونی ورسٹی نے صرف آٹھ اساتذہ کا انتخاب کیا جن کے تحقیقی کارنامے قابل قبول سمجھے گئے، ان میں شعبہ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ ایم بی کا نام نامی شامل ہے۔ اس اعزاز کے لیے اردو اساتذہ اور اہل اردو نے آپ کو دلی مبارک باد پیش کی۔ سب سے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ شعبہ اردو کے استاذ کا انتخاب ان کی تحقیقی کارگزاریوں کا جائزہ لینے اور ان کو پرکھنے کے بعد عمل میں آیا ہے۔ یہ بھی اہل اردو کے لئے مسرت کی بات ہے کہ پروفیسر امان اللہ صاحب کو یہ ایوارڈ کم سنی میں عطا ہوا ہے جب کہ تجربہ کار پروفیسروں کو جو تحقیق کا ایک طویل تجربہ رکھتے ہیں اس کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر امان اللہ سے امیدیں وابستہ ہیں کہ وہ آئندہ بھی تحقیق کے میدان میں اپنی بہتر شناخت قائم کریں گے۔

پریس ریلیز: پروفیسر سید سجاد حسین، سابق صدر شعبہ عربی فارسی و اردو، مدراس یونی ورسٹی، 11 ستمبر 2019

ڈاکٹر محمد معروف خان

نئی دہلی: 5 ستمبر 2019 شمالی مشرقی علاقے جعفرآباد میں واقع ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل سینئر سیکنڈری اسکول

کے پرنسپل ڈاکٹر محمد معروف خان کو 35 سالہ تدریسی اور انتظامی خدمات کے اعتراف میں انڈو نیپال سمرستا آرگنائزیشن کی جانب سے یوم اساتذہ کے موقعے پر قومی سطح کے مقبول ایوارڈ شکشا شری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وی کے کرشن مینن بھون، نئی دہلی میں جاری ہند- نیپال ثقافتی کانفرنس کی ایک تقریب میں ہندوستان کی تمام ریاستوں سے مختلف شعبہ ہائے زندگی، خصوصاً تعلیم و تدریس میں امتیازی، فلاحی اور منفرد خدمات انجام دینے کے اعتراف میں منتخبہ حضرات کی عزت افزائی کی گئی جس میں ایوارڈ یافتگان کو ایک میڈل، سپاس نامہ، مملکتِ نیپال کا امتیازی نشان ٹوپی اور ایک شال سے نوازا گیا۔ انتخابی کمیٹی کے صدر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد شبیر نے ملک کی تمام ریاستوں سے 585 نامزد شخصیات میں سے 40 کا انتخاب کیا جن میں دہلی سے واحد نام پرنسپل ڈاکٹر محمد معروف خان کا منتخب ہوا۔ انھیں اس موقعے پر نیپال حکومت کے پہلے نائب صدر جسٹس پرمانند جھا نے سپاس نامہ پیش کیا، سپریم کورٹ نیپال کے سابق جج گریش چند لال نے میڈل پہنایا، حکومتِ نیپال کے پشوپتی ترقیاتی فنڈ کے سکریٹری ڈاکٹر پردیپ ڈھکال نے نیپال کا امتیازی نشان ٹوپی پیش کی اور سابق سفیر مملکتِ نیپال برائے ہندوستان نے شال پیش کر کے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔ مذکورہ تقریب میں ہندو نیپال کی معزز شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 ستمبر 2019

اظہر ابرار

کامٹی: مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کے 2017,2018 کے انعامات اورنگ آباد میں دیے گئے۔ ان انعام یافتگان

میں ڈگری کالج کی سطح پر 'مثالی ٹیچر ایوارڈ' ڈاکٹر اظہر ابرار کو دیا گیا۔ وہ ابھرتے ہوئے ادیب اور افسانہ نگار ہیں اور ایس۔ کے پوروال ڈگری کالج، کامٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔ ان کی تحریریں اردو کے معیاری رسائل میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہی ہیں۔ معروف انشائیہ نگار محمد اسد اللہ کے منتخب انشائیوں کا ایک انتخاب مرتب کر کے انھوں نے 'دوسرا الکٹ' کے نام سے شائع کیا جسے اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔ کامٹی کے ایس۔ کے پوروال ڈگری کالج میں کثیر تعداد ان طلبا و طالبات کی ہے جو آرٹس، کامرس اور سائنس میں اردو مضمون پڑھتے ہیں۔ کالج میں ہر سال مختلف ادبی تقاریب کا انعقاد کیا جاتا ہے جن کے انتظامات ڈاکٹر اظہر ابرار بحسن و خوبی انجام دیتے رہے ہیں۔

پریس ریلیز: اظہر ابرار، اسسٹنٹ پروفیسر اینڈ ہیڈ، صدر شعبہ اردو، سیٹھ کیسری مل، پوروال کالج، کامٹی، ناگپور، 16 ستمبر 2019

رفیع الدین ناصر کی کتاب 'پلانٹ اناٹومی وایمبر یولوجی' کا اجرا

فریدہ نثار احمد انصاری کے افسانوی مجموعہ 'گوہر قلزم' کا اجرا

رسم اجرا:

پلانٹ اناٹومی وایمبر یولوجی

اورنگ آباد: ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کی تحریر کردہ کتاب 'پلانٹ اناٹومی وایمبر یولوجی' جس کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے شائع کیا، اس کی رسم اجرا مولانا آزاد کالج کے لٹریری فورم کی جانب سے منعقدہ عظیم الشان جلسہ میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مظہر احمد فاروقی اور مہمان خصوصی پروفیسر حمید خان کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقع پر پرنسپل ڈاکٹر مظہر احمد فاروقی نے ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کو ان کی اس 34 ویں کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی اور فرمایا کہ سائنسی تحقیقات کی صحیح عکاسی ادب کے توسط سے ہی ہوتی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر حمید خان نے ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کی خدمات کو سراہا۔ اس کے بعد مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کو ان کی کتاب 'سائنسی ردا' کو اعزاز سے نوازے جانے پر پرجوش استقبال کیا گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر رفیع الدین ناصر نے مولانا آزاد سوسائٹی کے بانی صدر ڈاکٹر رفیق زکریا (مرحوم)، موجودہ صدر پدم شری محترمہ فاطمہ زکریا، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے ذمے داران، اسی طرح مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے ذمہ داران کے علاوہ کالج کے لٹریری فورم کے ذمہ داران کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض جویریہ شیخ نے انجام دیے جبکہ اظہار تشکر ڈاکٹر افروز فاطمہ نے کیا جس کے بعد تقریب کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر رفیع الدین ناصر، ریسرچ گائڈ اینڈ اسسٹنٹ پروفیسر ان بوٹنی، مولانا آزاد کالج، ڈاکٹر رفیق زکریا کیمپس، اورنگ آباد، 16 ستمبر 2019

گوہر قلزم

ممبئی: ماہنامہ اردو آنگن ممبئی اور 'گل بوٹے' کے اہتمام سے قطر سے تشریف لائی مہمان محترمہ فریدہ نثار احمد انصاری کے افسانوی مجموعہ 'گوہر قلزم' کا اجرا محترم افروز عالم (عالمی شاعر) کے بدست گل بوٹے آڈیٹوریم میں عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر جمیل کامل نے فرمائی۔ جناب فاروق سید نے آغاز میں فریدہ نثار احمد انصاری کا تعارف پیش کیا۔ جناب ایاز گورکھپوری نے محترمہ کے افسانوی مجموعہ پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے مبارکباد پیش کی اور فرمایا کہ خواتین کے مسائل پر محترمہ کی گہری نظر ہے جس کی جا بجا جھلک ان کے تحریر کردہ افسانوں میں بخوبی نظر آتی ہے۔ آپ نے ان کے افسانوں کی تحریر کے چند حصوں کو سامعین کے روبرو پیش کرتے ہوئے محترمہ کی فنی مہارت کی داد دی۔ اس موقعے پر جناب شجاع الدین شیخ اور ظہیر انصاری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب کی نظامت جناب مشیر انصاری نے انجام دی۔

پریس ریلیز: گل بوٹے ممبئی، 16 ستمبر 2019

کچھ اور

وارانسی: کسی بھی عہد کے ادبی رجحان اور شعری و تنقیدی نیز تحقیقی رویوں کو سمجھنے کے لیے اس عہد میں شائع ہونے والی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے عہد میں جو کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں ان سے ہمارے دور کی صداقتوں کا علم ہوتا ہے۔ کوئی بھی کتاب بالخصوص شعری و ادبی تخلیقی نگارشات اپنے حال اور زمین کے حالات کے زائیدہ ہوتی ہیں جنھیں پڑھ کر موجودہ دور ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی صورت حال سے واقف ہوتی ہیں۔ افتخار راغب کی غزلیہ شاعری ہمارے عہد کی دستاویز ہے جسے پڑھنا اپنے آپ سے اور اپنے گرد و پیش سے روبرو ہونا ہے۔ اسی لیے انھیں معاصر شعری منظر نامے کا نمائندہ شاعر کہا جانا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر شہاب عنایت ملک (ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز، جموں یونیورسٹی) نے دستک ادبی فورم، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ افتخار راغب کے شعری مجموعہ 'کچھ اور' میں اپنی صدارتی کلمات میں کیا۔ اس سے قبل اپنی استقبالیہ تقریر میں صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے جناب افتخار راغب کے شعری امتیازات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ افتخار راغب کی شاعری میں ہجرت اور دربدری کا جو کرب ہے وہ صرف ان سے مخصوص نہیں بلکہ یہ کسک ان تمام لوگوں کی ہے جو اپنے گھر سے دور ہیں۔ نمائندہ شاعر دراصل وہی ہوتا ہے جس کا ذاتی احساس کائناتی ہو۔ ایسی شاعری کسی ایک خطے یا دور تک محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ اس نوع کی سرحدوں کو مسمار کرتی ہے۔ افتخار راغب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے روایتی شاعری کے پہلو بہ پہلو ادب کے بدلتے منظر نامے اور تقاضوں کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی ہے۔ افتخار راغب کے شعری مجموعہ پر گفتگو کرتے ہوئے شعبے کے استاد ڈاکٹر رشی کمار نے انھیں باکمال شاعر قرار دیا۔ انھوں نے مجموعہ سے اپنی پسند کے کئی اشعار بھی سنائے۔ ڈاکٹر محمد قاسم انصاری نے ہجرت اور اردو کے مسائل کو افتخار راغب کی شاعری میں دریافت کرنے کی کوشش کی اور اردو کی نئی بستیوں میں دوحہ قطر کی

خصوصیات پر گفتگو کی۔ افتخار راغب کے شعری مجموعہ 'کچھ اور' پر محی الدین اور جاوید انور نے تبصراتی مضامین پیش کیے۔ آخر میں 'کچھ اور' کے خالق افتخار راغب نے شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میرے لیے آج بڑی طمانیت اور سرشار ہونے کا لمحہ ہے کہ میرے مجموعہ پر یہاں کے اساتذہ، ریسرچ اسکالر اور طلبہ و طالبات نے گفتگو کی اور کاوشوں کو پسند کیا۔ میں اس کے لیے صدر شعبۂ اردو پروفیسر آفتاب احمد آفاقی اور ان کے تمام رفقا کا ممنون ہوں۔ اس جلسے میں نظامت کے فرائض دستک ادبی فورم کے نگراں ڈاکٹر مشرف علی نے انجام دیے اور شکریے کی رسم عبدالسمیع نے ادا کی۔ تقریب پذیرائی کے بعد شعری نشست کا آغاز ہوا۔ اس میں جن شعرا نے اپنے کلام پیش کیے ان میں جناب افتخار راغب، کبیر اجمل، ڈاکٹر محمد عقیل، مائل انصاری، خالد جمال، نہال جالب اور جاوید انور کے نام اہم ہیں۔ ادبی نشست کی نظامت جاوید انور نے انجام دی اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر رقیہ نے ادا کی۔ اس موقع پر یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے اساتذہ، شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر، طلبہ و طالبات کے علاوہ شہر بنارس کے اہل ذوق کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

پریس ریلیز: آفتاب احمد آفاقی، شعبۂ اردو، بی ایچ یو، 5 ستمبر 2019

کمائی میری

نئی دہلی: بزم ادب دوست کے زیر اہتمام روزنامہ 'دور جدید' کے مرکزی دفتر للیتا پارک لکشمی نگر میں ایک

شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں معروف شاعر و نثر نگار طالب رامپوری کا تیسرا شعری مجموعہ 'کمائی میری' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ نشست کی صدارت مہمان شاعر س ش عالم نے فرمائی جب کہ نظامت کے فرائض شاعر و صحافی معین شاداب نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شاداب جھنا گر اور ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے شرکت کی۔ مہمان ذی وقار کے طور پر شعیب رضا وارثی شریک رہے۔ عالمی شہرت یافتہ شاعرہ انا دہلوی نے طالب رامپوری کی گل پوشی کی اور شال اڑھا کر ان کا استقبال کیا۔ صولت پبلک لائبریری رامپور اور احباب رامپور انٹرنیشنل کی جانب سے طالب رامپوری کی شعری و ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک مومنٹو بھی پیش کیا گیا۔ بعد ازاں اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے طالب رامپوری کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شفیع ایوب نے طالب رامپوری کی کتاب 'کمائی میری' پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ موصوف نے اردو شاعری کا حق ادا کیا ہے۔ ان کے شعروں کا لفظ لفظ اردو شاعری کی بنیادی روایتوں کا امین ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 ستمبر 2019

آصف جاہی جلد اوّل

اورنگ آباد: آج ملک میں تاریخ کے نام پر نفرتوں کا بازار گرم ہے۔ تاریخ کا کام نفرتیں پھیلانا نہیں ہے بلکہ

سماج اور ملک میں اخوت و محبت، امن و امان، مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں اتحاد و اتفاق کی فضا کو ہموار کرنا ہے۔ ان خیالات کا اظہار اورنگ آباد میں سلطنت آصف جاہی (نظام آف حیدرآباد) کی تاریخ و کارناموں پر مراٹھی زبان میں شائع کتاب 'آصف جاہی جلد اوّل' کے رسم اجرا کے موقعے پر ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ تاریخ ڈاکٹر امیش باگڑے نے عالمگیر ہال، ادارہ بیت الیتیم اورنگ آباد میں کیا۔ 'آصف جاہی جلد اوّل' سرفراز احمد شیخ، کلیم عظیم اور سید واعظ، ان تینوں نے کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ پروگرام کے ابتدا میں کتاب کا تعارف کراتے ہوئے سرفراز احمد نے کتاب کے بارے میں بتایا کہ آصف جاہی خاندان نے دو سو سال سے زائد اس علاقے پر حکومت کی ہے اور ان کی حکومت میں بے شمار عوامی فلاحی و بہبود کے کام انجام دیے گئے ہیں۔ آخری نظام میر عثمان علی خان نے اپنی ریاست میں جس طرح کے ترقیاتی کام کیے ہیں اس طرح کے کام ملک کے کسی بھی راجہ، مہاراجہ، نوابوں، جاگیرداروں نے نہیں کیے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کتاب کو مراٹھی میں لکھنے کی دراصل وجہ یہ ہے کہ جو کتابیں آج کل بازار میں نظام آف حیدرآباد کے اوپر موجودہ ہیں وہ غلط اور پروپیگنڈے کے تحت لکھی گئی ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نظام یا سلطنت آصف جاہی پر اگر کوئی شخص لکھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اردو، فارسی اور انگریزی زبان جاننا ضروری ہے۔ بغیر اس کے ممکن ہی نہیں کہ کتاب لکھی جائے۔ کتاب کے دوسرے مرتب کلیم عظیم نے کہا کہ ہماری کوشش یہ ہے کہ سلطنت آصف جاہی پر جو کچھ اردو، فارسی، انگریزی میں لکھا گیا ہے ان کا ترجمہ مراٹھی میں شائع کیا جائے۔ واضح رہے کہ یہ پروگرام ادارہ بیت الیتیم اورنگ زیب ریسرچ فاؤنڈیشن کے جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں ادارہ بیت الیتیم کے سرپرست خالد احمد نے اپنا گرانقدر تعاون دیا جبکہ دانش قریشی، کریم احمد نے محنت کی۔ پروگرام میں نظامت کے فرائض شیخ محمد دستگیر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 ستمبر 2019

مسکرانا منع ہے

بیدر: دوسروں کو ہنسانا ایک مشکل فن ہے اور اگر وہ تحریر کے ذریعے ہو تو ایسا فن اور بھی مشکل ہوگا۔ جہاں تک ادبی پیرائے میں طنز کو برتنے کی بات ہے، یہ جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ یہ باتیں گلبرگہ کے معروف طنز و

مزاح نگار منظور وقار نے کہیں۔ وہ بیدر ڈائٹ، موقوعہ نوآباد، بیدر میں ڈی ای ایل، ای ڈی سال دوم کے طالبات سے 'فن کہانی و قصہ گوئی' پروگرام میں بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ تقریب کے دوسرے مہمان محمد یوسف رحیم بیدری تھے۔ اس موقعے پر جناب منظور وقار کی کتاب 'مسکرانا منع ہے' کی رسم رونمائی ڈاکٹر محمد گلسین، سینئر لیکچرر کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ بعد ازاں ڈاکٹر محمد گلسین نے اپنے مبسوط صدارتی خطاب میں بتایا کہ لوگ نصیحتوں کو سننا پسند نہیں کرتے۔ ایسے افراد کو ہنسی ہنسی میں نصیحت کرنے کے لیے طنز و مزاح کا سہارا لینا بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 ستمبر 2019

علی سردار جعفری بحیثیت نثر نگار

پریاگ راج: ڈاکٹر کہکشاں عرفان کے تحقیقی مقالہ پر مشتمل کتاب ہندوستان ہی نہیں پاکستان کے 'سنگ میل

پبلی کیشنز' لاہور سے شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہے۔ شعبۂ اردو کی استاد ڈاکٹر کہکشاں عرفان کی یہ کتاب 'علی سردار جعفری بحیثیت نثر نگار' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس موقعے پر سبھی نے ڈاکٹر کہکشاں عرفان کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دی۔ ڈاکٹر کہکشاں عرفان کی کتاب کی افادیت پر اردو کے سینئر استاد ڈاکٹر شمشاد زیدی نے مقالہ پیش کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کی تحریر پڑھ کر سنائی گئی۔ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کے مطابق ڈاکٹر کہکشاں عرفان نے علی سردار جعفری کے تمام نثری کارناموں کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ مصنف نے اپنی اس پیش کش میں جو تنقیدی اور تجزیاتی طریقہ اختیار کیا ہے وہ ان کی نثری تخلیقات کو سمجھنے میں ہمیشہ تحقیقی و تنقیدی اہمیت کا حامل رہے گا۔ شمشاد نے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو اور ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی تحریر کو پڑھ کر محفل کو سنایا۔ شکریہ کی رسم ڈاکٹر اشرا سشو نے ادا کی۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں اساتذہ وطلبہ وطالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 ستمبر 2019

میں پیڑا کا نیل گگن ہوں

اعظم گڑھ: حیوانیت سے انسانیت کا سفر ادب کے ذریعے شروع ہوتا ہے اور جب انسان دکھ کی آخری منزل پر پہنچتا ہے تب شاعری ہوتی ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ضلع کلکٹر ناگیندر پرساد سنگھ نے شبلی اکادمی دارالمصنفین میں منعقد ایک تقریب میں ڈاکٹر رویندر کمار استھانا کے شعری مجموعہ 'میں پیڑا کا نیل گگن ہوں' کی رسم اجرا کے موقعے پر بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے آگے کہا کہ رویندر جی ایک ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ کوی بھی ہیں۔ ان کی اس کتاب پر میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اترپردیش بھاشا سنستھان کے سابق صدر ڈاکٹر کنہیا سنگھ نے صدارتی خطبہ میں کہا کہ اس شعری مجموعے میں مختلف موضوعات پر نظمیں ہیں۔ یہ کتاب ذاتی سماجی اور حب الوطنی سے لبریز ہے لیکن اس میں جمالیاتی حسن زیادہ ہے۔ مہمان اعزازی سی ایم او اے کے مشرا نے کہا کہ ڈاکٹروں کو غیر حساس کہا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر رویندر جی کی کتاب پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ بے حد حساس ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 ستمبر 2019

غبار دل

پٹنہ: 'غبار دل' ادب اور صحافت میں ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہوگی اور مسرت کے اداریوں سے ماضی کے حالات سے واقف ہونے کا بھی موقع ملے گا۔ یہ بات علمی مجلس کے صدر و معروف نقاد پروفیسر علیم اللہ حالی نے معروف صحافی ضیاء الرحمٰن غوثی کی کتاب 'غبار دل' کا اجرا کرتے ہوئے کہی۔ علمی مجلس بہار کے زیر اہتمام منعقدہ اس تقریب کی صدارت کرتے ہوئے مسٹر حالی نے کہا کہ 'غبار دل' یقیناً نئی نسل کے لیے ماضی کے حالات سے آگاہی میں معاون ہوگی کیونکہ حالات کو سمجھنے کے لیے پس منظر کو بھی جاننا لازمی ہے جسے مسٹر غوثی نے بے باکی سے پیش کیا ہے۔ امارت شرعیہ بہار اڑیسہ وجھارکھنڈ کے نائب ناظم مولانا مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے کہا کہ اپنے زمانے میں مسرت نے کئی نامور قلم کار پیدا کیے۔ غبار دل سے نکلی اور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل مولانا سید شاہ مشہود احمد قادری ندوی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ مولانا ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ ان کے اداریوں میں ان کے دور کی عکاسی ہوتی ہے اور آنے والے دنوں میں اس کی زبردست اہمیت ہوگی۔ اس موقعے پر معروف شاعر خورشید اکبر، امن چمن کے مدیر سید مشتاق احمد، روزنامہ تاثیر کے مدیر اعزازی سید امتیاز کریم، شاعر شمیم قاسمی، رمیش کنول نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ علمی مجلس کے جنرل سکریٹری پرویز عالم نے نشست کی نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 15 ستمبر 2019

ڈاکٹر ناصرالدین انصار کی کتاب 'ادبی مطالعات' کا اجرا

ادبی مطالعات

امراوتی: نئی نسل کے معروف ادیب، نقاد اور ماہر زبان ڈاکٹر ناصر الدین انصار کے تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل تازہ ترین مجموعے 'ادبی مطالعات' کی تقریب رونمائی نہایت شاندار انداز میں منعقد کی گئی۔ شہر کے وسط میں واقع مشہور ہوٹل آدرش کے خوبصورت بینکیٹ ہال میں انجام پذیر اس پرشکوہ تقریب کی صدارت معروف محقق ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے فرمائی۔ کتاب کا اجرا معروف نقاد سلیم شہزاد کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر صفدر، ڈاکٹر اسد اللہ، پرشوتم ہروانی اور نثار الدین مانوی، متین اچلپوری، ڈاکٹر یحییٰ جمیل، غلام علی بیابانی، خواجہ افتخار احمد اور حفیظ مومن موجود تھے۔

شہر امراوتی کی معروف ادبی انجمن تہذیب کے زیر اہتمام منعقد اس پرشکوہ تقریب رونمائی کا آغاز مولانا عبدالمصور ندوی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعدازاں بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر ابرار کاشف نے افتتاحی کلمات پیش کیے۔ ان کے بعد معروف انشائیہ نگار ڈاکٹر اسد اللہ نے دلچسپ خاکہ پیش کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر ناصر انصار کی فعال اور ہمہ گیر شخصیت کے نہایت خوبصورت پہلو اجاگر کیے۔ معروف نقاد ڈاکٹر صفدر نے صاحب کتاب کی متعدد علمی وادبی فتوحات اور ان کی زبان دانی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تخلیقی وتنقیدی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس دوران علاقہ برار کے مختلف شہروں کی تقریباً ایک ادبی و ملی تنظیموں نے صاحب کتاب کا اعزاز و استقبال کیا۔ شہر کے معروف ادب نواز پرشوتم ہروانی نے بھی انصار صاحب کی شخصیت کی گرہیں کھولتے ہوئے دلچسپ تقریر کی۔ مالیگاؤں سے تشریف لائے اس عہد کے صف اول کے نقاد سلیم شہزاد نے کتاب کے مندرجات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انصار کی تنقیدی و تحقیقی بصیرت کا تحسین آمیز الفاظ میں تذکرہ کیا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ادیب علیمی نے انجام دیے جبکہ ایڈووکیٹ اطہر شمیم نے اظہار تشکر پیش کیا۔

پریس ریلیز: مشاہد رضوی، مہاراشٹر، 16 ستمبر 2019

کریک نامہ

بتیا: ''افتخار وصی ہندوستان کے معروف طنزیہ ومزاحیہ شاعر ہیں۔ گرچہ ان کے یہاں ظرافت کا عنصر حاوی ہے لیکن طنز کی کاٹ بھی اس طرح ہے کہ ان کے یہاں طنز میں قند کا مزہ ملتا ہے'' یہ باتیں معروف شاعر اور ناقد ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے مقامی سجاد پبلک اردو لائبریری میں 8 ستمبر کو منعقد رسم اجرا اور مشاعرے کے موقعے پر کہیں۔ موقع تھا کہ کریک کی کتاب 'کریک نامہ' کے اجرا کا۔ صدارت کی ابوالخیر نشتر نے جبکہ مہمانان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر جاوید قمر، ابوار شدارمان، حسن معاویہ ندوی، قیصر اور تفضیل احمد موجود تھے۔ کریک کی شاعری پر اظہار خیال

کریک کے شعری مجموعہ 'کریک نامہ' کا اجرا

ڈاکٹر کے پی شمس الدین ترورکاڈ کی کتاب 'کیرالہ میں اردو زبان وادب' کا اجرا

کرتے ہوئے ظفر امام نے ان کے یہاں ظرافت کو غالب قرار دیتے ہوئے معیار پر توجہ کی ضرورت کو اہم بتایا۔ ڈاکٹر جاوید قمر نے ان کے مختلف اشعار کے حوالے سے ان کی شاعرانہ خصوصیات کو منفرد قرار دیا۔ ابوارشد صاحب نے کریک کی شاعری کو ہندوستان گیر سطح کی شاعری قرار دیا اور ظرافت کے میدان میں ان کو اہمیت کا حامل کہا۔ معروف شاعر تفضیل احمد نے تفصیل کے ساتھ کریک کی شاعری کا پس منظر اور پیش منظر بیان کرتے ہوئے ان کے امتیاز اور انفراد کو اجاگر کیا۔ اس موقعے سے کریک بتیاوی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں نے جو کچھ مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے اسے سہل اور فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ ادبی سنگم کے صدر ابوالخیر نشتر نے کریک کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے تمام ادبا شعرا اور عمائدین شہر کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: نسیم احمد نسیم، بتیا، 19 ستمبر 2019

کیرالہ میں اردو زبان وادب

جموں: (16 / ستمبر 2019) جموں یونیورسٹی کی گولڈن جبلی تقریبات کے سلسلے میں جموں یونیورسٹی شعبۂ اُردو، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی اور ورلڈ اُردو ایسوسی ایشن کے اشتراک سے 'اُردو ادب میں علاقائی تہذیب وثقافت' کے موضوع پر منعقدہ دوروزہ عالمی اُردو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں کیرالہ کے اُردو ادیب ومحقق جناب ڈاکٹر کے پی شمس الدین ترورکاڈ کے تحقیقی مقالوں کا مجموعہ 'کیرالا میں اُردو زبان وادب' جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر منوج کمار دھر کے دست مبارک سے اجرا کیا گیا۔ صدر شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر شہاب عنایت ملک، کینڈا کے ڈاکٹر تقی عابدی، لندن کے فہیم اختر، ورلڈ اُردو ایسوسی ایشن کے چیرمین پروفیسر خواجہ اکرام الدین، شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی کے ایسوسیٹ پروفیسر ڈاکٹر ریاض احمد اور کیرالا سے آئے ہوئے کتاب کے مصنف ڈاکٹر کے پی شمس الدین ترورکاڈ رسم اجرا کی تقریب میں شامل رہے۔ یہ کتاب دہلی کے حالی پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی ہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر کے پی شمس الدین ترکڈ، 29 ستمبر 2019

وفیات:

مسرور جہاں

لکھنؤ: مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار مسرور جہاں کا 22 ستمبر کو انتقال ہوگیا وہ تقریباً 83 برس کی تھیں۔ ان کی رحلت کے ساتھ ہی ہمارے درمیان سے ایک قد آور شخصیت چلی گئی۔ انھیں تال کٹورہ قبرستان میں ہزاروں

سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کیا گیا۔ پسماندگان میں دو لڑکیاں، داماد اور نواسیاں چھوڑ گئی ہیں۔ ان کے اکلوتے لڑکے اور ایک بیٹی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ مسرور جہاں کے 60 ناول اور 200 کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانے سے ہی افسانہ نگاری شروع کردی تھی۔ پہلے وہ فرضی ناموں سے لکھتی تھیں مگر شادی کے بعد مسرور جہاں کے نام سے لکھنا شروع کردیا۔ ساٹھ سے زیادہ ناولوں اور چھ سات افسانوی مجموعوں کی خالق مسرور جہاں نے اپنے پیچھے بڑا علمی سرمایہ چھوڑا ہے۔ وہ مشہور رسالوں 'شمع' اور 'بیسویں صدی' کی مقبول افسانہ نگاروں میں سے ایک تھیں۔ ان کے افسانے ہندی، تامل، کنڑ اور بریل وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ مہاراشٹر کے اردو نصاب میں ان کا افسانہ 'شال والا' ابھی بھی پڑھایا جارہا ہے۔ تاشقند یونیورسٹی کے وائس چانسلر جاوید خولوف نے ان کے افسانوں پر پی ایچ ڈی کی اور ان کا تاجک زبان میں ترجمہ کیا۔ نکہت عابدی نے ان کے افسانوں پر کانپور یونیورسٹی سے ڈی لٹ حاصل کی۔ ان کے ناولوں میں نئی بستی، درد کا الاؤ، تابان، تزئین، پیکر وغیرہ نے خاصی شہرت پائی۔ افسانوی مجموعوں میں بوڑھا کلپتس، پرندے کا سفر، تیرے میرے دکھ، ہمیں جینے دو، خواب در خواب سفر بے حد مقبول ہوئے۔ ان کا نیا مجموعہ نقل مکانی ابھی حال ہی میں شائع ہوا تھا۔ یوپی اردو اکادمی نے ان کے افسانوی مجموعوں پر انھیں ایک لاکھ کے نقد انعام سے نوازا تھا۔ اس کے علاوہ بہار اردو اکادمی، میر اکادمی، اور دوسرے اداروں نے بھی انھیں انعامات سے نوازا تھا۔ مسرور جہاں ایک مشہور علمی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے دادا پروفیسر مہدی حسین ناصر اپنے زمانے کی مشہور شخصیت تھے۔ والد نصیر حسین خیال کاظمین جونیئر ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بعد میں وہ خالصہ کالج سے منسلک ہو گئے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی وقار ناصری کہنہ مشق شاعر اور مشہور ادیب ہیں۔ ان کے شوہر نواب مرتضیٰ علی خاں نواب آغا میر کے پرپوتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 ستمبر 2019

شاہد ماہلی

نئی دہلی: اردو زبان کے معروف ممتاز ادیب وشاعر اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائرکٹر شاہد ماہلی کا 29 ستمبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ 76 سال کے تھے۔ اردو کے ایک

ممتاز ادیب کے انتقال پر ادبی حلقوں میں غم کی لہر ہے۔ مختلف ادبی تنظیموں اور شخصیات نے شاہد ماہلی کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ واضح رہے کہ شاہد ماہلی نے اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ اردو ادب کی آبیاری میں گزارا۔ انھوں نے اردو ادب سے وابستہ مختلف تنظیموں کی سربراہی کے فرائض بھی انجام دیے۔ وہ بذات خود ایک اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ ان کی شاعری کی ادبی حلقوں

میں اچھی خاصی پذیرائی ہوئی ہے۔ انھیں دہلی اردو اکادمی اور اترپردیش اردو اکادمی کے مختلف انعامات سے بھی نوازا گیا۔ ان کے علاوہ انھیں آل انڈیا کیفی اعظمی ایوارڈ اور ہندی ساہتیہ ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ دہلی اردو اکادمی کے بہترین شاعری ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکے ہیں۔ نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کے سکریٹری اور انجمن ترقی اردو دہلی شاخ کے طویل عرصے تک جنرل سکریٹری بھی رہے۔ وہ تقریباً 40 برسوں تک غالب انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ رہے۔ شاہد ماہلی کے انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے اپنے شدید رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شاہد ماہلی جیسے متحرک اور فعال شخص کا ہمارے درمیان سے اتنی جلدی رخصت ہو جانا ہم سب کے لیے کسی بڑے المیے سے کم نہیں ہے۔ تقریباً چالیس برسوں تک آپ غالب انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ رہے اور اپنی محنت اور دلچسپی سے غالب انسٹی ٹیوٹ کو بلند مقام پر پہنچایا۔ بحیثیت ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے کئی اہم قومی اور بین الاقوامی سمیناروں کا انعقاد کیا، خصوصاً بین الاقوامی سمینار میں پاکستان، ایران، تاجکستان، افغانستان، امریکہ، انگلینڈ اور دیگر ممالک کے اسکالرز غالب انسٹی ٹیوٹ تشریف لائے جس کی وجہ سے یہ ادارہ بین الاقوامی شناخت حاصل کر سکا۔ آپ نے اپنی نگرانی میں غالبیات اور اردو زبان و ادب کے تعلق سے کئی اہم کتابوں کی اشاعت بھی کرائی، ان کتابوں کو علمی اور ادبی دنیا میں کافی پذیرائی ملی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 ستمبر 2019

خان عتیق آفریدی

رامپور: علمی و ادبی حلقوں میں یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ دبستان رامپور کے مایہ ناز شاعر اور مادرانہ شاعری کے خالق کی حیثیت سے نمایاں پہچان بنانے والے خان عتیق آفریدی ایڈوکیٹ کا طویل علالت کے بعد 70 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی نماز جنازہ بعد نماز عصر محلہ گھیر طوخاں میں ادا کی گئی اور آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ مرحوم شہر کے معروف ڈاکٹر محمود علی خاں ڈاکٹر تنویر احمد خاں کے حقیقی بہنوئی تھے۔ عتیق آفریدی کا خاندانی نام عبدالروف خاں تھا، ان کی پیدائش

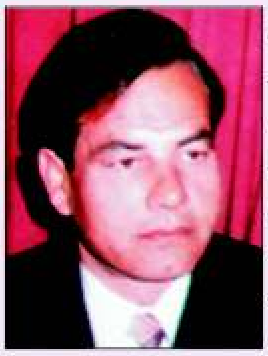

رامپور کے باعزت زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد عبدالغفور خاں مرحوم اردو و فارسی کے جید عالم تھے اور گھر کا ماحول خالص ادبی اور مذہبی تھا، لہٰذا اسی ماحول میں ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ خان عتیق آفریدی نے شاعری کو کبھی پیشہ نہیں بنایا۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی مگر غزل انھیں زیادہ عزیز رہی۔ خان عتیق آفریدی تقریباً 550 سال سے زائد شعر و ادب کے راستے پر گامزن رہے۔ ان کی کوشش رہی کہ انسانیت کے کرب و اضطراب کو شعر کا جامہ پہنانے میں بخل سے کام نہ لیا جائے بلکہ زندگی کے دیگر موضوعات کو بھی ایمانداری کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ ان کے چار شعری مجموعے خود شناسی، شعور، سنگسار اور مشک منظر عام پر آئے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 ستمبر 2019

خراج عقیدت :

یوم وفات پر یاد کیے گئے میر تقی میر

امروہہ: خدائے سخن اور شہنشاہ غزل میر تقی میر کے یوم وفات پر بزم زندہ دلان امروہہ کی جانب سے ہاشمی نگر ڈگری کالج میں ایک سمینار منعقد کیا گیا جس کی صدارت ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر سید شیبان قادری نے انجام دیے۔ سمینار میں شہنشاہ غزل میر تقی میر کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر شاعر سید مسرور جوہر نے کہا کہ میر تقی میر ان شعراء کرام میں سے ہیں، جو اپنی حقیقت کو خود پہچانتے تھے۔ اسی لیے اکثر اپنے اشعار میں شاعرانہ تعلّی کا اطلاق کیا ہے۔ میر تقی میر اردو شاعری کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جو اردو شاعری کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ یہ اردو شاعری کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو میر جیسا صاحب طرز، صاحب اسلوب اور غم کو آفاقیت بنا دینے والا شاعر نصیب ہوا۔ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ میر تقی میر اردو ادب کے سب سے بڑے شاعر ہیں وہ ہر عہد میں شہنشاہ غزل کہلائے گئے۔ غزل کی دنیا میں کوئی بھی شاعر میر کے مقام تک نہیں پہنچ سکا نہ ہی کسی نے میر کی ہمسری کا دعویٰ کیا۔ میر کے بعد آنے والے تقریباً تمام شعرا نے میر کی پیروی کو ہی مانا۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ میر اردو ادب میں غزل کے سب سے بڑے استاد ہیں اور ہر دور میں ان سے متاخرین نے فیض اٹھایا ہے۔ ویسے تو میر نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل میں ان کا رتبہ سب سے بلند ہے۔ غزل ان کا مزاج بن گئی تھی۔ احساس کی شدت، تجربے کی گہرائی، مضامین کی شدت آلام روزگار اور غم عشق وغیرہ وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے میر کو شہنشاہ غزل اور غزلوں کا امام بنا دیا ہے جس کی بنا پر میر اردو شاعری کے افق پر ہمیشہ ایک سورج کی طرح چمکتے رہیں گے۔ ڈاکٹر ناشر امروہوی نے کہا کہ درحقیقت میر کی شاعری درد و غم، رنج و الم، آنسو کی ترجمان ہے۔ انھوں نے اپنی پوری شاعری کو غم کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ گویا غزل نہیں ان کا غم حقیقت کے پردے سے نکل کر غزل کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 23 ستمبر 2019

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فسانۂ عجائب

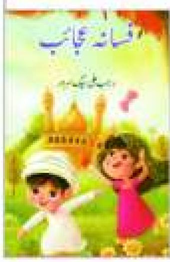

مصنف: رجب علی بیگ سرور

صفحات: 91

قیمت: 25 روپے

کیفیہ

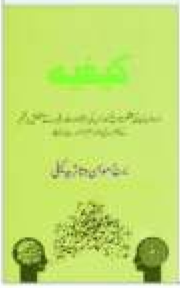

مصنف: برج موہن دتاتریہ کیفی

صفحات: 294

قیمت: 140 روپے

اردو زبان وادب پر عربی کے اثرات

مصنف: ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

مترجم: محمد طارق

صفحات: 507

قیمت: 225 روپے

تاریخ تحریکِ آزادیِ ہند

مصنف: تاراچند

صفحات: 736

قیمت: 310 روپے

جوامع الحکایات ولوامع الروایات (جلد اوّل)

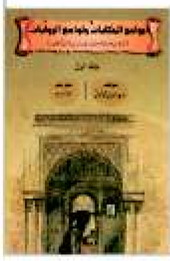

مؤلف: سدیدالدین محمد عوفی

مترجم: غلام سرور

صفحات: 275

قیمت: 155 روپے

تفہیمات وترجیحات

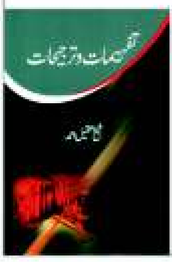

مصنف: شیخ عقیل احمد

صفحات: 237

قیمت: 130 روپے

تذکرہ شعرائے رام پور

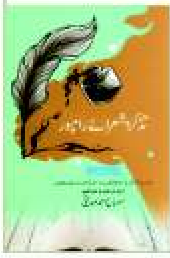

فارسی تصنیف: جارج فانتوم متخلص بہ صاحب وجرجیس

اردو ترجمہ وحواشی: مصباح احمد صدیقی

صفحات: 123، قیمت: 90 روپے

مرزا سلامت علی دبیر (مونوگراف)

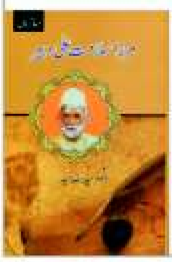

مصنف: سید رضا حیدر

صفحات: 134

قیمت: 85 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/10/2019
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, November-2019, Vol.21, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025